(مجموعہ خطبات وتحریرات)

جلد نمبر ۲

عبادات کی حقیقت اور احکام

شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم

ہماری روزمرہ زندگی اور اس میں اُلجھنوں اور پریشانیوں کا حل قرآن وسنت میں پوشیدہ ہے ہم افراط و تفریط سے بچتے ہوئے اسلام کی بیش بہا تعلیمات کے مطابق کس طرح اعتدال کی راہ اختیار کرسکتے ہیں؟ کس طرح ایک خوشگوار زندگی گزار سکتے ہیں جس میں دین ودنیا کی راحتیں میسر ہوں اور دل کا سکون نصیب ہو؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کے جواب ہر مسلمان ڈھونڈ رہا ہے۔ ''اسلام اور ہماری زندگی'' انہی سوالات کا جواب فراہم کرتی ہے۔

اسلام اور ہماری زندگی

عبادات کی حقیقت اور احکام

جلد ۲

ہماری روزمرہ زندگی اور اس میں اُلجھنوں اور پریشانیوں کا حل قرآن وسنت میں پوشیدہ ہے۔ ہم افراط وتفریط سے بچتے ہوئے اسلام کی بیش بہا تعلیمات کے مطابق کس طرح اعتدال کی راہ اختیار کرسکتے ہیں؟ کس طرح ایک خوشگوار زندگی گزار سکتے ہیں جس میں دین ودنیا کی راحتیں میسر ہوں اور دل کا سکون نصیب ہو؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کے جواب ہر مسلمان ڈھونڈ رہا ہے۔ ''اسلام اور ہماری زندگی'' انہی سوالات کا جواب فراہم کرتی ہے۔

اسلام اور ہماری زندگی

مجموعہ خُطبات وتحریرات

جلد ۲

عبادات کی حقیقت اور احکام

شیخ الاسلام جسٹس (ر) مولانا مُحمّد تقی عثمانی دامت برکاتہم

★ ۱۴ دینا ناتھ مینشن مال روڈ، لاہور ★ ۱۹۰، انار کلی، لاہور پاکستان ★ موہن روڈ چوک اُردو بازار، کراچی

فون ۳۷۳۴۴۴۱۲ فیکس ۹۲-۴۲-۳۷۳۲۲۷۸۵ فون ۳۷۲۴۴۳۹۹۱، ۳۷۳۵۳۲۵۵ فون ۳۲۷۲۲۴۰۱

نام کتاب

اسلام اور ہماری زندگی

مجموعہ خطبات و تحریرات

جلد ۲

عبادات کی حقیقت اور احکام

اشاعت اول

جمادی الثانی ۱۴۳۱ھ — جون ۲۰۱۰ء

ادارۂ اسلامیات
پبلشرز، بک سیلرز، ایکسپورٹرز

۱۴- دینا ناتھ مینشن، مال روڈ، لاہور فون ۳۷۳۵۳۲۵۵ فیکس ۳۷۳۲۴۷۸۵-۴۲-۹۲+

۱۹۰- انار کلی، لاہور- پاکستان ـــــ فون ۳۷۲۴۳۹۹۱ - ۳۷۳۵۳۲۵۵

موہن روڈ، چوک اردو بازار، کراچی- پاکستان ـــــ فون ۳۲۷۲۲۴۰۱

www.idaraeislamiat.com

E-mail:idara.e.islamiat@gmail.com

ملنے کے پتے

ادارۃ المعارف، جامعہ دار العلوم، کورنگی، کراچی نمبر۱۴

مکتبہ معارف القرآن، جامعہ دار العلوم، کورنگی، کراچی نمبر۱۴

مکتبہ دار العلوم، جامعہ دار العلوم، کورنگی، کراچی نمبر۱۴

ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیہ، اردو بازار، کراچی

دار الاشاعت، اردو بازار، کراچی نمبر۱

بیت القرآن، اردو بازار، کراچی نمبر۱

بیت العلوم، نابھہ روڈ، لاہور

فہرست مضامین

نفلی عبادت کی اہمیت ۹۳

نماز کی اہمیت ۱۰۹

حج کی اہمیت ۲۰۸

حج ایک عاشقانہ عبادت ۲۱۴

ذکر الٰہی کے چند آداب ٢٩٢

تبلیغ و دعوت کے اصول ٣٠٠

"بسم اللہ" ☆

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَاَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَنَبِيَّنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا.

اَمَّا بَعْدُ!

فَقَدْ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ((كُلُّ اَمْرٍ ذِيْ بَالٍ لَا يُبْدَاُ فِيْهِ بِبِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ اَقْطَعُ))(۱)

بزرگانِ محترم و برادرانِ عزیز! پچھلے جمعہ کو "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" کے بارے میں کچھ گزارشات عرض کی تھیں۔ حدیث شریف میں نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ ہر کوئی اہم کام جو اللہ تعالیٰ کے نام سے شروع نہ کیا جائے، وہ ادھورا اور ناقص ہے۔ اس حدیث کے ذریعہ حضورِ اقدس ﷺ نے ہر مسلمان کو یہ تلقین فرمائی کہ اپنی زندگی کا ہر اہم کام اللہ کے نام سے شروع کرے۔

ہر کام سے پہلے "بسم اللہ"

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" ایک ایسا کلمہ ہے جو ہمیں ہر کام سے پہلے پڑھنے کا حکم دیا گیا، صبح کو بستر سے بیدار ہوتے وقت، غسل خانے میں جاتے وقت، غسل خانے سے نکلتے وقت، کھانا کھانے سے پہلے، پانی پینے سے پہلے، بازار میں جانے سے پہلے، مسجد میں داخل ہونے سے پہلے، مسجد سے باہر نکلتے وقت، کپڑے پہنتے وقت، گاڑی چلاتے وقت، سوار ہوتے وقت، سواری سے اُترتے وقت، گھر میں داخل ہوتے وقت، تمام اوقات میں "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" کا کلمہ ہم سے کہلوایا جارہا ہے۔

☆ اصلاحی خطبات (۱۳/ ۸۵ تا ۱۰۰) قبل از نمازِ جمعہ، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی، بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کی اہمیت پر ایک اثر انگیز بیان "اصلاحی مواعظ" کی جلد سوم کے صفحہ ۲۶ تا ۴۶ پر بھی ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔

(۱) کنز العمال، رقم: ۲۴۹۱

ہر کام کے پیچھے نظامِ ربوبیت

جیسا کہ پچھلے جمعہ بھی عرض کیا تھا کہ یہ کوئی منتر نہیں ہے جو ہم سے پڑھوایا جا رہا ہو، بلکہ اس کے پیچھے ایک عظیم الشان فلسفہ ہے اور ایک عظیم الشان حقیقت کی طرف اس کے ذریعہ متوجہ کیا جا رہا ہے۔ وہ حقیقت یہ ہے کہ زندگی کا جو بھی کام انسان کر رہا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی توفیق کے بغیر ممکن نہیں، دیکھنے میں چاہے یہ نظر آ رہا ہو کہ جو کام میں کر رہا ہوں وہ میری کوشش اور محنت کا نتیجہ ہے، لیکن اگر انسان گہری نظر سے دیکھے تو اس کو اپنی کوشش اور محنت کا عمل دخل اس میں بہت تھوڑا نظر آئے گا اور اس کے پیچھے اللہ جل شانہ کا بنایا ہوا عظیم الشان نظامِ ربوبیت کام کرتا دِکھائی دے گا۔

ایک گلاس پانی پر نظامِ ربوبیت کارفرما ہے

مثال کے طور پر دیکھئے! ہمیں یہ حکم دیا گیا ہے کہ جب پانی پیو تو پانی پینے سے پہلے ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' پڑھو۔ دیکھنے میں تو یہ نظر آتا ہے کہ پانی پینا معمولی بات ہے۔ گھر میں پانی مہیا کرنے کے لئے ہم نے پائپ لائن لے رکھی ہے اور پانی کو ٹھنڈا کرنے کے لئے کولر اور فرج موجود ہے، چنانچہ آپ نے فرج سے ٹھنڈا پانی نکالا، گلاس میں بھرا اور پی لیا۔ اب بظاہر یہ نظر آ رہا ہے کہ اس ٹھنڈے پانی کا حصول ہماری اپنی محنت، کوشش اور پیسہ خرچ کرنے کا نتیجہ ہے، لیکن یہ خیال بہت کم لوگوں کو آتا ہے کہ یہ ایک گلاس ٹھنڈا پانی جو ہم نے ایک لمحے میں حلق سے نیچے اُتار لیا، اس پانی کو ہمارے حلق تک پہنچانے کے لئے اللہ جل شانہ کی نظامِ ربوبیت کا عظیم کارخانہ کس طرح کام کر رہا ہے۔

زندگی پانی پر موقوف ہے

دیکھئے! پانی ایسی چیز ہے کہ اس پر انسان کی زندگی کا دارومدار ہے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ﴾ (۱)

یعنی ہم نے ہر جاندار کو پانی ہی سے پیدا کیا ہے۔ لہٰذا پانی صرف انسان کا ہی نہیں بلکہ ہر جاندار کا اصل مبدأ بھی ہے اور اس کی زندگی کا دارومدار بھی اسی پر ہے، اسی لئے اللہ جل شانہ نے اس کائنات میں پانی اتنی وافر مقدار میں پیدا فرمایا کہ اگر اس روئے زمین پر ایک تہائی خشکی ہے تو دو تہائی سمندر کی شکل میں پانی ہے، اور اس سمندر میں بھی بے شمار مخلوقات کا جہان آباد ہے جو ہر روز پیدا

---

(۱) الأنبياء: ۳۰

ہو رہے ہیں اور مر رہے ہیں، اگر سمندر کا یہ پانی میٹھا ہوتا تو جو جانور اس پانی میں مر کر سڑتے ہیں، ان کی وجہ سے وہ پانی خراب ہو جاتا، اس لئے اللہ جل جلالہ کی حکمتِ بالغہ نے اس پانی کو کھارا اور نمکین بلکہ کڑوا بنایا، تاکہ اس کے نمکین اجزاء اس پانی کو خراب ہونے اور سڑنے سے محفوظ رکھیں۔

پانی صرف سمندر میں ہوتا تو کیا ہوتا؟

پھر یہ بھی ممکن تھا کہ اللہ تعالیٰ یہ فرما دیتے کہ ہم نے تمہارے لئے سمندر کی شکل میں پانی پیدا کر دیا ہے اور اس کو خراب ہونے اور سڑنے سے محفوظ رکھنے کے لئے اس کے اندر نمکیات بھی پیدا کر دی ہیں، اب تم جانو تمہارا کام جانے، تمہیں اگر پانی کی ضرورت ہو تو جا کر سمندر سے پانی بھرو اور اس کو میٹھا کرو اور پیو اور اس کو اپنے استعمال میں لاؤ۔ اگر یہ حکم دے دیا جاتا تو کیا کسی انسان کے بس میں تھا کہ وہ سمندر سے پانی لے کر آئے اور اس سے اپنی ضروریات پوری کرے؟ چلیں! اگر سمندر سے پانی لے بھی آئے تو پھر اس کو میٹھا کیسے کرے؟

پانی کو میٹھا کرنے اور سپلائی کرنے کا خدائی نظام

سعودی عرب میں سمندر کے پانی کو میٹھا کرنے کے لئے ایک زبردست پلانٹ کروڑوں اور اربوں روپے کے خرچ سے نصب کیا گیا ہے، اس وجہ سے جگہ جگہ یہ اعلان لگایا گیا ہے کہ اس پانی کو میٹھا کرنے کے لئے بہت بڑی رقم خرچ ہوئی ہے، اس لئے اس کو احتیاط سے استعمال کیا جائے۔ لیکن اللہ جل شانہ نے انسان کی خاطر سمندر کا پانی میٹھا کرنے کے لئے یہ نظام بنایا کہ سمندر سے ''مون سون'' کے بادل اُٹھائے اور اس بادل میں ایسا خودکار پلانٹ نصب کر دیا کہ وہ پانی جو سمندر کے اندر کڑوا اور کھارا تھا، جب وہ بادل کی شکل میں اُوپر اُٹھتا ہے تو اس کی کڑواہٹ دور ہو جاتی ہے اور وہ پانی میٹھا بن جاتا ہے، اور پھر وہ لوگ جو سمندر سے ہزاروں میل دور آباد ہیں اور ان کے لئے سمندر سے پانی حاصل کرنا ممکن نہیں ہے، ان لوگوں کے لئے اللہ تعالیٰ نے بادلوں کی شکل میں مفت ''کارگو سروس'' مہیا فرما دی۔

بادل ''مفت کارگو سروس'' مہیا کرتے ہیں

پچھلے دنوں میں ناروے گیا، وہاں کے لوگوں نے بتایا کہ چونکہ یہاں کا پانی بہت اچھا اور صحت بخش سمجھا جاتا ہے، لہٰذا بہت سے ممالک یہ پانی یہاں سے امپورٹ کرتے ہیں، چنانچہ وہ پانی بڑے بڑے کنٹینرز میں پانی کے جہازوں کے ذریعہ دوسرے ملکوں کو بھیجا جاتا ہے، اس کے نتیجے میں

ایک لیٹر پانی پر ایک ڈالر خرچ آتا ہے جو ہمارے حساب سے ۶۲/ روپے بنتے ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ساری انسانیت کے لئے، اس میں مسلمان اور کافر کی بھی قید نہیں، بادلوں کی شکل میں یہ کارگو سروس مفت مہیا کر دی ہے، یہ بادل سمندر سے پانی اُٹھا کر ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک لے جاتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ نے ایسا نظام بنا دیا کہ روئے زمین کا کوئی خطہ ایسا نہیں ہے جو اس ''کارگو سروس'' سے فیض یاب نہ ہوتا ہو، بادل آتے ہیں، گرجتے ہیں، پانی برساتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔

پانی کی ذخیرہ اندوزی ہمارے بس میں نہیں

جب بادلوں کے ذریعہ ہمارے گھر تک پانی پہنچا دیا تو اب اگر یہ کہہ دیا جاتا کہ ہم نے تو تمہارے گھر تک پانی پہنچا دیا، اب تم خود ذخیرہ کر کے سال بھر کا پانی جمع کر لو اور حوض اور ٹینکیاں بنا کر اس کے اندر محفوظ رکھو، کیا انسان کے لئے یہ ممکن تھا کہ وہ بارش کے موقع پر سال بھر کے لئے پانی کا ذخیرہ کر لیتا؟ کیا انسان کے پاس ایسا اسٹوریج نظام ہے کہ سال بھر کا پانی اس کے اندر جمع کر لے اور پھر پورے سال اس میں سے پانی لے لے کر استعمال کیا کرے۔ اللہ تعالیٰ جانتے تھے کہ اس کمزور اور ضعیف انسان کے بس میں یہ بھی نہیں ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اس بارش کو جتنا تم جمع کر سکتے ہو اور استعمال کر سکتے ہو کر لو، باقی سارے سال کے لئے ذخیرہ کرنے کی ذمہ داری بھی ہم ہی لیتے ہیں۔

یہ برفانی پہاڑ کولڈ اسٹوریج ہیں

چنانچہ ان بادلوں کا پانی پہاڑوں پر برسایا اور ان پہاڑوں کو اس پانی کے لئے ''کولڈ اسٹوریج'' بنا دیا اور ان پہاڑوں پر وہ پانی برف کی شکل میں محفوظ کر دیا اور اتنی بلندی پر اس پانی کو محفوظ کر دیا کہ کوئی خراب کرنے والا اس پانی کو خراب کرنے کے لئے وہاں تک نہ پہنچ سکے اور اتنے ٹمپریچر پر رکھا کہ وہاں سے پگھل بھی نہ سکے۔ یہ بلند پہاڑ ایک طرف انسان کو خوشنما نظارہ مہیا کر رہے ہیں اور دوسری طرف انسان کے لئے زندگی بھر کے لئے پانی کے ذخیرہ کو محفوظ کر رہے ہیں۔

دریاؤں اور ندیوں کے ذریعہ پانی کی فراہمی

اگر اس مرحلے پر انسان سے یہ کہہ دیا جاتا کہ ہم نے تمہارے لئے پہاڑوں پر پانی کا ذخیرہ جمع کر دیا ہے، اب جس کو ضرورت ہو وہاں سے جا کر لے آیا کرے۔ کیا انسان کے لئے یہ ممکن تھا کہ ان پہاڑوں کی چوٹیوں سے اس برف کو پگھلا کر اس پانی کو اپنی ضرورت میں استعمال کرے؟ یہ بھی

انسان کے بس میں نہیں تھا، اس لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ ذمہ داری بھی ہم ہی پوری کر دیتے ہیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے سورج کو حکم دیا کہ تم اپنی کرنیں اس برف پر ڈالو اور اس برف کو پگھلاؤ، اور پھر اس پانی کے لئے دریاؤں اور ندیوں کی شکل میں راستے بھی اللہ پاک نے بنا دیئے، چنانچہ وہ برف پانی کی شکل میں پہاڑوں سے نیچے اُترتی ہے اور دریاؤں اور ندیوں کی شکل میں بہتا ہوا پوری دنیا کے اندر سپلائی ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے زمین کی تہہ میں پانی کی سوتیں اور رگیں اس طرح بچھا دیں جس طرح پائپ لائنیں بچھائی جاتی ہیں، اب تم دنیا کے جس خطے میں چاہو زمین کھودو اور پانی برآمد کرلو۔

یہ پانی اللہ تعالیٰ نے پہنچایا ہے

بس انسان کا صرف اتنا کام ہے کہ جو پانی اللہ تعالیٰ نے سمندر سے اُٹھا کر پہاڑوں پر برسایا اور پھر پہاڑوں سے پگھلا کر زمین کے ایک ایک گوشے میں پہنچایا ہے، اس پانی کو ذرا سی محنت کر کے اپنے گھر تک لے آئے۔ لہٰذا جو پانی تم اپنے حلق سے اُتار رہے ہو، اگر غور کرو تو یہ نظر آئے گا کہ اس تھوڑے سے پانی پر کائنات کی ساری طاقتیں صرف ہوئی ہیں، تب جا کر یہ پانی تمہارے منہ تک پہنچا۔ اس لئے یہ جو کہا جا رہا ہے کہ پانی پیتے وقت اللہ تعالیٰ کا نام لو اور "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" پڑھو، اس کے ذریعہ انسان کو اس حقیقت کی طرف متوجہ کیا جا رہا ہے کہ تمہارے حلق تک اس پانی کا پہنچنا تمہارے زورِ بازو کا کرشمہ نہیں ہے، بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کا بنایا ہوا نظام ہے جس کے ذریعہ انسان اس پانی سے سیراب ہو رہا ہے۔

جسم کے ہر ہر عضو کو پانی کی ضرورت ہے

پھر ہم نے گلاس میں پانی بھرا اور اس کو حلق سے نیچے اُتار لیا، اب آگے کے بارے میں ہمیں نہیں معلوم کہ وہ پانی کہاں جا رہا ہے اور جسم کے کس حصے کو کیا فائدہ پہنچا رہا ہے؟ اس غریب انسان کو اس کے بارے میں کچھ پتہ نہیں، بس وہ تو اتنا جانتا ہے کہ مجھے پیاس لگی تھی، پانی پیا وہ پیاس بجھ گئی، اس کو یہ معلوم نہیں کہ وہ پیاس کیوں لگی تھی؟ اور پیاس لگنے کے بعد جب پانی پیا تو اس پانی کا انجام کیا ہوا؟ اس کو کچھ نہیں معلوم۔ ارے تمہیں پیاس اس لئے لگی تھی کہ تمہارے جسم کے ایک ایک عضو کو پانی کی ضرورت تھی، صرف منہ کو اور حلق کو ہی ضرورت نہیں تھی، بلکہ جسم کے تمام اعضاء کو پانی کی ضرورت تھی۔ اگر جسم میں پانی نہ ہو تو انسان کی موت واقع ہو جائے۔ ذرا کسی کو دست لگ جاتے ہیں اور اس کے نتیجے میں جسم کے اندر پانی کی کمی ہو جاتی ہے تو اس وقت کمزوری کی وجہ سے انسان کے لئے چلنا

پھرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

ضرورت سے زائد پانی نقصان دہ ہے

لہٰذا ایک طرف تو انسان کے جسم کے ہر ہر عضو کو پانی کی ضرورت ہے، اس لئے انسان کو پیاس لگتی ہے اور وہ پانی پیتا ہے اور دوسری طرف یہ بھی ضروری ہے کہ وہ پانی جسم کے اندر ضرورت سے زیادہ نہ ہو جائے، کیونکہ اگر ضرورت سے زیادہ پانی جسم کے اندر جمع ہو جائے تو جسم پر ورم آجاتا ہے اور سوج جاتا ہے، یا یہ پانی اگر جسم کے اندر کسی ایسی جگہ پر رک جائے جہاں رکنا نہیں چاہئے تو اس کے نتیجے میں بیماریاں پیدا ہو جاتی ہیں، مثلاً اگر وہ پانی پھیپھڑوں میں رک جائے تو انسان کو ٹی بی ہو جاتی ہے، پسلیوں میں پانی رک جائے تو دمہ ہو جاتا ہے۔ اس لئے اگر ضرورت سے زیادہ پانی جمع ہو جائے تو وہ بھی انسان کے لئے خطرہ ہے، اور اگر پانی کم ہو جائے یا ختم ہو جائے تو بھی انسان کے لئے خطرہ ہے، انسان کے جسم کے اندر پانی ایک خاص حد تک رہنا ضروری ہے۔

جسم میں خودکار میٹر نصب ہے

پانی کی وہ حد کیا ہے؟ ایک انسان جو اَن پڑھ ہے، جس کو ایک حرف پڑھنا نہیں آتا، وہ کیسے پہچانے کہ کتنا پانی میرے جسم میں ہونا چاہئے اور کتنا نہیں ہونا چاہئے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کے جسم میں ایک خودکار میٹر نصب کر دیا ہے۔ جس وقت انسان کے جسم کو پانی کی ضرورت ہوتی ہے تو پیاس لگ جاتی ہے۔ پیاس کیوں لگ رہی ہے؟ اس وجہ سے نہیں لگ رہی ہے کہ حلق خشک ہے اور ہونٹ خشک ہیں، بلکہ اس وجہ سے لگ رہی ہے کہ تمہارے جسم کو پانی کی ضرورت ہے، انسان کو اس ضرورت کا احساس دلانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے پیاس کو پیدا کر دیا۔ ایک بچہ جو کچھ نہیں جانتا، لیکن یہ ضرور جانتا ہے کہ مجھے پیاس لگ رہی ہے، اس کو بجھانا چاہئے۔

جسم کے اندر پانی کیا کام کر رہا ہے؟

پھر جسم کے اندر پہنچنے کے بعد وہ پانی جسم کے اندر کی پائپ لائن کے ذریعہ ان تمام مقامات تک پہنچ رہا ہے جہاں اس کی ضرورت ہے، اور جو پانی ضرورت سے زائد ہے، وہ جسم کی صفائی کرنے کے بعد پیشاب کے ذریعہ باہر آجاتا ہے، تاکہ وہ گندا پانی جسم کے اندر باقی نہ رہے۔

ہم اور آپ ایک لمحہ کے اندر پانی پی لیتے ہیں اور یہ نہیں سوچتے کہ وہ پانی کہاں سے آیا تھا اور کس طرح ہمارے منہ تک پہنچا اور نہ یہ سوچا کہ اندر جانے کے بعد اس کا کیا انجام ہونے والا ہے اور

کون اس پانی کی نگرانی کر رہا ہے؟ لہٰذا ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' کا کلمہ درحقیقت ہمیں ان سارے حقائق کی طرف متوجہ کر رہا ہے۔

ہارون رشید کا ایک واقعہ

ہارون رشید ایک مرتبہ اپنے دربار میں بیٹھے ہوئے تھے، پینے کے لئے پانی منگوایا، قریب میں مجذوب صفت بزرگ حضرت بہلول رحمۃ اللہ علیہ بیٹھے ہوئے تھے، جب ہارون رشید پانی پینے لگے تو انہوں نے ہارون رشید سے کہا کہ امیر المؤمنین! ذرا ایک منٹ کے لئے رک جائیں، وہ رک گئے اور پوچھا کہ کیا بات ہے؟ انہوں نے کہا کہ امیر المؤمنین! میں آپ سے ایک سوال کرنا چاہتا ہوں، وہ یہ کہ آپ کو اس وقت پیاس لگ رہی ہے اور پانی کا گلاس آپ کے ہاتھ میں ہے، یہ بتائیں کہ اگر آپ کو ایسی ہی پیاس لگ رہی ہو اور آپ کسی صحراء یا جنگل میں ہوں اور وہاں پانی موجود نہ ہو اور پیاس شدت کی لگ رہی ہو، تو آپ ایک گلاس پانی حاصل کرنے کے لئے کتنی دولت خرچ کر دیں گے؟ ہارون رشید نے جواب دیا کہ اگر شدید پیاس کے عالم میں پانی نہ ملے تو چونکہ پانی نہ ملنے کی صورت میں موت ہے، تو اپنی جان بچانے کے لئے میرے پاس جتنی دولت ہوگی، خرچ کر دوں گا تا کہ جان بچ جائے۔ یہ جواب سننے کے بعد حضرت بہلول مجذوب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اب آپ ''بسم اللہ'' پڑھ کر پانی پی لیجئے۔

پوری سلطنت کی قیمت ایک گلاس پانی سے بھی کم ہے

جب بادشاہ پانی پی چکے تو حضرت بہلول مجذوب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ امیر المؤمنین! میں ایک سوال اور کرنا چاہتا ہوں۔ انہوں نے پوچھا کہ کیا سوال ہے؟ بہلول مجذوبؒ نے فرمایا کہ سوال یہ ہے کہ یہ پانی جو آپ نے ابھی پیا ہے، اگر یہ پانی آپ کے جسم کے اندر ہی رہ جائے اور باہر نہ نکلے اور پیشاب بند ہو جائے، اب مثانے کے اندر پیشاب بھرا ہوا ہے اور باہر نکالنے کی کوئی صورت نہیں تو اس کو باہر نکالنے کے لئے کتنی دولت خرچ کر دیں گے؟ ہارون رشید نے جواب دیا کہ اگر پیشاب نہ آئے بلکہ پیشاب آنا بند ہو جائے اور مثانہ پیشاب سے بھر جائے تو یہ صورت بھی ناقابلِ برداشت ہے، اس لئے اگر کوئی شخص اس کے علاج کے لئے جتنی دولت مانگے گا، میں اس کو دے دوں گا، حتیٰ کہ اگر کوئی شخص پوری سلطنت بھی مانگے گا تو میں دے دوں گا۔ بہلولؒ نے فرمایا کہ امیر المؤمنین! اس کے ذریعہ میں یہ حقیقت بتانا چاہتا تھا کہ آپ کی پوری سلطنت کی قیمت ایک گلاس پانی پینے اور اس کو باہر نکالنے کے برابر بھی نہیں ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے آپ کو سارا نظام مفت میں دے رکھا ہے، مفت میں پانی مل رہا ہے اور مفت میں خارج ہو رہا ہے، اس کے خارج کرنے کے لئے کوئی قیمت اور کوئی پریشانی اُٹھانی نہیں پڑتی۔

''بسم اللہ'' کے ذریعہ اعترافِ بندگی

بہر حال! اللہ جل شانہ نے ہر انسان کو یہ نظام مفت میں دے رکھا ہے، کیونکہ اس نے نہ کوئی پیسہ خرچ کیا اور نہ ہی محنت اُٹھائی۔ اس لئے یہ جو حکم دیا جارہا ہے کہ پانی پینے سے پہلے ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' پڑھو، اس کے ذریعہ اس طرف توجہ دلائی جارہی ہے کہ یہ سب اللہ تعالیٰ کی نظامِ ربوبیت کا کرشمہ ہے اور اس کے ذریعہ یہ اعتراف بھی ہورہا ہے کہ یا اللہ! ہمارے بس میں یہ نہیں تھا کہ ہم یہ پانی پی سکتے، اگر آپ کا بنایا ہوا یہ کارخانۂ ربوبیت نہ ہوتا تو ہم تک یہ پانی کیسے پہنچتا، آپ نے محض اپنے فضل و کرم سے ہم تک یہ پانی پہنچایا، اور جب یہ پانی آپ نے ہی پہنچایا ہے تو اے اللہ! ہم آپ ہی سے یہ درخواست اور دعا کرتے ہیں کہ جو پانی ہم پی رہے ہیں، یہ پانی جسم کے اندر جانے کے بعد خیر کا سبب بنے اور کوئی فساد نہ پھیلائے، کیونکہ اگر اس پانی میں بیماریاں اور خرابیاں ہوں گی تو یہ پانی جسم میں فساد مچائے گا، اسی طرح اگر جسم کے اندر کے نظام میں خرابی پیدا ہوجائے، مثلاً جگر اپنا کام کرنا چھوڑ دے تو وہ پانی جسم کے اندر تو جائے گا لیکن اس پانی کو صاف کرنے کا اور گندگی کو باہر پھینکنے کا جو نظام ہے وہ خراب ہوجائے گا، اس لئے ہم پانی پیتے وقت دعا کرتے ہیں کہ اے اللہ! اس پانی کا انجام بھی بخیر فرمادے۔

انسانی گردے کی قیمت

کراچی میں گردے کے ایک اسپیشلسٹ ہیں، ان سے ایک مرتبہ میرے بھائی صاحب نے پوچھا کہ آپ انسانی گردہ ایک انسان کے جسم سے نکال کر دوسرے انسان کے جسم میں منتقل کردیتے ہیں، لیکن اب تو سائنس نے بڑی ترقی کرلی ہے تو کوئی مصنوعی گردہ کیوں نہیں بنالیا جاتا، تاکہ دوسرے انسان کے گردے کو استعمال کرنے کی ضرورت ہی پیش نہ آئے؟ وہ ہنس کر جواب دینے لگے کہ اول تو سائنس کی اس ترقی کے باوجود مصنوعی گردہ بنانا بڑا مشکل ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے گردے کے اندر جو چھلنی لگائی ہے، وہ اتنی لطیف اور باریک ہے کہ ابھی کوئی ایسی مشین ایجاد نہیں ہوئی جو اتنی لطیف چھلنی بناسکے، اگر بالفرض ایسی مشین ایجاد بھی کرلی جائے جو ایسی چھلنی بناسکے تو اس کی تیاری پر اربوں روپے خرچ ہوں گے، اور اگر اربوں روپے خرچ کرکے ایسی چھلنی بنا بھی لی جائے تب بھی گردے کے اندر ایک چیز ایسی ہے جس کو بنانا ہماری قدرت سے باہر ہے، وہ یہ کہ گردے کے اندر اللہ تعالیٰ نے ایک دماغ بنایا ہے جو یہ فیصلہ کرتا ہے کہ اس آدمی کے جسم میں کتنا پانی رکھنا چاہئے اور کتنا پانی باہر پھینکنا چاہئے۔ ہر انسان کا گردہ اس انسان کے حالات کے مطابق، اس کی جسامت کے مطابق اور اس کے

وزن کے مطابق یہ فیصلہ کرتا ہے کہ کتنا پانی اس کے جسم میں رہنا چاہئے اور کتنا پانی باہر پھینکنا چاہئے، اور اس کا یہ فیصلہ سو فیصد درست ہوتا ہے، اس کے نتیجے میں وہ اتنا پانی جسم روکتا ہے جتنے پانی کی ضرورت ہوتی ہے اور ضرورت سے زائد پانی کو پیشاب کی شکل میں باہر پھینک دیتا ہے۔ لہٰذا اگر ہم اربوں روپیہ خرچ کر کے ربر کا مصنوعی گردہ بنا بھی لیں، تب بھی ہم اس میں دماغ نہیں بنا سکتے جو اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کے گردے میں پیدا فرمایا ہے۔

جسم کے اندر کارخانۂ ربوبیت

قرآن کریم بار بار اس طرف توجہ دلا رہا ہے:

﴿وَفِیْٓ اَنْفُسِکُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ﴾ (۱)

تم اپنی جانوں میں غور کیا کرو کہ تمہارے جسم میں ہماری قدرتِ کاملہ اور حکمتِ بالغہ کا کیا کارخانہ کام کر رہا ہے، اس پر کبھی کبھی غور کیا کرو۔ اور اس گردے کا انجام بھی اللہ تعالیٰ کے قبضۂ قدرت میں ہے کہ کب تک یہ گردہ کام کرے اور کب یہ کام کرنا بند کر دے۔ لہٰذا ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' کا یہ پیغام ہے کہ ایک طرف یہ یاد کرو کہ یہ پانی تمہارے پاس کیسے پہنچا اور دوسری طرف یہ خیال کرو کہ یہ پانی تمہارے جسم کے اندر جا کر فساد نہ پھیلائے بلکہ یہ پانی صحت اور برکت کا سبب بنے، اور اس بسم اللہ کے پڑھنے میں ایک طرف اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ اور حکمتِ بالغہ کا اعتراف ہے اور دوسری طرف یہ دعا اور درخواست ہے کہ ہم اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ سے دعا اور درخواست کر رہے ہیں کہ یا اللہ! ہم یہ پانی پی تو رہے ہیں لیکن یا اللہ! یہ پانی اندر جا کر کہیں فساد کا سبب نہ بن جائے، بلکہ یہ پانی صحت اور صلاح و فلاح کا سبب بنے۔ پانی پینے سے پہلے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھنے کا یہ فلسفہ ہے، لہٰذا پانی پیتے وقت اس فلسفہ کو سامنے رکھو پھر دیکھو کہ پانی پینے میں کیا لطف ہے اور کیا برکت ہے اور اس طرح پانی پینے کو اللہ تعالیٰ تمہارے لئے عبادت بھی بنا دیں گے اور اس پر اجر و ثواب بھی عطا فرمائیں گے۔

محبت اور خشیت کے حصول کا ذریعہ

اور جب پانی پیتے وقت یہ فلسفہ سامنے رکھو گے تو کیا اس کے نتیجہ میں اس ذات سے محبت پیدا نہیں ہوگی؟ جب تم اس تصور کے ساتھ پانی پیو گے تو یہ چیز تمہارے دل میں اللہ جل شانہ کی محبت میں اضافہ کرے گی اور اللہ تعالیٰ کی عظمت میں اضافہ کرے گی اور اس محبت کے نتیجے میں تمہارے دل میں خشیت پیدا ہوگی اور پھر یہ خشیت تمہیں گناہوں سے بھی روک دے گی۔

---

(۱) الذاریات: ۲۱، ترجمہ: اور خود تمہارے اپنے وجود میں بھی! کیا پھر بھی تمہیں دکھائی نہیں دیتا

کافر اور مسلمان کے پانی پینے میں فرق

ایک کافر بھی پانی پیتا ہے، لیکن وہ غفلت کی حالت میں پانی پیتا ہے، اپنے خالق اور مالک کو یاد نہیں کرتا، ایک مومن بھی پانی پیتا ہے، لیکن اس تصور اور دھیان کے ساتھ پیتا ہے، اگرچہ پانی کی نعمت اللہ تعالیٰ نے کافر کو بھی دے رکھی ہے اور مومن کو بھی دے رکھی ہے، لیکن ایک ایسے شخص کے پانی پینے کی کیفیت میں جو ناشکرا ہے اور ایک ایسے شخص کے پانی پینے میں جو شکر گزار ہے، ان دونوں میں کچھ تو فرق ہونا چاہئے، وہ فرق یہ ہے کہ مومن کو چاہئے کہ وہ دھیان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہوئے پانی پیئے اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا احساس اور اعتراف کرتے ہوئے پانی پیئے اور برکت کی دعا کرتے ہوئے پانی پیئے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ان حقائق کو سمجھنے اور ان پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.

عبادت کی اہمیت ☆

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ
نَحۡمَدُہٗ وَنُصَلِّیۡ عَلٰی رَسُوۡلِہِ الۡکَرِیۡمِ

انسان کی زندگی میں عبادت کیا اہمیت رکھتی ہے؟ یہ بات اس وقت تک ٹھیک سمجھ میں نہیں آسکتی جب تک ہمیں یہ معلوم نہ ہو کہ انسان کی زندگی کا مقصد کیا ہے؟ اور وہ کیوں اس دنیا میں آیا ہے؟ ہم دیکھتے ہیں کہ اس کائنات میں انسان کو ایک غیر معمولی مقام حاصل ہے، وہ اپنے کمزور اور ناتواں وجود کے ساتھ آسمان اور زمین کی ہر چیز پر حکومت کرتا ہے، اور اس وسیع وعریض کائنات کا ہر ذرّہ اس کی خدمت میں مصروف ہے، انسان کو اپنا پیٹ بھرنے کے لئے فصلیں اُگانے کی ضرورت ہوتی ہے تو کائنات کی مشینری کا ہر ہر پرزہ اس کی مدد کے لئے حرکت میں آجاتا ہے، وہ جانور جو انسان سے کئی گنی زیادہ طاقت کے مالک ہیں اس کے آگے رام ہو کر زمین ہموار کرتے ہیں، زمین اپنی تمام توانائیاں صرف کر کے بیج میں سے کونپل نکالتی ہے، اس کونپل کو پودا، اور پودے کو درخت بننے کے لئے گرمی کی ضرورت ہوتی ہے، تو سورج اپنی کرنیں نچھاور کرتا ہے، پانی کی ضرورت ہوتی ہے تو بادل اس پر اپنی پونجی لٹاتے ہیں، ہوا کی ضرورت ہوتی ہے تو ہوائیں اسے لہلہا کر پروان چڑھاتی ہیں، غرض کائنات کی تمام قوتیں اپنا سارا زور اس لئے صرف کرتی ہیں کہ انسان کی بھوک مٹے اور اس کی زندگی کا سامان مہیا ہو۔

یہ تو ایک مثال تھی، آپ اپنے گرد و پیش پر نظر ڈال کر دیکھئے آپ کو نظر آئے گا کہ آسمان سے لے کر زمین تک تمام خدائی کارندے آپ کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر ایسا کیوں ہے؟ آپ میں وہ کیا خصوصیت ہے جس کی بناء پر کائنات آپ کی خدمت کرتی ہے، اور آپ سے اپنی کوئی خدمت نہیں لیتی؟

اگر آپ اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ کائنات کے ہر ذرّے کا پیدا کرنے والا خدا ہے، اور اسی نے اس جہاں کو آپ کا خادم بنایا ہے تو آپ کو ان سوالات کا جواب سمجھنے میں دیر نہیں لگے گی، تمام

☆ نشری تقریریں، ص: ۳۷ تا ۴۰، فرد کی اصلاح، ص: ۴۵

کائنات کو آپ کی خدمت پر اس لئے مامور کیا گیا ہے کہ آپ ایک بہت بلند اور اعلیٰ کام پر مامور ہیں اور وہ کام ہے ''عبادت'' اور ''بندگی''، یہی کام ہماری زندگی کا مقصد ہے، اور اسی کے لئے ہم اس دنیا میں بھیجے گئے ہیں۔ قرآن کریم میں باری تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ﴾ (۱)

''اور میں نے جنات اور انسانوں کو صرف اس لئے پیدا کیا ہے کہ وہ میری بندگی کریں''

قرآن کریم کے اس ارشاد اور اس کی مذکورہ بالا تشریح سے عبادت کی اہمیت خود بخود واضح ہو جاتی ہے، عبادت اس لئے اہم ہے کہ وہ ہماری زندگی کا مقصد ہے، عبادت اس لئے اہم ہے کہ اسی کے لئے ہم دنیا میں آئے ہیں، عبادت اس لئے اہم ہے کہ وہ ہمارے اشرف المخلوقات بننے کی وجہِ جواز ہے، اور اسی کے بل پر ہم کائنات کی ہر چیز سے خدمت لیتے ہیں، اگر ہم عبادت کے اس فریضے کو انجام نہ دیں تو ہماری مثال اس ملازم کی سی ہوگی جو اپنے مالک سے تنخواہ پوری وصول کرے، اس کی مہیا کی ہوئی تمام سہولتوں سے فائدہ اُٹھائے، لیکن جب وہی مالک اسے کسی بات کا حکم دے تو وہ تعمیل کرنے سے صاف انکار کر دے۔ جس طرح یہ ملازم سزا کے لائق ہے اسی طرح وہ شخص عذاب کا مستحق ہے، جو دنیا کی تمام نعمتوں سے فائدہ اُٹھاتا ہے، لیکن عبادت کے فریضے کو ادا نہیں کرتا۔

دوسری طرف وہ شخص جو عبادت کو ٹھیک ٹھیک انجام دیتا ہے، اس کی مثال اس فرمانبردار ملازم کی سی ہے جس کے آرام اور تفریح سے بھی مالک خوش ہوتا ہے۔ جس طرح خالی اوقات میں اس ملازم کا خالی بیٹھنا، اور آرام اور تفریح کرنا بھی ملازمت میں شمار ہوتا ہے، اسی طرح ایک فرمانبردار بندے کی عبادت صرف نماز، روزے، حج اور زکوٰۃ میں منحصر نہیں رہتی، بلکہ اس کی زندگی کا ہر قدم عبادت بن جاتا ہے۔ حدیث میں ہے کہ ایسا شخص اپنے بیوی بچوں کے لئے جو روزی کماتا ہے، اس پر بھی اسے ثواب ملتا ہے، اس کا سونا جاگنا، اُٹھنا بیٹھنا، یہاں تک کہ ہنسنا بولنا بھی بندگی میں شمار ہوتا ہے۔

بندگی کا مطلب ہی اصل میں یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو خدا کا تابع فرمان سمجھ کر اپنی پوری زندگی اسی کے احکام کے مطابق بنالے، لہٰذا عبادت کسی خاص جگہ، کسی خاص وقت یا کسی خاص کام کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، اگر اپنی زندگی کو خدا کے احکام کے مطابق بنائے ہوئے ہیں تو آپ کی زندگی کا ہر کام عبادت، آپ کی تجارت، آپ کی ملازمت یہاں تک کہ آپ کی جائز تفریحات بھی عبادت ہیں، بشرطیکہ وہ خدا کے احکام کے مطابق ہوں، اور نیک نیتی کے ساتھ ہوں۔

اور جب کسی قوم کے بیشتر افراد اپنی اجتماعی زندگی اس طرح عبادت بنا لیتے ہیں تو زندگی کی

---

(۱) الذاریات: ٥٦

تمام کامرانیاں ان کے قدم چومتی ہیں، اور اللہ کا وہ وعدہ پورا ہوتا ہے جس کا ذکر قرآن کریم نے کیا ہے، ارشاد ہے:

﴿وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ آمَنُوْا مِنكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِى الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِن قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِى ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُم مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْناً يَعْبُدُوْنَنِىْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِىْ شَيْئاً﴾ (۱)

''تم میں سے جو لوگ ایمان لائے، اور اُنہوں نے نیک عمل کیے، ان سے اللہ نے وعدہ کیا ہے کہ ان کو یقیناً زمین کی خلافت عطا کرے گا، جس طرح ان سے پہلے لوگوں کو عطا کی ہے، اور ضرور ان کے دین کو جسے اس نے ان کے لئے پسند کیا مضبوطی کے ساتھ قائم کرے گا، اور بالیقین ان کی حالتِ خوف امن سے بدل دے گا، (بس) وہ میری عبادت کریں اور میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں''

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰه رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

(۱) النور: ۵۵

عبادات کی کیفیت اور آداب ☆

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالْعَاقِبَۃُ لِلْمُتَّقِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِہٖ الْکَرِیْمِ وَعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ، اَمَّا بَعْدُ!

اللہ تعالیٰ کی محبت میں بے چین

ایک صاحب نے حضرت تھانوی رحمہ اللہ کو خط میں لکھا:

''مجھے اس کا بڑا شوق ہے کہ کسی طرح ہو، اللہ تعالیٰ کی محبت میں ''بے چین'' رہوں۔''

اس خط کے جواب میں حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے یہ جملہ تحریر فرمایا:

''مگر اس کے ساتھ یہ بھی دعا کرو کہ اس ''بے چینی'' میں چین رہے''(۱)

انوکھے خط کا انوکھا جواب

یہ جواب جو حضرت والا نے تحریر فرمایا اگر غور کریں تو بڑا عجیب و غریب جواب ہے۔ اگر کسی نے یہ جواب نہ پڑھا ہو، اور صرف سوال اس کے سامنے آئے تو جن حضرات نے حضرت تھانوی رحمہ اللہ کے مواعظ اور ملفوظات پڑھے ہوئے ہیں، اور جو لوگ حضرت کے مزاج سے کچھ واقف ہیں، ان کا گمان یہ ہوگا کہ حضرت والا جواب میں یہ فرمائیں گے کہ یہ کیا تمہیں ''بے چینی'' کا شوق پیدا ہو گیا؟ اس لئے کہ ''بے چینی'' تو ایک غیر اختیاری کیفیت ہے، وہ حاصل ہو کہ نہ ہو، اس کے پیچھے کیوں پڑتے ہو؟ کیونکہ حضرت والا کی تعلیمات کا ایک بہت بڑا اصول یہ ہے کہ آدمی ''اختیاری'' امور کا اہتمام کرے، اور ''غیر اختیاری'' کی فکر میں نہ پڑے، یہ بڑا زرین اصول ہے، اس لئے کہ یہ غیر اختیاری کیفیات کہ کسی وقت عبادت کا ذوق و شوق ہو رہا ہے، کسی وقت ذوق و شوق نہیں ہو رہا، کسی وقت عبادت میں دل لگ رہا ہے، کسی وقت دل نہیں لگ رہا، یہ سب کیفیات آنی جانی ہیں، ان کے پیچھے

☆ اصلاحی مجالس (۶/۱۹۹ تا ۲۱۶)، رمضان المبارک، بعد از نماز ظہر، جامع مسجد دارالعلوم، کراچی

(۱) انفاسِ عیسیٰ، ص: ۱۹۴

پڑنے کی ضرورت نہیں، اصل مقصود "عمل" ہے، یہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی تعلیمات کا خلاصہ ہے۔ اس لئے جو لوگ "کیفیات" کے بہت پیچھے پڑتے ہیں، حضرت والا عام طور پر ان کی ہمت افزائی نہیں کیا کرتے۔

ہر مریض کے لئے علیحدہ نسخہ

بہر حال، اگر حضرت والا کا یہ جواب نہ پڑھا ہوتا تو ذہن اس طرف جاتا کہ حضرت والا جواب میں یہ تحریر فرمائیں گے کہ شرعاً یہ کوئی مطلوب بات نہیں کہ آدمی "بے چین" رہے۔ لیکن حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے یہاں پر ان صاحب کو یہ جواب نہیں دیا۔ بات دراصل یہ ہے کہ یہ طبیب کا کام ہوتا ہے کہ وہ آنے والے مریض کی حالت کے مناسب نسخہ تجویز کرے، یہ نہیں کہ بس ایک ہی نسخہ سب مریضوں کو گھوٹ کر پلا رہا ہے، اس لئے کہ مریض کے حالات کے مناسب ہر مریض کی دوا اور علاج میں فرق ہوتا ہے۔ اسی طرح ایک مرشدِ کامل کا کام بھی یہی ہے کہ وہ یہ دیکھے کہ اس آدمی کے موجودہ حالات میں یہ بات اس کے مناسب ہوگی یا نہیں؟ یہی ملکہ اللہ تعالیٰ مرشدِ کامل کو عطا فرماتے ہیں، اور ہم جب اس مرشدِ کامل کے پاس جاتے ہیں تو وہ ہمارے حالات کے لحاظ سے جواب دیتا ہے۔

نیکی کا خیال اللہ کا مہمان ہوتا ہے

یہاں پر حضرت والا نے اس خط کے جواب میں یہ نہیں لکھا کہ "تمہیں یہ بے چین ہونے کا شوق کیوں پیدا ہوا؟ اس کی کیا ضرورت ہے؟" یہ جواب کیوں نہیں لکھا؟ اس کی وجہ غالباً یہ ہے۔ واللہ سبحانہ اعلم۔ کہ حضرت والا نے یہ محسوس فرمایا کہ اس آدمی کے دل میں جو یہ شوق پیدا ہوا ہے، یہ بھی اس شخص کے حق میں ایک "وارِدِ قلبی" ہے، اور حضرات صوفیاء کرام رحمۃ اللہ علیہم یہ فرماتے ہیں کہ من جانب اللہ قلب پر جو "واردات" ہوتے ہیں، ان "واردات" کی ناقدری نہ کرو، اس لئے کہ یہ "واردات" اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھیجے ہوئے مہمان ہوتے ہیں، اگر اس مہمان کی خاطر تواضع کرو گے تو یہ مہمان بار بار آئے گا، اور اگر تم نے اس مہمان کی خاطر تواضع نہ کی، بلکہ ناقدری کر دی تو یہ مہمان روٹھ کر بھاگ جائے گا، پھر نہیں آئے گا۔

شریعت میں تو چین مطلوب ہے

اب اگر اس شخص کو جواب میں یہ لکھ دیتے کہ تیرا اس بے چین رہنے کا خیال درست نہیں ہے، تو اس صورت میں یہ "وارد" جو اس کے قلب پر وارد ہو رہا ہے، اس کی مخالفت کرنے سے اس کا نقصان

ہوتا، اور آئندہ یہ ''واردات'' بند ہو جاتے، اور اگر جواب میں اس کی ہمت افزائی فرماتے کہ یہ ''بے چینی'' کا حاصل ہونا تو بڑی اچھی بات ہے، ہم بھی دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ تمہیں یہ ''بے چینی'' عطا فرمادے، تو یہ جواب شریعت کے خلاف ہوتا، اس لئے کہ شریعت میں ''بے چینی'' مطلوب نہیں، شریعت میں تو ''چین'' اور ''اطمینان'' کا حصول مطلوب ہے، قرآن کریم میں ہے:

﴿اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ﴾ (۱)

یعنی اللہ ہی کے ذکر سے دلوں کو اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ لہٰذا شریعت میں یہ مطلوب نہیں کہ کوئی آدمی ''بے چینی'' کو اپنا مقصود بنالے، بلکہ شریعت کا تقاضا یہ ہے کہ آدمی ''اطمینان'' اور ''چین'' کو مقصود بنائے، اسی لئے خود حضورِ اقدس ﷺ نے یہ دعا فرمائی:

((اَللّٰهُمَّ إِنِّیْ أَسْئَلُكَ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِكَ تَجْمَعُ بِهَا أَمْرِیْ وَتَلُمُّ بِهَا شَعْثِیْ)) (۲)

''اے اللہ! میں آپ سے آپ کی رحمت کا سوال کرتا ہوں، جس کے نتیجے میں مجھے جمعیتِ خاطر اور سکون حاصل ہو جائے، اور میری پراگندگی کو جمعیت سے بدل دیجئے''

معلوم ہوا کہ شریعت میں اطمینان اور چین مقصود ہے، بذاتِ خود ''بے چینی'' مقصود نہیں۔

عجیب وغریب جواب

بہر حال، اگر اس خط کے جواب میں پہلی بات لکھ دیتے تو ''طریقت'' کی خلاف ورزی لازم آتی، اور اگر دوسری بات لکھ دیتے تو ''شریعت'' کی خلاف ورزی لازم آتی، اس لئے حضرت والا نے بڑا عجیب جواب یہ دیا کہ ''مگر اس کے ساتھ یہ بھی دعا کرو کہ اس ''بے چینی'' میں چین رہے''۔ اس لئے کہ ''بے چینی'' بذاتِ خود مطلوب نہیں، بلکہ ''چین'' مطلوب ہے، لیکن وہ ''چین'' اللہ تعالیٰ کی محبت کی ''بے چینی'' کے ذریعہ حاصل ہو، یعنی اللہ تعالیٰ کی محبت میں اضطراب ہو، اور اس اضطراب ہی میں اسے ''چین'' مل جائے۔

ہم اضطراب سے حاصل ''قرار'' کرلیں گے
یہ ''جبر'' ہے تو اسے اختیار کرلیں گے

یہ ''اضطراب'' بذاتِ خود مقصود نہیں لیکن یہ اضطراب بعض اوقات ''قرار'' پر منتج ہوتا ہے، اور

---

(۱) الرعد:۱۲۸

(۲) سنن الترمذی، کتاب الدعوات عن رسول الله صلی الله علیه وسلم، رقم: ۳۳٤۱

جو آدمی اس راستے سے گزرا نہ ہو، اس کو پوری طرح اس کا ادراک اور احساس اور فہم نہیں ہوسکتا۔ لیکن یہ بات ضرور ہے کہ ابتداءِ محبت میں تو جوش وخروش، اُبال اور بے چینی ہوتی ہے، پھر ایک مرحلہ ایسا آتا ہے کہ اس بے چینی کے اندر ''چین'' آجاتا ہے، اس لئے حضرت والا نے یہ جواب تحریر فرمایا۔

''خلافت'' اس طرح سستی نہیں بٹتی

اس سے پتہ چلا کہ دونوں کی اصلاح کا کام ہر ایک کے بس کی بات نہیں کہ بس چند اصطلاحات یاد کرلیں، اور لوگوں کی اصلاح کرنی شروع کردی۔

ہزار نکتۂ باریک تر زمو ایں جاست
نہ ہر کہ سر بتراشد قلندری داند

اس لئے یہ بڑا نازک کام ہے، کسی شخص کے لئے یہ فیصلہ کرنا اس کے لئے کیا بات اس وقت فائدہ مند ہوگی، بڑا مشکل کام ہے۔ اسی واسطے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے سلسلے میں یہ ''خلافت'' اس طرح سستی نہیں بٹتی تھی، جیسا کہ بعض مشائخ کے یہاں رواج ہے کہ جو آرہا ہے، اس کو ''خلافت'' دے رہے ہیں، جو آرہا ہے، اس کو ''خلافت'' دے رہے ہیں، کسی کو دیکھا کہ وہ نماز وغیرہ پڑھنے لگا ہے، اور اس کے اندر کچھ خشوع وخضوع پیدا ہوگیا ہے، اور کچھ ذکر واذکار کرنے لگا ہے، بس جا تو بھی ''خلیفہ'' ہمارے حضرات کا یہ مزاج نہیں تھا۔

ڈاکٹر بننے کے لئے صحت مند ہونا کافی نہیں

یہ مزاج کیوں نہیں تھا؟ اس لئے کہ خود درست ہوجانا اور بات ہے، اور دوسرے کا علاج کرنا اور بات ہے۔ ہر صحت مند شخص ''ڈاکٹر'' نہیں ہوتا۔ صحت مند شخص کے بارے میں یہ کہا جائے گا کہ اس کے اندر کوئی بیماری نہیں ہے، کوئی خرابی نہیں ہے، بہت تندرست ہے، لیکن وہ صحت مند دوسرے بیمار کا علاج کردے، یہ ضروری نہیں۔ اس لئے کہ ''ڈاکٹر'' بننے کے لئے بہت کچھ پڑھنا پڑتا ہے، پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں، تب جاکر اس کو ''مطب'' کھولنے کی اجازت ملتی ہے، اب کوئی شخص یہ کہے کہ میں تو بالکل تندرست ہوں، میری ساری رپوٹیں درست ہیں، میرا سارا جسمانی نظام درست ہے، لہٰذا میں ''ڈاکٹر'' بننے کے لائق ہوں، یا کوئی شخص ڈاکٹر کے پاس علاج کے لئے آئے، ڈاکٹر اس کا علاج کرے، اور جب وہ شخص سو فیصد بالکل تندرست ہوجائے تو ڈاکٹر اس کو سرٹیفکیٹ دے دیں کہ تم بھی ڈاکٹر بن جاؤ، اس لئے کہ تم اب تندرست ہوگئے ہو۔

''خلافت'' ایک شہادت اور گواہی ہے

یہی حال یہاں ہے کہ شیخ کے پاس ایک آدمی اپنی اصلاح کے لئے آیا، شیخ نے اس کے حالات کی اصلاح کی، وہ اتباع سنت پر آ گیا، اس کی نماز درست ہوگئی، اس کا روزہ درست ہوگیا، تو محض ان اعمال کے درست ہونے سے وہ ''خلافت'' کا اہل نہیں بن جاتا، اور ''خلافت'' کا مطلب دوسرے کے علاج کرنے کی صلاحیت پیدا ہونا، اور دوسرں کا علاج کرنا، یہ ہر ایک کی بس کی بات نہیں۔

اس لئے ہمارے حضرات کے یہاں ''خلافت'' بہت دیکھ بھال کے بعد جب پورا اطمینان ہو جائے اس وقت دی جاتی ہے، اس لئے کہ ''خلافت'' دینے کا مطلب یہ ہے کہ مخلوقِ خدا کے سامنے یہ شہادت اور سرٹیفکیٹ دینا ہے کہ ''ہم نے اس کو اچھی طرح پرکھ لیا ہے، اور جانچ لیا ہے، اور اب یہ شخص تمہارا روحانی علاج یعنی تمہارے امراضِ باطنی کا علاج کرنے کا اہل ہے۔'' پس ''خلافت'' اس بات کا سرٹیفکیٹ دینا نہیں ہے کہ یہ ''تندرست'' ہے یا متبعِ سنت ہے، لہٰذا جب تک یہ اطمینان نہ ہو جائے کہ یہ شخص دوسرں کے علاج کے لائق ہے اور یہ شخص طالبین اور اصلاح کے لئے آنے والوں کو ان کے مزاج اور ان کی ضرورت کے مطابق ان کی حاجت کے مطابق نسخہ تجویز کر سکتا ہے، اس وقت تک یہ ''شہادت'' دینا جائز نہیں۔

ہمارے حضرات یہ خطرہ مول نہیں لیتے

بزرگوں کے رنگ مختلف ہوتے ہیں، بعض بزرگوں کا یہ رنگ اور مزاج ہوتا ہے کہ جب اس شخص کو ہم ''خلافت'' دیدیں گے تو اللہ تعالیٰ اس کو قابل بھی بنا دیں گے، لیکن ہمارے حضرات یہ خطرہ مول نہیں لیتے، ہمارے حضرات یہ کہتے ہیں کہ جب تک یہ اطمینان نہیں ہو جائے گا، اس وقت تک یہ خطرہ مول نہیں لیتے، اس لئے کہ اگر کسی نے یہ اصول تو یاد کر لیا کہ ''فلاں چیز محمود ہے، اور فلاں چیز مذموم ہے'' تو بس وہ ہر جگہ یہ اصول چلائے گا، حالانکہ اتنی بات کافی نہیں، بلکہ ایک آنے والے کو دیکھنا پڑتا ہے کہ اس کے لئے کیا مناسب ہے اور کیا مناسب نہیں؟ لہٰذا دوسرں کی اصلاح کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔

''خلافت'' کا خیال بدترین حجاب ہے

حضرت والا نے یہ بھی فرمایا کہ جب کسی شیخ کے پاس علاج کے لئے جاؤ تو بس اپنے علاج کی

طرف متوجہ رہو، اس فکر میں مت رہو کہ فلاں درجہ مجھے حاصل ہو جائے، فلاں مقام حاصل ہو جائے، بلکہ شیخ کے حکم کی تعمیل میں اور اس کی نگرانی میں نتائج اور ثمرات سے بے فکر ہو کر عمل کرتے رہو۔ بعض لوگ جب کسی شیخ کے پاس اپنی اصلاح کے لئے جاتے ہیں تو ان کے حاشیہ خیال میں یہ بات رہتی ہے کہ یہ شیخ مجھے کسی وقت "خلافت" دیدے گا، یہ "خیال" اصلاح کے راستے میں بدترین حجاب ہے، اس خیال کے ہوتے ہوئے کبھی اصلاح مکمل ہو ہی نہیں سکتی، بلکہ "اصلاح" کا امکان ہی نہیں۔ اس لئے کہ اس صورت میں اپنی اصلاح کرانے کی نیت میں اخلاص ہی نہیں، بلکہ نیت یہ ہے کہ خاص منصب حاصل ہو جائے، گویا کہ اللہ کے لئے شیخ سے تعلق قائم نہیں کیا، اور اپنی اصلاح میں طلب صادق نہیں تھی، اور جب طلب صادق نہیں ہوتی اور اللہ کے لئے شیخ سے تعلق قائم نہیں کرتا تو شیخ کے پاس جانے کا کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوا۔

لہٰذا جب کبھی شیخ کے پاس جاؤ اس خیال سے ذہن کو خالی کر کے جاؤ، صرف اپنی اصلاح کی غرض سے جاؤ، کوئی خاص درجہ حاصل کرنا مقصود نہ ہو اور نہ کوئی مقام حاصل کرنا مقصود ہو۔

عبادت میں شوق، ولولہ، لذت مطلوب نہیں

آگے حضرت والا ایک اور ملفوظ میں ارشاد فرماتے ہیں:

"شوق" بمعنی "ولولہ" نہ بالذات مطلوب ہے، نہ شرائطِ قبول سے ہے، اخلاص کے ساتھ عمل ہونا کافی ہے، گو "ولولہ" نہ ہو، بلکہ طبیعت پر گرانی ہو، حدیث: اِسْبَاغُ الْوُضُوْءِ عَلَى الْمَكَارِهِ،(۱) اس کی نقلی دلیل ہے، جس سے دعاء مذکورہ سے زائد یہ بھی ثابت ہوتا ہے۔ کہ ایسے "مکارہ" سے اجر و فضل بڑھ جاتا ہے، اور عقلی حقیقت اس کی یہ ہے کہ طاعات بعض کے لئے مثل "غذا" کے ہیں، اور بعض کے لئے مثل "دوا" کے، اور ظاہر ہے کہ "دوا" کا نافع ہونا اس کی رغبت پر موقوف نہیں ہے، نیز ایسی حالت میں اس کا استعمال اور زیادہ ہمت اور مجاہدہ ہے، اور اس میں حکمتیں بھی ہوتی ہیں، جیسے عجب سے حفاظت، اور اپنے نقص کا مشاہدہ و نحو ہما، پس عبدِ کامل کا مذہب یہ ہونا چاہئے"(۲)

---

(۱) صحیح مسلم، کتاب الطهارة، باب فضل اسباغ الوضوء على المكاره، رقم:۳٦۹، سنن الترمذی، کتاب الطهارة عن رسول الله صلى الله عليه وسلم، باب ماجاء فی اسباغ الوضوء، رقم:٤٧، سنن النسائی، کتاب الطهارة، باب الفضل فی ذلك: رقم: ۱٤۳

(۲) انفاسِ عیسیٰ، ص:۱۹۴

ذوق وشوق محمود ہیں، اخلاص مطلوب ہے

اس ملفوظ میں حضرت والا نے بڑا عجیب اصول بیان فرمادیا ہے، اس میں بہت سے لوگ گمراہ اور پریشان ہوجاتے ہیں، وہ یہ کہ: عبادت میں ذوق وشوق اور ولولہ، یہ نہ تو مطلوب ہے کہ آدمی اس کو اپنا مقصود بنالے کہ میرے اندر شوق اور ولولہ پیدا ہوجائے، اور جوش پیدا ہوجائے، اور نہ ہی اعمال کی قبولیت کی شرائط میں یہ بات داخل ہے کہ جب تم جوش کے ساتھ، شوق کے ساتھ عمل کروگے تب یہ عمل قبول ہوگا، ورنہ قبول نہیں ہوگا۔ شوق کا مطلب یہ کہ نماز کے اندر آپ کو مزہ آنے لگے، اور یہ شوق پیدا ہوجائے کہ جلدی جاکر نماز پڑھو، اگر یہ شوق وذوق پیدا ہوجائے تو یہ اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے، اور اچھی بات ہے، اور محمود ہے، لیکن یہ شوق مقصود بالذات نہیں، اور نہ ہی عمل کی قبولیت کے لئے شرط ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ یہ نہیں فرمائیں گے کہ تو نے جو نماز پڑھی تھی وہ ذوق وشوق کے بغیر پڑھی تھی، لہٰذا تیری نماز قبول نہیں۔ اس لئے کہ نماز کی قبولیت کے لئے ''اخلاص'' شرط ہے، لہٰذا اگر عمل ''اخلاص'' کے ساتھ ہو، اور سنت کے مطابق ہو، بس یہ دو چیزیں اگر عمل کے اندر پائی جائیں گی تو مقصود حاصل ہوجائے گا، اور ان شاء اللہ وہ عمل اللہ تعالیٰ کے یہاں قبول ہوگا، چاہے وہ عمل کتنی ہی مشقت کے ساتھ کیا تھا، اور اس عمل کے کرنے کا دل نہیں چاہ رہا تھا، سستی ہورہی تھی، لیکن آپ نے یہ سوچا نماز تو فرض ہے، جو مجھے پڑھنی ہے۔ یہ سوچ کر بلاشوق اور ذوق کے زبردستی اپنے اُوپر جبر کرکے نماز سنت کے مطابق پڑھ لی، چونکہ ''اخلاص'' تھا، اور سنت کے مطابق وہ نماز تھی، اس لئے وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں قبول ہوگی۔ اللہ تعالیٰ یہ نہیں فرمائیں گے کہ چونکہ تم نے طبیعت کی گرانی اور بدشوقی کے ساتھ نماز پڑھی، اس لئے تمہیں سزا ملنی چاہئے۔ اس لئے کہ یہ چیز نہ مقصود ہے، اور نہ ہی شرائطِ قبول میں سے ہے۔

میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے

البتہ نماز کے اندر ذوق وشوق اور ولولہ مطلوب ہے، اور اس کی دلیل حضورِ اقدس ﷺ کی وہ حدیث ہے کہ جس میں آپ نے فرمایا:

((جُعِلَتْ قُرَّةُ عَيْنِیْ فِی الصَّلَاةِ)) (۱)

''میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے''

مطلب یہ ہے کہ حضورِ اقدس ﷺ کو نماز کے اندر وہ لطف اور وہ کیف محسوس ہوتا تھا جو دنیا

---

(۱) سنن النسائي، كتاب عشرة النساء، باب حب النساء، رقم: ۳۸۷۸، مسند أحمد، مسند انس بن مالك، رقم: ۱۱۸٤٥

کی کسی اور چیز میں محسوس نہیں ہوتا تھا، یہ بات آپ کو حاصل تھی، لیکن آپ نے دوسروں سے یہ نہیں فرمایا کہ جب تک نماز کے اندر تمہیں وہ کیفیت حاصل نہیں ہوگی جو کیفیت مجھے حاصل ہوتی ہے، اس وقت تک تمہاری نماز قبول نہیں ہوگی، بلکہ آپ نے دوسروں سے فرمایا:

((صَلُّوْا كَمَا رَأَيْتُمُوْنِيْ أُصَلِّيْ)) (۱)

جس طرح تم مجھے نماز پڑھتا ہوا دیکھتے ہو اس طرح نماز پڑھ لو، بس تمہارے لئے اتنا ہی کافی ہے۔

بلا شوق والا عمل ثواب میں بڑھ جاتا ہے

بعض لوگ اس فکر میں بہت زیادہ پڑے رہتے ہیں کہ نماز میں مزہ نہیں آتا، ذوق و شوق پیدا نہیں ہوتا۔ تو بھائی! مزہ مطلوب ہی کہاں ہے؟ مطلوب اور مقصود تو اللہ کی رضا ہے، اگر وہ حاصل ہو رہی ہے تو پھر مطمئن ہو جاؤ، بلکہ حضرت فرماتے ہیں کہ: بعض اوقات اجر کے اعتبار سے وہ شخص بڑھ جاتا ہے جس نے عبادت کا کوئی عمل ناگواری اور مشقت کے ساتھ کیا، اور اس کو اس عمل میں مزہ بالکل نہیں آیا، دوسرے شخص کے مقابلے میں جس کو عبادت میں بہت مزہ آیا، اس کی دلیل وہ حدیث ہے جس میں حضور اقدس ﷺ نے فرمایا:

((اِسْبَاغُ الْوَضُوْءِ عَلَى الْمَكَارِهِ.......... فَذٰلِكُمُ الرِّبَاطُ)) (۲)

یعنی جو شخص اس وقت اچھی طرح وضو کرے جس وقت وضو کرنا طبیعت پر بہت شاق اور گراں ہو رہا ہو، اس کو جہاد کا ثواب ملتا ہے، مثلاً سخت سردی اور جاڑے کا موسم ہے، برف گر رہی ہے، پانی بہت ٹھنڈا ہے، گرم پانی کا کوئی انتظام نہیں، نماز کا وقت آچکا ہے، اس وقت میں ٹھنڈے پانی سے وضو کرنا بڑا مشکل معلوم ہوتا ہے، لیکن جو شخص اس مشکل کے باوجود اللہ کا حکم سمجھ کر وضو کرے تو یہ ایسا عمل ہے جیسے جہاد میں رات کو سرحد پر پہرا دینا۔

اب بتایئے! اس وضو کے اندر اس کو کب مزہ آیا؟ معلوم ہوا کہ دل کی گرانی کے ساتھ عمل

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب الأذان، باب الأذان للمسافر اذا کانوا جماعة والاقامة وكذلك، رقم: ۵۹۵، سنن الدارمی، کتاب الصلاة، باب من أحق بالإمامة، رقم: ۱۲۲۵

(۲) صحیح مسلم، کتاب الطهارة، باب فضل اسباغ الوضوء علی المکاره، رقم: ۳۶۹، سنن الترمذی، کتاب الطهارة عن رسول الله ﷺ، باب ما جاء فی اسباغ الوضوء، رقم: ۴۷، سنن النسائی، کتاب الطهارة، باب الفضل فی ذلك، رقم: ۱۴۳، سنن ابن ماجه، کتاب الطهارة وسننها، باب ما جاء فی اسباغ الوضوء، رقم: ۴۲۱

کرنے میں بعض اوقات ثواب بڑھ جاتا ہے، اس عمل کے مقابلہ میں جس کو شوق اور ذوق کے ساتھ کیا ہو، اس لئے کہ ذوق وشوق والے عمل میں تکلیف اور مشقت نہیں ہوتی۔

جس کو نماز میں مزہ نہ آئے اس کو مبارک باد

اسی لئے حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ "میں اس شخص کو مبارک باد دیتا ہوں جس کو ساری عمر نماز پڑھنے میں مزہ نہیں آیا، لیکن پھر بھی اللہ کا حکم بجالانے کی خاطر نماز پڑھتا رہا" اس لئے کہ اگر نماز میں مزہ آجائے، یہ اچھی بات تو ہے، لیکن اس میں خطرہ بھی ہے، وہ یہ کہ ہوسکتا ہے کہ وہ مزہ کی خاطر نماز پڑھ رہا ہو، اللہ کی رضا کے لئے نماز نہ پڑھ رہا ہو۔ لہٰذا اس بات کا اندیشہ ہے کہ "اخلاص" مفقود ہوجائے۔

دوسری بات یہ ہے کہ جب نماز کے اندر مزہ زیادہ آنے لگتا ہے تو آدمی کے اندر عجب پیدا ہونے لگتا ہے، اور یہ خیال ہونے لگتا ہے کہ "میں تو اس مقام تک پہنچ گیا" اور خود پسندی کے اندر مبتلا ہوجاتا ہے کہ میں تو اب بزرگی کے اعلیٰ مقام تک پہنچ گیا ہوں، اور اللہ والا بن گیا ہوں کہ یہ عبادات اب میری طبیعتِ ثانیہ بن گئی ہیں۔ یہ برائیاں انسان کے اندر اس مزہ کی وجہ سے پیدا ہوجاتی ہیں، اور جس بیچارے کو نماز میں مزہ ہی نہیں آرہا ہے اس کے دل میں یہ خیالات کہاں سے آئیں گے، اس کو تو یہ فکر ہوگی کہ کہیں میری نماز میرے منہ پر نہ ماردی جائے۔

ریٹائرڈ شخص کی نماز

ہمارے حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ ایک بڑی پیاری مثال دیا کرتے تھے، فرمایا کرتے تھے کہ لوگ "کیفیات" کو "روحانیت" سمجھتے ہیں، یعنی عبادت میں شوق، ذوق، لطف اور مزہ آرہا ہو تو یہ سمجھا جاتا ہے کہ "روحانیت" زیادہ ہے۔ یہ سب باتیں غلط ہیں، بلکہ جس عبادت میں جتنی زیادہ سنت کی اتباع ہوگی، اتنی ہی روحانیت زیادہ ہوگی۔ ان کیفیات کا روحانیت سے کوئی تعلق نہیں۔ پھر ایک مثال دیتے ہوئے فرماتے تھے کہ دو آدمی ہیں، ان میں سے ایک ریٹائرڈ ہے، اور ملازمت سے بالکل فارغ ہے، فارغ زندگی گزار رہا ہے، اور پنشن جاری ہے، اور اس پنشن سے اچھی طرح گزارا ہورہا ہے، اولاد بھی کمارہی ہے، بچوں اور بچیوں کی شادی کرکے فارغ ہوگیا ہے، اب اس کو کسی چیز کی کوئی فکر نہیں ہے، آرام سے گھر میں فراغت کی زندگی گزار رہا ہے، وہ شخص یہ کرتا ہے کہ اذان سے پہلے ہی وضو کرکے تیار ہوگیا، اور اذان ہوتے ہی مسجد کی طرف روانہ ہوگیا، اور صفِ اوّل میں پہنچ گیا، اور وہاں پہنچ کر اس نے تحیۃ المسجد کے نوافل ادا کیے، اور پھر سنتیں ادا کیں، اور نماز کے انتظار میں بیٹھا ذکر کرتا رہا، اور جب

جماعت کھڑی ہوئی تو بڑے اطمینان کے ساتھ خشوع وخضوع کے ساتھ نماز ادا کی، اور پھر اطمینان سے گھر واپس آ گیا، اور دوسری نماز کے انتظار اور اس کی تیاری میں لگ گیا۔

ٹھیلے پر سامان بیچنے والے کی نماز

دوسرا آدمی ٹھیلے پر اپنا سامان بیچ کر اپنا اور اپنے بیوی بچوں کا پیٹ پالتا ہے، سڑک کے کنارے کھڑا ہو کر آواز لگا کر اپنا سامان فروخت کرتا رہتا ہے، گھر میں دس افراد کھانے والے ہیں، ہر وقت اسی فکر میں لگا رہتا ہے کہ کسی طرح میرا سامان فروخت ہو جائے تو کچھ پیسے کما کر بچوں کی روٹی کا بندوبست کروں۔ اسی حالت میں اذان ہو گئی، اب گاہک اس سے سامان خرید رہے ہیں، ایک کو کچھ دے رہا ہے، دوسرے کو کچھ دے رہا ہے، لیکن اس کا دماغ اس طرف لگا ہوا ہے کہ اذان ہو چکی ہے، اور مجھے نماز پڑھنی ہے، اب وہ اپنے گاہکوں کو جلدی جلدی نمٹا رہا ہے، جب بالکل عین جماعت کا وقت ہو گیا تو اس وقت اس نے جلدی سے ٹھیلے کو ایک طرف کھڑا کیا، اور اس کے اُوپر کپڑا ڈالا، اور بھاگتا ہوا مسجد میں پہنچا، اور جلدی جلدی وضو کیا، اور جماعت میں شامل ہو گیا، اب اس وقت اس کا دل کہیں ہے، دماغ کہیں ہے، اور یہ خیال آ رہا ہے کہ کہیں کوئی چور ٹھیلا نہ لے جائے، کوئی سامان چوری نہ کر لے، اب اپنی طرف سے اس نے نماز کے اندر دل لگانے کی کوشش کر لی، لیکن ایسے حالات میں نماز پڑھ رہا ہے کہ ان خیالات کی طرف سے دماغ کو خالی کرنا مشکل ہے، لیکن بہر صورت، اس نے سنت کے مطابق نماز پڑھ لی، اور پھر جلدی سے سنتیں ادا کیں، اور سلام پھیر کر سیدھا اپنے ٹھیلے پر پہنچ گیا، اور کپڑا ہٹایا، اور پھر آوازیں لگانا شروع کر دیں، اور سامان بیچنا شروع کر دیا۔

روحانیت کس کی نماز میں زیادہ ہے؟

حضرت فرماتے ہیں کہ بتاؤ! ان دونوں میں سے کس کی نماز میں روحانیت زیادہ ہے؟ بظاہر تو یہ نظر آ رہا ہے کہ پہلا آدمی جو ریٹائرمنٹ کی زندگی گزار رہا ہے، جس نے بڑے اطمینان اور سکون سے نماز ادا کی تھی، اس کی نماز میں روحانیت زیادہ ہے، لیکن حقیقت میں دوسرا آدمی جو ٹھیلا لگا کر اپنا سامان فروخت کرتا تھا، اس کی نماز میں روحانیت زیادہ ہے۔ اس لئے کہ پہلے آدمی کو تو کوئی کام ہی نہیں تھا، اس لئے اس نے اپنے آپ کو نماز کے لئے اور عبادت کے لئے فارغ کر لیا تھا، لہٰذا نماز پڑھنا اس کا کوئی کمال نہیں تھا، بلکہ کمال تو اس ٹھیلے والے کا ہے کہ اس کے گھر میں دس افراد کھانے والے تھے، ان کے لئے روزی کمانی تھی، اور ٹھیلے پر گاہک سامان خریدنے کے لئے کھڑے ہوئے تھے، ایسی حالت میں اذان کی آواز سن کر ٹھیلے کو ایک طرف کر کے مسجد کی طرف نماز کے لئے چلا گیا، اس کی نماز میں

زیادہ روحانیت ہے، اس لئے کہ اس نے نماز کے لئے جسمانی اور ذہنی مشقت زیادہ اُٹھائی، اس مشقت کی وجہ سے اس کے عمل میں روحانیت زیادہ ہے، اور اس پر اس کو اجر بھی زیادہ ملے گا۔ لہٰذا یہ سمجھنا کہ اگر ذوق وشوق و ولولہ اور جذبہ ہوگا تب عبادت قبول ہوگی، ورنہ نہیں، یہ بات درست نہیں ہے۔

وہاں تعمیلِ حکم کا جذبہ دیکھا جاتا ہے

اللہ تعالیٰ کے یہاں اصل چیز جو دیکھی جاتی ہے، وہ تعمیل حکم کا جذبہ ہے کہ ہم نے بندے کو عبادت کا حکم دیا تھا، یہ بندہ عبادت ادا کرنے کے لئے ہمارے حکم کی تعمیل میں آ گیا، اگر چہ حالات نے اس کے دل و دماغ کو منتشر کر رکھا ہے، لیکن چونکہ یہ اخلاص کے ساتھ آ گیا، اور اس نے ہمارے حبیب جناب رسول اللہ ﷺ کی سنت کے مطابق عبادت انجام دے لی، بس اس کی عبادت قبول ہے۔ اس لئے حضرت والا فرماتے ہیں کہ اس ذوق وشوق کے حصول کی فکر میں مت پڑو۔

ساقی جیسے پلا دے وہ اس کی مہربانی ہے

ہاں! اگر کسی کو ذوق وشوق کی یہ نعمت میسر آ جائے تو اس پر بھی وہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے کہ یا اللہ! آپ نے میری اس عبادت کو آسان فرما دیا، اور مجھے عبادت میں لطف اور مزہ بھی آنے لگا، لیکن اس لطف اور مزہ کی طلب میں بہت زیادہ پڑنے کی ضرورت نہیں، چنانچہ آخر میں حضرت والا نے مولانا رومی رحمہ اللہ کا ایک شعر لکھا ہے کہ:

بدرد و صاف ترا حکم نیست دم در کش
کہ آنچہ ساقیٔ ما ریخت عین الطاف ست

یعنی تجھ کو یہ حق نہیں کہ تو ساقی سے یہ مطالبہ کرے کہ مجھے صاف صاف شراب دینا، اور تلچھٹ مت دینا، بلکہ ساقی جیسی شراب بھی تجھ کو دیدے، یہ اس کی عین مہربانی ہے، اب چاہے وہ صاف صاف شراب دیدے، یا تلچھٹ دیدے، لیکن دیدے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ سے "عمل" کی توفیق مانگتے رہو، جب ان کی طرف سے "عمل" کی توفیق ہو جائے تو یہ ان کا کرم ہے، چاہے اس "عمل" میں مزہ آئے یا نہ آئے، لطف آئے یا نہ آئے، بس! اس پر راضی رہو کہ عمل کی توفیق ہو رہی ہے، اس سے آگے بڑھنے کی فکر مت کرو۔

خلاصہ

خلاصہ یہ کہ عبادت کے اندر شوق، ولولہ اور مزہ کا آنا مطلوب نہیں، اور عبادت کی قبولیت کی شرائط میں سے نہیں، لہٰذا اس فکر میں پڑے بغیر عبادت کو اخلاص کے ساتھ اور سنت کے مطابق کرنے کی فکر کرو، پھر اگر وہ حاصل ہو جائے تو بہت اچھا، نہ ملے تو کوئی غم نہیں۔ آج بہت بڑی مخلوق اس فکر میں پریشان رہتی ہے کہ ہم نماز پڑھتے ہیں، مگر نماز میں مزہ ہی نہیں آتا۔ اس کی وجہ سے پھر اپنے اعمال کی اور اپنی عبادات کی ناقدری شروع کر دیتے ہیں، ایسا نہیں کرنا چاہئے، عبادت کے اندر دو باتوں کا ہونا کافی ہے، ایک یہ کہ اخلاص ہو، دوسرے یہ کہ سنت کے مطابق ہو۔ اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ سب کو ان پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.

اعمال کے دنیاوی ثمرات ☆

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ، وَالْعَاقِبَۃُ لِلْمُتَّقِیْنَ، وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ وَعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ. اَمَّا بَعْدُ!

ایک ملفوظ میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ارشاد فرمایا:

''اعمالِ صالحہ میں نفع نقد بھی ہے، صرف اُدھار ہی نہیں، ہاں! ایک اُدھار بھی ہے، یعنی ثواب، اور اس کے ساتھ ایک چیز نقد بھی ہے یعنی رجا اور اُمید، اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق کا وابستہ ہو جانا، جو بدون اعمالِ صالحہ کے حاصل نہیں ہوتا، اسی طرح اعمالِ سیئہ کا ایک ثمرہ اُدھار ہے، اور ایک نقد ہے، اُدھار تو عذابِ جہنم ہے، اور نقد وہ وحشت، ظلمت اور بے چینی ہے، جو گناہوں کو لازم ہے''(۱)

اعمال کا ثمرہ نقد بھی، اُدھار بھی

اس ارشاد کا مقصود ایک غلط فہمی کا ازالہ ہے، وہ یہ کہ عام طور پر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم جو کچھ اعمال اس دنیا میں کرتے ہیں، چاہے وہ نیک اعمال ہوں یا برے اعمال ہوں، ان کا نتیجہ اور ثمرہ، اور ان کا فائدہ اور نقصان آخرت میں ظاہر ہوگا۔ اگر اعمال اچھے ہیں تو ثواب ملے گا انشاء اللہ، اگر اعمال خراب ہیں تو عذاب ہوگا۔ گویا کہ جو کچھ بھی ہے وہ اُدھار ہے، یہاں دنیا میں نقد کچھ نہیں۔

حضرت والا اس ملفوظ میں اس غلط فہمی کی تردید فرما رہے ہیں کہ یہ بات نہیں ہے کہ اعمال کے تمام ثمرات اور ان کے تمام نفع نقصان اُدھار ہی ہوں، بلکہ اعمال کے کچھ ثمرات انسان کو اس دنیا میں بھی مل جاتے ہیں۔

نیک عمل کا پہلا نقد فائدہ

وہ نقد ثمرات کیا ہیں؟ اس پر فرمایا کہ نیک اعمال کا سب سے پہلا ثمرہ یہ ملتا ہے کہ نیک عمل

☆ اصلاحی مجالس (۳۰۸/۶ تا ۳۲۰)

(۱) انفاسِ عیسیٰ، ص: ۲۰۵

کرنے کے بعد انسان کو یہ اُمید ہو جاتی ہے کہ شاید اللہ تبارک وتعالیٰ اس عمل کی بدولت اپنے فضل وکرم سے اس عمل کو اپنی بارگاہ میں شرفِ قبول عطا فرما کر مجھے نواز دیں، اس کا نام ''رجا'' اور ''اُمید'' ہے، یہ نیک عمل کا نقد فائدہ ہے، جو انسان کو حاصل ہوتا ہے۔

اپنے عمل پر نظر خود پسندی ہے

یہاں ایک باریک بات کا سمجھنا ضروری ہے، وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو نیک عمل کرنے کی توفیق دی ہے، اگر انسان کی نگاہ اس عمل کی طرف ہو جائے، اور وہ یہ سوچ کہ مجھ سے یہ بڑا اچھا کام ہو گیا، اور اس کے نتیجے میں آدمی عجب کے اندر مبتلا ہو جائے، یا یہ سمجھے کہ بس یہ میرا نیک عمل مجھے نجات دلائے گا، اور مجھے جنت میں لے جائے گا تو یہ بڑی خطرناک بات ہے، اور اسی کو صوفیاء کرام کی اصطلاح میں ''رؤیتِ عمل'' اور ''خود پسندی'' کہا جاتا ہے۔

مثال کے طور پر ایک شخص نماز پڑھے، اور یہ سوچ کہ میں بڑی اچھی نماز پڑھتا ہوں، اور چونکہ میں اچھی نماز پڑھتا ہوں، اس لئے میں بڑا اچھا ہوں، یا یہ سوچ کہ میری یہ نماز مجھے جنت میں لے جائے گی، یہ سوچ بڑی خطرناک ہے۔ اب ایک طرف تو حضرت والا یہ فرما رہے ہیں کہ عمل کا نقد ثمرہ یہ ہوتا ہے کہ اس نیک عمل سے اُمید پیدا ہو جاتی ہے، اور دوسری طرف صوفیاء کرام فرماتے ہیں کہ ''رؤیتِ عمل'' اور ''خود پسندی'' ناجائز ہے، بقول کسی کے:

ہزار نکتۂ باریک تر زمو ایں جاست
نہ ہر کہ سر بتراشد قلندری داند

یہ بہت خطرناک وادیاں اور گھاٹیاں ہیں، جن سے انسان کو گزرنا پڑتا ہے۔

خود پسندی اور رجا میں فرق

اب سوال یہ ہے کہ ان دونوں کے درمیان فرق کس طرح کیا جائے؟ آیا کہ یہ سوچ ''خود پسندی'' میں داخل ہے یا یہ ''رجا'' اور ''اُمید'' میں داخل ہے؟

دونوں کے درمیان فرق اس طرح ہے کہ اگر کسی عمل کے کرنے کے بعد طبیعت میں بشاشت اور خوشی پیدا ہوئی، اور اس بشاشت کے نتیجے میں شکر ادا کیا کہ الحمدللہ مجھے اس نیک عمل کی توفیق ہوگئی، اور یہ اُمید بندھ گئی کہ جب اللہ تعالیٰ نے مجھے اس عمل کی توفیق دی ہے تو اس بات کی اُمید ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے مجھے نواز دیں گے، بس اس حد تک تو یہ ''رجا'' ہے، چنانچہ ایک حدیث میں حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((اِذَا سَرَّتْكَ حَسَنَتُكَ وَسَاءَتْكَ سَيِّئَتُكَ فَأَنْتَ مُؤْمِنٌ)) (۱)

''جب تمہیں اپنے اچھے عمل سے خوشی ہو، اور برے کام سے رنج اور تکلیف ہو تو یہ تمہارے ایمان کی علامت ہے''

ایک صحابی نے حضورِ اقدس ﷺ سے کہا کہ یا رسول اللہ! بعض اوقات میں کوئی اچھا عمل کرتا ہوں، تو عمل کرنے کے بعد مجھے خوشی ہوتی ہے کہ الحمدللہ میں نے ایک اچھا عمل کیا، کیا یہ خوشی ''عجب'' اور ''تکبر'' تو نہیں ہے؟ جواب میں حضورِ اقدس ﷺ نے فرمایا:

((لَا تِلْكَ عَاجِلُ بُشْرَى الْمُؤْمِنِ)) (۲)

یعنی نیک عمل کر کے تمہیں جو خوشی حاصل ہوئی، یہ مومن کے لئے نقد خوشخبری ہے، لہٰذا گھبرانے کی بات نہیں۔

جنت فضل پر ملے گی، عمل پر نہیں

صوفیاء کرام جس کو ''رؤیتِ عمل'' اور ''خود پسندی'' کہتے ہیں، وہ یہ ہے کہ آدمی کو نیک عمل کرنے کے بعد اپنے عمل پر یہ گھمنڈ ہو جائے کہ یہ میرا عمل اتنا اچھا ہے کہ یہ مجھے سیدھا جنت میں لے جائے گا۔ اور میرا جنت میں جانا اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کی بنیاد پر نہیں، بلکہ میرے عمل کی ذاتی خاصیت کی بنیاد پر میں اس بات کا مستحق ہو چکا ہوں کہ اللہ تعالیٰ مجھے جنت میں داخل کر دیں۔ یہ بڑی خطرناک بات ہے۔ ارے استحقاق کوئی چیز نہیں، تم کتنا ہی عمل کرتے رہو، مگر جنت کا استحقاق پیدا نہیں ہوگا۔ اس لئے کہ جنت کی نعمتیں غیر متناہی ہیں، اس کے آگے تمہارے عمل کی کیا حقیقت ہے؟ تم نے تو دو منٹ میں ایک عمل کر لیا، یا پانچ منٹ میں ایک عمل انجام دے دیا، اور پھر کہنے لگے کہ مجھے اس عمل کے بدلے جنت چاہئے، وہ جنت جو غیر متناہی ہے، اور جس کی نعمتیں ابدی ہیں، جن کی کوئی حد و نہایت نہیں، چار رکعات کے بدلے ایسی جنت مانگتے ہو؟ تم کتنا ہی عمل کرتے رہو پھر بھی جنت کا استحقاق نہیں ہوگا، فرض کرو کہ تم کو اسی سال کی زندگی ملی، اور تم نے اپنی پوری زندگی سجدے میں پڑے پڑے گزار دی، تو اس کا مطلب یہ ہوا تم نے زیادہ سے زیادہ اسی سال عبادت کی، اور دوسری طرف جنت کی نعمتیں، نہ سو سال، نہ ہزار سال، نہ لاکھ سال، بلکہ دائمی اور ابدی ہیں، اگر انسان ساری عمر بھی عبادت کرتا رہے تو جنت کا استحقاق پیدا نہیں ہوگا، لہٰذا انسان کا کوئی عمل ایسا نہیں جو انسان کو جنت کا

---

(۱) مسند أحمد بن حنبل، حديث أبي أمامة الباهلي، رقم: ٢١١٤٥

(۲) صحيح مسلم، كتاب البر والصلة والآداب، باب اذا أثنى على الصالح فهي بشرى ولا تضره، رقم: ٤٧٨٠، مسند أحمد، حديث أبي ذر الغفاري، رقم: ٢٠٤١٦

مستحق بنا دے، یہ ان کا کرم ہے کہ بعض مرتبہ وہ کہہ دیتے ہیں کہ اے بندے! تو نے چونکہ یہ عمل کیا تھا، اس لئے ہم تمہیں جنت کا مستحق بنا دیتے ہیں۔

قرآن کریم کی بعض آیات میں استحقاق کی طرف اشارہ بھی فرمایا، مگر وہ استحقاق بھی اللہ تعالیٰ کے فضل سے پیدا کیا ہوا ہے، ورنہ عمل کے اندر اپنی ذات میں یہ طاقت نہیں کہ وہ جنت کا مستحق بناتا، ساری زندگی روزے میں گزار دو، ساری زندگی عبادت میں گزار دو، ذکر و تسبیح میں گزار دو، تب بھی استحقاق پیدا نہیں ہوگا۔

حضور ﷺ کا عمل اور جنت

اسی لئے حدیث شریف میں حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ کسی انسان کا کوئی عمل اس کو جنت میں نہیں لے جائے گا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے سوال کیا کہ آپ کا بھی عمل آپ کو جنت میں نہیں لے جائے گا؟ آپ نے جواب میں فرمایا:

((لَا، إِلَّا أَنْ يَتَغَمَّدَنِيَ اللّٰهُ بِرَحْمَتِهِ)) (۱)

"نہیں، میرا عمل بھی مجھے جنت میں نہیں لے جائے گا، جب تک کہ اللہ تعالیٰ مجھے اپنی رحمت سے ڈھانپ نہ لیں"

آپ دیکھیں کہ ساری کائنات میں کسی کا بھی عمل کمّا اور کیفًا نبی کریم ﷺ کے عمل کے برابر تو کجا اس کا پاسنگ بھی نہیں ہو سکتا، آپ یہ فرما رہے ہیں کہ میرا عمل بھی مجھے جنت میں نہیں لے جائے گا، جب تک اللہ تعالیٰ مجھے اپنی رحمت میں ڈھانپ نہ لے، اس سے پتہ چلا کہ عمل سے جنت کا استحقاق پیدا نہیں ہوتا۔

نیک اعمال فضل کی علامت ہیں

البتہ اللہ تعالیٰ نے ان نیک اعمال کو اپنے فضل و کرم کی علامت بنایا ہے، یعنی اگر کوئی شخص یہ اعمال کر رہا ہے تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ انشاء اللہ، اللہ کا فضل اس شخص پر ہوگا، اور اس نیک عمل کے انجام پانے پر خوشی اس بات کی ہے کہ جب مجھے اللہ تعالیٰ نے نماز پڑھنے کی توفیق عطا فرمائی تو الحمد للہ میرے اندر وہ علامت پائی گئی جس سے یہ پتہ چل رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے مجھے

(۱) صحیح البخاری، کتاب الرقاق، باب القصد والمداومة علی العمل، رقم: ۵۹۸۲، صحیح مسلم، کتاب صفة القیامة والجنة والنار، رقم: ۵۰۳۶، سنن النسائی، کتاب الایمان، رقم: ۴۹۴۸، سنن ابن ماجه، کتاب الزهد، رقم: ۴۱۹۱۔

نواز دیں گے۔ لہٰذا یہ مسرت، علامت پائے جانے کی مسرت ہے، یہ اس بات کی مسرت نہیں کہ مجھ سے کوئی بہت بڑا کام انجام پا گیا ہے، جو مجھے جنت کا مستحق بنا دے گا۔

یہ باریک بات ہے، جو ذہن میں رہنی چاہئے۔

عمل سے جنت کا مستحق نہیں ہوتا

اللہ تعالیٰ کی سنت یہ ہے کہ جب کوئی بندہ نیک عمل کرتا ہے تو اس کو نواز دیتے ہیں، اور اس کو اپنے فضل وکرم کا مورد بنا دیتے ہیں، اور بغیر عمل کے عادۃً فضل وکرم کا مورد نہیں بناتے، اب اگر کوئی شخص یہ سوچے کہ جب میرا عمل مجھے جنت میں نہیں لے جائے گا تو پھر عمل کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ اس لئے کہ عمل سے جنت کا استحقاق تو پیدا ہوتا نہیں ہے، بس اللہ تعالیٰ سے بیٹھ کر مانگتے رہو کہ یا اللہ! مجھے اپنی رحمت کا مورد بنا دیجئے۔

یاد رکھیں کہ اللہ کی رحمت کا مورد بننے کے لئے اور جنت کا مستحق بننے کے لئے اللہ تعالیٰ کی سنت یہ ہے کہ جب کوئی شخص عمل کرے گا تو اس کو نوازا جائے گا، لہٰذا عمل ضروری بھی ہے، اور جنت میں جانے کے لئے علتِ تامہ بھی نہیں، اور جنت کے استحقاق کے لئے بھی علتِ تامہ نہیں، بلکہ یہ عمل اللہ تعالیٰ کے فضل کی ایک علامت ہے۔

حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کا حکیمانہ ارشاد

حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ نے بڑی حکیمانہ بات ارشاد فرمائی، فرمایا:

> ''جو شخص عمل کرتا ہے اور اس عمل کی بنیاد پر جنت کی آس لگائے بیٹھا ہے کہ اس کا یہ عمل اس کو جنت میں لے جائے گا تو وہ شخص خواہ مخواہ فضول محنت کر رہا ہے، اور جو شخص یہ آرزو کر رہا ہے کہ میں عمل کے بغیر جنت میں چلا جاؤں گا تو وہ شخص اپنے آپ کو دھوکہ دے رہا ہے''

اس لئے کہ دونوں باتیں غلط ہیں، کیونکہ کوئی بھی شخص عمل کے بغیر جنت میں نہیں جائے گا، اور تنہا عمل بھی اس کو جنت میں نہیں لے جائے گا، جب تک اس عمل کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا فضل وکرم اور اس کی رحمت شامل نہ ہو۔ لہٰذا عمل بھی کرنا ہے اور اس عمل کو علامتِ نجات بھی سمجھنا ہے، لیکن اس عمل کو جنت کے استحقاق کا سبب نہیں سمجھنا ہے، لہٰذا جب اللہ جل شانہ کی طرف سے نیک عمل کی توفیق ہو تو اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو، اور کہو کہ اے اللہ! آپ کا فضل وکرم ہے کہ آپ نے مجھے اس عمل کی توفیق عطا فرما دی۔ اور یہ اُمید رکھو کہ جب اللہ تعالیٰ نے اس نیک عمل کی توفیق عطا فرمائی ہے تو اس نے ہمیں

نوازنے کا ارادہ فرمایا ہے، اگر نوازنا نہ ہوتا تو نیک عمل کی توفیق نہ دیتے۔

نیک عمل کی توفیق ان کی طرف سے جواب ہے

حضرت مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ بعض اوقات آدمی کے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ میں اللہ میاں کو اتنا پکارتا ہوں لیکن ان کی طرف سے کبھی جواب ہی نہیں آتا، کبھی تو جواب آتا، ہم دعا کر رہے ہیں تو انہیں پکار رہے ہیں، کبھی ذکر کے ذریعہ انہیں پکار رہے ہیں، کبھی نماز کے ذریعہ، کبھی تلاوت کے ذریعہ انہیں پکار رہے ہیں، لیکن کبھی جواب ہی نہیں آتا، یک طرفہ کاروبار ہو رہا ہے، یہ احمقانہ خیال بعض اوقات دل میں پیدا ہو جاتا ہے۔ مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس خیال کا جواب دے رہے ہیں کہ ع

گفت اے اللہ تو لبیک ما است

یعنی تجھے ہمارا نام لینے کی جو توفیق ہو رہی ہے، یہی ہماری طرف سے جواب ہے، جب تم نے ایک مرتبہ ہمارا ذکر کیا، اس کے بعد دوبارہ تمہیں ہمارا نام لینے کی توفیق ہوگئی تو یہ خود ہماری طرف سے جواب اور لبیک ہے، اگر یہ جواب نہ ہوتا تو پھر دوبارہ تمہیں ہماری بارگاہ میں آنے کی توفیق ہی نہ ہوتی، تیرا ''اللہ'' کہنا ہی ہماری طرف سے ''لبیک'' ہے، اور تمہارے پہلے ذکر کی قبولیت کی علامت ہے۔

ایک نیک عمل کے بعد دوسرے نیک عمل کی توفیق

اسی لئے حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب ایک نیک عمل کے بعد دوبارہ اسی نیک عمل کی توفیق ہو جائے تو سمجھ لو کہ پہلا عمل قبول ہوگیا، اگر پہلا عمل قبول نہ ہوتا دوسری بار عمل کی توفیق نہ ملتی۔ مثلاً ظہر کی نماز آپ نے پڑھی، اور پھر عصر کی نماز پڑھنے کی توفیق ہوگئی تو سمجھ لو کہ ظہر کی نماز قبول ہوگئی، اگر ظہر کی نماز قبول نہ ہوتی تو عصر کی نماز پڑھنے کی توفیق نہ ملتی۔ گذشتہ کل آپ نے روزہ رکھا تھا، آج پھر رکھ لیا تو سمجھ لو کہ گذشتہ کل کا روزہ قبول ہوگیا، اگر وہ روزہ قبول نہ ہوتا تو دوبارہ روزہ رکھنے کی توفیق نہ ملتی۔

بہر حال! انسان عمل کرتا رہے، عمل کرنا نہ چھوڑے، اور عمل کر کے اس بات پر خوش ہو کہ اللہ تعالیٰ نے نیک عمل کی توفیق عطا فرمائی، اور جب توفیق عطا فرمائی ہے تو انشاء اللہ نوازنے کا ارادہ بھی فرمایا ہے، بس اس سے آگے مت بڑھنا، اور یہ مت سوچنا کہ مجھ سے یہ بہت بڑا عمل ہوگیا، میں نے بڑا تیر مار لیا، اور اب میں جنت کا مستحق ہوگیا ہوں، اس لئے کہ یہ سوچنا ''رؤیتِ عمل'' اور ''خود پسندی'' ہے، اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو اس سے محفوظ رکھے، آمین۔

بہر حال! نیک عمل کا ایک نقد فائدہ تو یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ سے ''رجا'' اور ''اُمید'' بندھ جاتی ہے۔

نیک عمل کا دوسرا نقد فائدہ

نیک عمل کا دوسرا نقد فائدہ ''تعلق مع اللہ'' کا پیدا ہونا ہے، تم جو بھی نیک عمل کرو گے، وہ نیک عمل اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق میں اضافہ کرے گا، اور اللہ تعالیٰ کی محبت بڑھائے گا، اور تمام کامیابیوں کی جڑ اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق کا مضبوط ہونا ہے۔ مثلاً آپ نے فجر کی نماز پڑھی، اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق قائم ہوگیا، پھر ظہر کی نماز پڑھی تو اب تعلق میں اضافہ ہوگیا، پھر عصر کی نماز پڑھی، پھر مغرب اور عشاء پڑھی، تو ہر مرتبہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق میں اضافہ ہو رہا ہے۔ انسانوں کا معاملہ تو یہ ہے کہ اگر ایک انسان دوسرے انسان سے ملاقات کرے تو ایک حد تک تو ملاقات کرنے سے محبت بڑھتی ہے، اور تعلق میں اضافہ ہوتا ہے، لیکن ایک حد ایسی آجاتی ہے کہ انسان زیادہ ملاقات کرنے سے زچ ہو جاتا ہے، اور یہ سوچتا ہے کہ یہ شخص تو ہر وقت سر پر کھڑا رہتا ہے، آخر کار اس کو جھڑک دے گا کہ تو نے تو مجھے پریشان کر رکھا ہے۔ لہٰذا زیادہ ملنے سے بعض اوقات ملال پیدا ہو جاتا ہے، اور اُکتاہٹ ہو جاتی ہے، اور آدمی زچ ہو جاتا ہے۔

اسی لئے حضورِ اقدس ﷺ نے فرمایا:

((زُرْ غِبًّا تَزْدَدْ حُبًّا)) (۱)

''وقفے سے ملاقات کرو تو محبت میں اضافہ ہوگا''

تم ہی اُکتا جاؤ گے

لیکن اللہ جل شانہ کا معاملہ یہ ہے کہ جتنی مرتبہ ملاقات کرو گے، اتنا ہی تعلق میں اضافہ ہوگا، ایک حدیث میں حضورِ اقدس ﷺ نے فرمایا:

((اِنَّ اللّٰهَ لَا يَمَلُّ حَتّٰى تَمَلُّوْا)) (۲)

---

(۱) المعجم الكبير للطبراني (۲۶/۴)، مختار الأحاديث النبويه، ص: ۹۷

(۲) صحيح البخاري، كتاب الايمان، باب أحب الدين الى الله عزوجلّ......الخ، رقم: ۴۱، صحيح مسلم، كتاب صلاة المسافرين وقصرها، رقم: ۱۳۰۸، سنن النسائي، كتاب القبلة، رقم: ۷۵۴، سنن أبي داؤد، كتاب الصلاة، رقم: ۱۱۶۱، سنن ابن ماجه، كتاب الزهد، رقم: ۴۲۲۸، مسند أحمد، رقم: ۲۳۱۱۱

''اللہ تعالیٰ تمہاری بار بار ملاقات کرنے سے نہیں اُکتاتے، حتیٰ کہ تم خود ہی اُکتا جاؤ''

لہٰذا جتنی عبادت چاہو کرو، جتنا چاہو اللہ تعالیٰ سے تعلق بڑھاؤ، وہ تعلق بڑھتا چلا جائے گا، اس میں ملال پیدا نہیں ہوگا، لہٰذا ہر نیک عمل اللہ تعالیٰ سے تعلق میں اضافہ کا سبب ہے، اور جتنا اللہ تعالیٰ سے تعلق بڑھتا جائے گا، اتنا ہی سرور اور کیف حاصل ہوگا، اتنا ہی سکون حاصل ہوگا، اور اتنا ہی گناہوں سے بچنے کی قوت پیدا ہوگی، اتنی ہی شیطان کے حملوں سے حفاظت ہوگی۔ نفس و شیطان اس وقت حملہ آور ہوتے ہیں، جب اللہ تعالیٰ سے تعلق میں کمی ہوتی ہے، ایسی صورت میں کبھی نفس بہکا دیتا ہے، اور کبھی شیطان بہکا دیتا ہے، لیکن جب اللہ تعالیٰ سے تعلق مضبوط ہوگیا تو اب شیطان کمزور ہو جائے گا، اور وہ حملہ آور نہیں ہوگا۔ لہٰذا ہر نیک عمل کا نقد فائدہ یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق میں اضافہ کرتا ہے، دو نقد فائدے تو یہ ہوئے۔

نیک عمل کا تیسرا نقد فائدہ

تیسرے نقد فائدے کا حضرت والا نے یہاں ذکر نہیں فرمایا، لیکن دوسری جگہوں پر اس کا ذکر آیا ہے، اور خود قرآن کریم نے اس فائدے کو ذکر کیا ہے، وہ یہ کہ نیک عمل انسان کے قلب کو اطمینان، سکون اور طمانیت عطا کرتا ہے۔

((اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ)) (۱)

''اللہ ہی کے ذکر سے دلوں کو اطمینان حاصل ہوتا ہے''

یہ اطمینان اور سکون ایسی متاع ہے کہ لاکھوں، کروڑوں خرچ کرنے سے بھی حاصل نہیں ہوتی، کہیں بازار میں یہ نہیں ملتی۔ البتہ نیک اعمال کی یہ خاصیت ہے کہ وہ انسان کے قلب کو سکون و طمانیت عطا کرتے ہیں، اور یہ طمانیت وہ دولت ہے کہ شاید دنیا میں اس کے برابر کوئی دولت نہ ہو۔ ایک آدمی کے پاس مال و دولت ہے، کوٹھی ہے، بنگلے ہیں، نوکر چاکر ہیں، لیکن دل میں سکون و طمانیت نہیں تو اس کے لئے یہ سب دولتیں بیکار ہیں۔ لیکن ایک دوسرا شخص ہے اس کے پاس مٹی کا گھر ہے، جھونپڑی ہے، لیکن دل میں اطمینان اور سکون ہے، تو یہ دوسرا شخص پہلے والے شخص سے ہزار درجہ بہتر ہے، بہر حال اللہ تعالیٰ نے اپنے ذکر میں اپنی عبادت میں سکون کی خاصیت رکھی ہے، اور یہ نیک عمل کا نقد فائدہ ہے، جو اس دنیا میں حاصل ہوتا ہے۔

(۱) الرعد: ۲۸

حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ کا مقولہ

چنانچہ حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:
''اگر دنیا کے بادشاہوں کو پتہ لگ جائے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں کیسی لذت اور سکون والی زندگی عطا فرما رکھی ہے تو وہ بادشاہ تلواریں سونت کر ہم سے یہ دولت چھیننے کے لئے آجائیں کہ یہ ہمیں دو، لیکن ان بیوقوفوں کو یہ پتہ نہیں کہ یہ دولت اس طرح تلواروں کے ذریعہ حاصل نہیں ہوتی، بلکہ یہ دولت تو اللہ جل شانہ کی بارگاہ سے حاصل ہوتی ہے، اس کے ساتھ تعلق قائم کرنے سے حاصل ہوتی ہے''
بہر حال! یہ سکون کا حاصل ہونا نیک عمل کا نقد فائدہ ہے، جو دنیا ہی میں حاصل ہو جاتا ہے۔

نیک عمل کا چوتھا فائدہ

نیک عمل کا چوتھا فائدہ یہ ہے کہ ایک نیک عمل دوسرے نیک عمل کا ذریعہ بنتا ہے، جب تم ایک نیک عمل کرو گے تو وہ تمہیں دوسرے نیک عمل کی طرف کھینچے گا۔ گناہ کی خاصیت یہ ہے کہ ایک گناہ دوسرے گناہ کی طرف کھینچتا ہے، اسی طرح جب تم نے ایک نیک عمل کیا تو تمہیں دوسرے نیک عمل کی توفیق ہو جائے گی۔

بہر حال! نیک عمل کے یہ چار نقد فائدے ہیں، جو انسان کو دنیا ہی میں مل جاتے ہیں۔

گناہوں کا پہلا نقصان

آگے فرمایا کہ اسی طرح اعمالِ سیئہ کا ایک ثمرہ اُدھار ہے، اور ایک نقد۔ یعنی گناہوں کا ایک نتیجہ تو اُدھار ہے، جو آخرت میں ملے گا، وہ ہے عذابِ جہنم، اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو اس سے محفوظ رکھے، اور گناہوں کا نقد نتیجہ وحشت، ظلمت اور بے چینی ہے، جو گناہوں کو لازم ہے، یعنی گناہوں کے اندر بے چینی اور ظلمت اللہ تعالیٰ نے رکھ دی ہے، کسی کا مذاق ہی بگڑ جائے، اور ذائقہ ہی خراب ہو جائے تو اس کو پتہ نہیں چلتا کہ یہ ظلمت ہے اور بے چینی ہے، بلکہ وہ اس کو مزیدار سمجھتا ہے، لیکن حقیقت میں وہ ظلمت اور بے چینی ہے، اور اس کا نتیجہ ظاہر ہو کر رہتا ہے۔

گناہوں کی لذت کی مثال

حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ نے گناہوں کی لذت کی ایک بہترین مثال بیان فرمائی کہ گناہوں کی لذت

ایسی ہے جیسے کسی کو خارش کی بیماری ہو تو اس کو کھجانے میں مزہ آئے گا، یہاں تک کہ لوگوں نے کہہ دیا کہ دنیا میں دو ہی چیزوں میں مزہ ہے "یا کھاج میں یا راج میں"

یعنی یا تو کھجانے میں مزہ آتا ہے، یا راج اور حکومت کرنے میں مزہ آتا ہے، کھجانے میں اتنی لذت ہے کہ اس کو حکومت کے ساتھ ملا کر ذکر کیا، اور واقعۃً جب انسان کو خارش ہو تو کھجانے میں اتنا مزہ آتا ہے کہ اس کی کوئی حد نہیں، اس سے بچنا مشکل ہوتا ہے، لیکن جب کھجانا چھوڑا تو اب اس جگہ پر مرچیں لگنی شروع ہو گئیں، اور وہ بیماری اور بڑھ گئی، پھر دوبارہ کھجایا تو پھر مزہ آیا، لیکن بیماری اور بڑھ گئی، اس طرح کھجانے کے نتیجے میں بیماری بڑھتی چلی جاتی ہے۔ یہی معاملہ گناہوں کا ہے کہ گناہ کرنے سے لذت آتی تو ہے لیکن وہ لذت بالآخر ٹیسیں، ظلمت اور بے چینی چھوڑ جاتی ہے۔

جب فطرت ہی بگڑ جائے تو!

ہاں! اگر کسی کی فطرت ہی بگڑ جائے تو پھر اس کو گناہ کے بعد بے چینی اور ظلمت محسوس نہیں ہوتی، جیسے اگر کسی کو بدبو کا احساس ہی ختم ہو جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کو بدبو کے اندر کھڑا ہونے میں مزہ آتا ہے، میں نے ایک مرتبہ دیکھا کہ ایک جگہ پر کوڑے کا ڈھیر تھا، اور اس کوڑے میں سے شدید بدبو اٹھ رہی تھی، کہ قریب سے گزرنا مشکل تھا۔ لیکن ایک آدمی جو پاگل تھا، وہ اس کوڑے کے ڈھیر کے درمیان میں کھڑا ہے، اور ایک کتا جو ایک بوٹی اُٹھا کر لے جا رہا تھا، اس شخص نے اس کتے سے وہ بوٹی چھین لی، اور اس پر فاتحانہ خوشی کا اظہار کر رہا تھا کہ میں کامیاب ہو گیا، اور فاتحانہ انداز میں قہقہے لگا رہا تھا، اس شخص کو کوئی بدبو نہیں آرہی تھی، کیوں؟ اس لئے کہ اس کی حس مٹ چکی تھی، اور اس کی حس خراب ہو گئی تھی، اس نتیجے میں یہ مردار اور یہ گندگی اس کو دولت معلوم ہو رہی تھی۔

جب تقویٰ کی حس مٹ جائے

اسی طرح جب انسان کے اندر سے ایمان کی اور تقویٰ کی حس مٹ جاتی ہے تو مذاق خراب ہو جاتا ہے، اور پھر آدمی گناہوں کو بھی لذت کی چیز سمجھتا ہے، اور پھر اس کو گناہوں کے اندر نہ ظلمت محسوس ہوتی ہے اور نہ وحشت محسوس ہوتی ہے، اور اللہ بچائے، یہ بڑی خطرناک بات ہے، اس لئے کہ حقیقت یہ ہے کہ گناہوں کے اندر ظلمت اور بے چینی ہے، اور وحشت ہے، لہٰذا گناہوں کا نقد نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ گناہ کرنے کے بعد سکونِ قلب حاصل نہیں ہوتا۔ چنانچہ ان لوگوں کو دیکھو جن کو دنیا کے اندر دولت، عزت، شہرت اور آرام کے اسباب میسر ہیں، اس کے باوجود وہ خودکشی کر رہے ہیں، کیوں خودکشی کر رہے ہیں؟ اگر پیسے نہ ہوتے اور پھر خودکشی کرتے تو ایک بات تھی، سب کچھ ہونے کے

باوجود جو خودکشی کر رہے ہیں، وہ اس لئے کہ دل میں سکون میسر نہیں۔

گناہوں کا دوسرا نقد نقصان

گناہوں کا دوسرا نقد نقصان یہ ہے کہ یہ انسان کی عقل خراب کر دیتا ہے، گناہ انسان کے سامنے اچھائی کو برائی، اور برائی کو اچھائی بنا کر پیش کرتا ہے، یہ بھی ظلمت ہی کا ایک حصہ ہے، اور یہ بھی گناہ کا نقد نقصان ہے، اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے ہمیں گناہوں سے بھی اور گناہوں کے نقصانات سے بھی محفوظ فرمائے، آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ.

عمل کے بعد مدد آئے گی ☆

بعد از خطبہ مسنونہ!

عَنْ أَبِیْ ذَرٍ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ((یَقُوْلُ اللّٰہُ تَعَالٰی مَنْ عَمِلَ حَسَنَۃً فَلَہٗ عَشْرُ أَمْثَالِھَا، وَمَنْ عَمِلَ سَیِّئَۃً فَجَزَآءُہٗ مِثْلُھَا أَوْ أَغْفِرُہٗ، وَمَنْ عَمِلَ قُرَابَ الْأَرْضِ خَطِیْئَۃً ثُمَّ لَقِیَنِیْ لَا یُشْرِکُ بِیْ شَیْئًا جَعَلْتُ لَہٗ مِثْلَھَا مَغْفِرَۃً، وَمَنِ اقْتَرَبَ إِلَیَّ شِبْرًا اقْتَرَبْتُ إِلَیْہِ ذِرَاعًا، وَمَنِ اقْتَرَبَ إِلَیَّ ذِرَاعًا اقْتَرَبْتُ إِلَیْہِ بَاعًا، وَمَنْ أَتَانِیْ یَمْشِیْ أَتَیْتُہٗ ھَرْوَلَۃً)) (۱)

نیکی اور بدی کی جزا

یہ حدیث حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں یہ درویش صفت صحابی تھے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ یہ حدیث قدسی ہے، ''حدیث قدسی'' اس کو کہتے ہیں کہ جس میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کی کوئی بات نقل فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ نے یوں فرمایا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

''جو شخص اس دنیا میں کوئی نیک عمل کرتا ہے تو میں اس کو اس نیک عمل پر دس گنا اجر و ثواب دیتا ہوں، اور جو شخص برائی یا گناہ کرتا ہے تو اس کی سزا اتنی ہی دیتا ہوں جتنا اس نے ناجائز کام کیا، گناہ کی سزا دوگنی بھی نہیں کرتا، بلکہ گناہ کے برابر سزا دیتا ہوں یا معاف کر دیتا ہوں''

ہر نیکی کا ثواب دس گنا

اللہ تعالیٰ فرما رہے ہیں کہ تم کوئی بھی نیکی کرو تو اس کا دس گنا ثواب میرے پاس تیار ہے، اور

☆ اصلاحی خطبات (۱۱/۱۲۱ تا ۱۴۵) بعد از نماز عصر، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی

(۱) کتاب الزھد، عبداللہ بن مبارک، (۱/۳۶۶)، شعب الایمان للبیھقی، رقم:۱۰۴۳ (۱۷/۲)، مسند أحمد، رقم: ۲۰۳۹۸

نیکی کے اس ثواب کا وعدہ کسی مخلوق کی طرف سے نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے وعدہ ہے، اور اس ثواب کو کسی خاص نیکی کے ساتھ مخصوص نہیں فرمایا، بلکہ یہ فرمایا کہ وہ کسی بھی قسم کی نیکی ہو، چاہے وہ عبادت فرض ہو یا نفل ہو، یا ایک مرتبہ ''سبحان اللہ'' کہنا ہو، یا ایک مرتبہ ''الحمد للہ'' کہنا ہو، ان سب کا ثواب دس گنا دینا لازم ہے۔

رمضان اور شوال کے روزوں کا ثواب

یہ شوال کا مہینہ ہے اور اس مہینے میں ''شش عید'' کے روزے رکھے جاتے ہیں۔

حدیث شریف میں نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص رمضان کے بعد ماہِ شوال میں چھ روزے رکھ لے تو اللہ تعالیٰ اس کو سارے سال روزے رکھنے کا ثواب عطا فرماتے ہیں۔ (۱)

یہ سارے سال روزے رکھنے کا ثواب اسی اصول پر مبنی ہے کہ ہر نیکی کا ثواب دس گنا دیا جائے گا، لہٰذا رمضان المبارک کے تیس روزے ہوئے، چاہے رمضان انتیس دن کا ہوا ہو، لیکن اللہ تعالیٰ کے یہاں تیس ہی شمار ہوتے ہیں، کیونکہ حدیث شریف میں نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((شَهْرَا عِيْدٍ لَا يَنْقُصَانِ رَمَضَانُ وَ ذُو الْحَجَّةِ)) (۲)

یعنی عید کے دونوں مہینے کم نہیں ہوتے، اگر انتیس ہوں تب بھی تیس ہی شمار ہوتے ہیں۔

بہر حال! رمضان کے تیس روزے ہوئے اور چھ روزے شوال کے ہوئے، اس طرح کل چھتیس روزے ہو گئے، چھتیس کو دس سے ضرب دیا جائے تو تین سو ساٹھ ہو جائیں گے، اور سال کے تین سو ساٹھ دن ہوتے ہیں، اس طرح ان چھتیس روزوں کے بدلے اللہ تعالیٰ سارے سال روزے رکھنے کا ثواب عطا فرما دیتے ہیں۔ ہر نیکی کا یہی حال ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر نیکی کا دس گنا ثواب عطا فرماتے ہیں۔

---

(۱) صحيح مسلم، كتاب الصيام، باب استحباب صوم ستة أيام من شوال اتباعا لرمضان، رقم: ۱۹۸٤، سنن الترمذي، كتاب الصوم عن رسول الله، باب ما جاء في صيام ستة أيام من شوال، رقم: ٦۹۰، سنن أبي داؤد، كتاب الصوم، باب في صوم ستة أيام من شوال، رقم: ۲۰۷۸، سنن ابن ماجه، كتاب الصيام، باب صيام ستة أيام من شوال، رقم: ۱۷۰٥، مسند أحمد، رقم: ۱۳۷۸۳

(۲) صحيح البخاري، كتاب الصوم، باب شهرا عيد لا ينقصان، رقم: ۱۷۷۹، صحيح مسلم، كتاب الصيام، باب بيان معنى قوله شهرا عيد لا ينقصان، رقم: ۱۸۲۲، سنن الترمذي، كتاب الصوم عن رسول الله، باب ما جاء شهرا عيد لا ينقصان، رقم: ٦۲۸، سنن أبي داؤد، كتاب الصوم، باب الشهر يكون تسعا وعشرين، رقم: ۱۹۸۷، سنن ابن ماجه، كتاب الصيام، باب ما جاء في شهري العيد، رقم: ۱٦٤۹

برائی کا بدلہ ایک گنا

برائی کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں اتنی ہی سزا دوں گا جتنی اس نے برائی کی ہے (اس کو بڑھایا نہیں جاتا) یا معاف ہی کر دوں گا۔ یعنی اگر بندہ نے توبہ کر لی، استغفار کر لیا، اور اللہ تعالیٰ کے حضور ندامت کا اظہار کر لیا کہ یا اللہ! مجھ سے غلطی ہوگئی، مجھے معاف فرما، تو اللہ تعالیٰ اس کو معاف فرمادے گا۔ اس طرح اس برائی کی ایک گنا سزا بھی ختم ہو جائے گی۔

کراماً کاتبین میں ایک امیر دوسرا مامور

میں نے اپنے شیخ حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحب قدس اللہ سرہ سے ایک حدیث سنی، البتہ کسی کتاب میں یہ حدیث نہیں دیکھی، کہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کے ساتھ دو فرشتے مقرر فرمائے ہیں، ایک نیکیاں لکھتا ہے اور دوسرا گناہ لکھتا ہے، حضرت رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں فرشتوں میں یہ انتظام فرمایا ہے کہ نیکی لکھنے والے فرشتے کو بدی لکھنے والے فرشتے کا امیر مقرر فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی سنت اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم یہ ہے کہ جب دو آدمی کسی کام پر جائیں تو اپنے میں سے ایک کو امیر بنالیں، اس لئے ایک فرشتے کو دوسرے کا امیر بنا دیا، اور جب انسان کوئی نیکی کرتا ہے تو نیکی لکھنے والا فرشتہ فوراً اس نیکی کو اس کے نامۂ اعمال میں لکھ لیتا ہے، لیکن جب بندہ کوئی گناہ کرتا ہے تو بدی لکھنے والا فرشتہ فوراً اس بدی کو نہیں لکھتا، بلکہ وہ اپنے امیر سے یعنی نیکی لکھنے والے فرشتے سے پوچھتا ہے کہ اس بندے نے یہ بدی کی ہے، اس کو لکھوں یا نہ لکھوں؟ وہ فرشتہ کہتا ہے کہ ذرا ٹھہر جاؤ، ہوسکتا ہے کہ یہ توبہ کر لے، استغفار کر لے، اگر اس نے توبہ کر لی تو پھر لکھنے کی ضرورت ہی نہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد پھر پوچھتا ہے کہ اب لکھوں؟ وہ فرشتہ کہتا ہے کہ ذرا ٹھہر جاؤ، شاید یہ توبہ کر لے۔ پھر جب تیسری مرتبہ وہ فرشتہ پوچھتا ہے اور بندہ توبہ نہیں کرتا تو اس وقت نیکی والا فرشتہ کہتا ہے کہ اب توبہ کی اُمید نہیں ہے، اب لکھ لو، چنانچہ وہ بدی والا فرشتہ اس گناہ کو اس کے نامۂ اعمال میں لکھ لیتا ہے۔

اللہ تعالیٰ عذاب دینا نہیں چاہتے

اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ یہ نہیں چاہتے کہ کسی بندے کو عذاب دیں، قرآن کریم میں عجیب انداز سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿مَا يَفۡعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمۡ اِنۡ شَكَرۡتُمۡ وَاٰمَنۡتُمۡ﴾ (۱)

---

(۱) النسآء: ۱۴۷

''یعنی اگر ایمان لے آؤ اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو تو اللہ تعالیٰ تمہیں عذاب دے کر کیا کرے گا؟''

لہٰذا اللہ تعالیٰ تو عذاب دینا نہیں چاہتے، لیکن کوئی بندہ نافرمانی پر کمر ہی باندھ لے اور اللہ تعالیٰ کو ناراض کرنے پر تُل جائے تو اس کے بعد اس کو عذاب دیا جاتا ہے۔ اور پھر آخر وقت تک اللہ تعالیٰ نے توبہ کا دروازہ کھول رکھا ہے کہ موت سے پہلے جب بھی توبہ کرلو گے تو اللہ تعالیٰ معاف فرمادیں گے۔

بندوں کو معاف کرنے کا قاعدہ

بہرحال! فرمایا کہ جو کوئی نیکی کرے گا اس کو دس گنا اجر وثواب دیا جائے گا اور جو برائی کرے گا اس کو صرف ایک گنا سزا دی جائے گی یا میں اس کو بھی معاف کردوں گا۔ پھر اس حدیثِ قدسی میں معاف کرنے کا قاعدہ بیان فرمایا:

((وَمَنْ عَمِلَ قُرَابَ الْأَرْضِ خَطِيئَةً ثُمَّ لَقِيَنِي لَا يُشْرِكُ بِي شَيْئًا جَعَلْتُ لَهُ مِثْلَهَا مَغْفِرَةً))

''یعنی جو شخص ساری زمین بھر کر گناہ کرلے اور پھر میرے پاس آجائے بشرطیکہ اس نے میرے ساتھ شرک نہ کیا ہو تو میں اس کو اتنی ہی مغفرت عطا کردوں گا جتنے اس کے گناہ تھے''

یعنی ایک شخص گناہوں سے ساری زمین بھردے اور پھر میرے سامنے ندامت اور شرمندگی کے ساتھ توبہ کرنے اور استغفار کرنے کے لئے آجائے تو میں اس کو معاف کردوں گا۔ اس کے ذریعہ معاف کرنے کا قاعدہ بتادیا کہ معافی کا یہ دروازہ ہم نے کھول رکھا ہے اور مرتے دم تک جب تک نزع کی حالت طاری نہیں ہوتی، اس وقت تک یہ دروازہ کھلا رہے گا، آجاؤ آجاؤ! کتنے بھی دور چلے گئے ہو، تب بھی ہمارے پاس آجاؤ،، ایک مرتبہ سچے دل سے اپنے گناہوں سے تائب ہوجاؤ، توبہ کرلو، تو ہم تمہیں معاف کردیں گے، اور صرف یہ نہیں کہ ان گناہوں پر سزا نہیں ملے گی بلکہ نامۂ اعمال سے مٹادیئے جائیں گے گویا کہ وہ گناہ کیے ہی نہیں تھے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی رحمت دیکھئے۔

اسی لئے ایک حدیثِ قدسی میں حضورِ اقدس ﷺ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

((سَبَقَتْ رَحْمَتِي غَضَبِي)) (۱)

''میری رحمت میرے غضب پر سبقت لے گئی''

پھر اسی کو اللہ تعالیٰ نے قانون بنادیا۔

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب التوحید، باب قول اللّٰہ تعالیٰ بَلْ هُوَ قُرْآنٌ (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر دیکھئے)

گناہوں سے توبہ واستغفار کریں

اور یہ قانون اس لئے بنادیا کہ ہم اسی قانون سے فائدہ اُٹھالیں اور توبہ واستغفار کرلیں ۔توبہ و استغفار کی اہمیت کو سمجھیں!

حدیث شریف میں حضور اقدس ﷺ نے فرمایا:

((اِنِّیْ لَأَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ كُلَّ يَوْمٍ سَبْعِيْنَ مَرَّةً))

''میں اللہ تعالیٰ سے روزانہ ستر مرتبہ استغفار کرتا ہوں''(۱)

حالانکہ آپ ﷺ گناہ سے معصوم ہیں، آپ ﷺ سے گناہ سرزد ہو ہی نہیں سکتا، پھر بھی استغفار فرمارہے ہیں، کیوں؟ تاکہ ہمیں توبہ اور استغفار کا سبق سکھائیں کہ جب میں استغفار کررہا ہوں تو تم بھی استغفار کرو، صبح وشام کثرت سے استغفار کرو۔

اللہ تعالیٰ کی رحمت

اس حدیث قدسی کا اگلہ جملہ یہ ارشاد فرمایا:

((مَنِ اقْتَرَبَ اِلَیَّ شِبْرًا اِقْتَرَبْتُ اِلَيْهِ ذِرَاعًا، وَمَنِ اقْتَرَبَ اِلَیَّ ذِرَاعًا اِقْتَرَبْتُ اِلَيْهِ بَاعًا، وَمَنْ اَتَانِیْ يَمْشِیْ اَتَيْتُهُ هَرْوَلَةً))

''یعنی جو بندہ میرے قریب ایک بالشت آتا ہے تو میں ایک ہاتھ اس کے قریب چلا جاتا ہوں اور جو بندہ ایک ہاتھ میرے قریب آتا ہے تو میں دو ہاتھ اس کے قریب چلا جاتا ہوں، اور جو بندہ میری طرف پیدل چل کر آتا ہے تو میں اس کی طرف دوڑ کر آتا ہوں''

اس سے اللہ تعالیٰ کی رحمت کا اندازہ لگائیں! گویا کہ فرمایا کہ تم میرے جتنا قریب آنے کی کوشش کروگے تو میں اس سے کئی گنا زیادہ تمہارے قریب آجاؤں گا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) مَّجِيْدٌ فِیْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ، رقم: ۶۹۹۸ ، صحيح مسلم، كتاب التوبة، باب في رحمة الله ...... الخ، رقم: ۴۹۴۰، مسند أحمد، مسند أبي هريرة، رقم: ۶۹۹۸

(۱) صحيح البخاری، كتاب الدعوات، باب استغفار النبی فی اليوم والليلة، رقم: ۵۸۳۲، صحيح مسلم، كتاب الذكر والدعاء والتوبة والأستغفار، باب استحباب الاستغفار والاستكثار منه، رقم: ۴۸۷۰، سنن الترمذی، كتاب تفسير القرآن عن رسول الله، باب ومن سورة محمد، رقم: ۳۱۸۲، سنن أبی داؤد، كتاب الصلاة، باب فی الاستغفار، رقم: ۱۲۹۴

قربِ خداوندی کی مثال

اس حدیث میں فرمایا کہ جو بندہ میری طرف چل کر آتا ہے میں اس کی طرف دوڑ کر آتا ہوں۔ اس بات کو حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے بڑی پیاری مثال کے ذریعہ سمجھایا ہے، فرمایا کہ اس کی مثال یوں سمجھو کہ ایک چھوٹا بچہ ہے جس کو چلنا نہیں آتا، باپ یہ چاہتا ہے کہ میں اس کو چلنا سکھاؤں، تو باپ دور کھڑے ہو کر اس بیٹے کو اپنی طرف بلاتا ہے کہ بیٹا میرے پاس آؤ، اب اگر وہ بچہ دور ہی کھڑا رہے گا اور ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھائے گا تو باپ اس سے دور ہی رہے گا، لیکن اگر وہ بچہ ایک قدم بڑھاتا ہے اور چلنا نہ جاننے کی وجہ سے جب وہ گرنے لگتا ہے تو باپ اس کو گرنے نہیں دیتا بلکہ باپ دوڑ کر اس کے قریب جاتا ہے اور اس کو گود میں اُٹھا لیتا ہے تاکہ وہ گرنے نہ پائے۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اسی طرح جب کوئی بندہ اللہ تعالیٰ کی طرف قدم بڑھاتا ہے اور گرنے لگتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم اس کو گرنے نہیں دیں گے، بلکہ آگے بڑھ کر اس کو اُٹھا لیں گے، لہٰذا یہ اللہ کے راستے میں چلنے والوں کے لئے بشارت ہے۔

نوازش کا ایک بہانہ

یہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک بہانہ ہے، اللہ تعالیٰ تو یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ یہ بندہ ہماری طرف چلنا چاہ رہا ہے یا نہیں؟ یہ بندہ اپنے حصے کا کام کر رہا ہے یا نہیں؟ اگر وہ بندہ اپنے حصے کا اتنا کام کر رہا ہے جو اس کی قدرت اور استطاعت میں ہے تو پھر اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے اس کی تکمیل خود فرما دیتے ہیں اور پھر اللہ کے راستے میں چلتے ہوئے بندہ لڑکھڑا جائے اور گر جائے تو اس کی بھی پرواہ نہ کرے۔

ایک بہت بڑا دھوکہ

لہٰذا جو بات اس حدیث میں دیکھنے کی ہے، وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ کونسا بندہ میری طرف بڑھتا ہے اور میری طرف آنے کی کوشش کرتا ہے، لیکن اگر کوئی بندہ کوشش ہی نہ کرے تو اس کے لئے پھر کوئی وعدہ نہیں ہے۔

قوم اس غفلت میں اور اس انتظار میں پڑی ہوئی ہے کہ کوئی لطیفۂ غیبی سامنے آئے اور وہ ہمیں زبردستی نیکی اور تقویٰ کے مقام تک پہنچا دے، چنانچہ بعض لوگ جب کسی شیخ کے ہاتھ پر بیعت کر لیتے ہیں اور اس سے اصلاحی تعلق قائم کر لیتے ہیں تو وہ یوں سمجھتے ہیں کہ اب ہمیں کچھ کرنا نہیں

پڑے گا، بلکہ اس شیخ کے پاس ایسی غیبی طاقت ہے جس کے ذریعہ وہ ہمیں اُٹھا کر جنت میں پہنچا دے گا۔

عمل خود کرنا پڑے گا

یاد رکھئے! یہ بہت بڑا دھوکہ ہے، کوئی بھی کسی کو اُٹھا کر جنت میں نہیں پہنچائے گا، بلکہ ہر انسان کو خود ہی چل کر جنت میں جانا ہوگا اور جنت میں لے جانے والے اعمال خود ہی کرنے پڑیں گے، البتہ اللہ تعالیٰ نے اتنا وعدہ فرمالیا کہ اگر تم تھوڑا سا چلو گے تو میں تمہیں اس سے کہیں زیادہ اپنا قرب عطا کروں گا۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا﴾ (۱)

''جو لوگ ہمارے راستے میں کوشش کرتے ہیں تو ہم ان کے ہاتھ پکڑ کر اپنے راستے پر لے جاتے ہیں''

اس لئے یہ سمجھنا کہ کچھ کیے بغیر بیٹھے بیٹھے کام بن جائے گا، یا کسی کے ہاتھ پر ہاتھ رکھنے سے کام بن جائے گا، یا یہ سمجھنا کہ صرف تمناؤں اور آرزوؤں سے جنت مل جائے گی، یہ بہت بڑا دھوکہ ہے۔ لہٰذا تم عمل کرو، چاہے تمہارا وہ عمل نامکمل اور ادھورا ہی سہی، ناقص ہی سہی، لیکن عمل کرو اور اس عمل کو جاری رکھو، پھر اللہ تعالیٰ کسی نہ کسی وقت تمہیں کھینچ لیں گے۔ اور اس ناقص عمل کی بے قدری مت کرو، اگر ناقص عمل کی بھی توفیق ہوگئی ہے تو اس پر بھی اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو، اس لئے کہ ان شاء اللہ یہ ناقص عمل بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے کھینچ لینے کا ذریعہ بن جائے گا۔

طلب اور کوشش شرط ہے

لہٰذا اس حدیث سے یہ سبق ملا کہ ہمت کے بغیر کوئی کام نہیں ہوتا۔ چنانچہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ بعض لوگ اپنے شیخ سے جا کر کہتے ہیں کہ حضرت! کوئی ایسا طریقہ بتا دیجئے جس کے ذریعہ عمل ہو جایا کریں اور گناہ چھوٹ جایا کریں۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یاد رکھئے! ایسا طریقہ کسی شیخ کے پاس نہیں ہے، اگر ایسا ہوتا تو آج دنیا میں کوئی کافر نہ ہوتا، انبیاء علیہم السلام جب دنیا میں تشریف لاتے تھے تو ان کی عین خواہش ہوتی تھی کہ سب لوگ مسلمان ہو جائیں اور سب لوگوں کی اصلاح ہو جائے، تو اگر کوئی ایسا نسخہ ہوتا تو انبیاء علیہم السلام اس نسخے کو ضرور استعمال کرتے اور ایک چھو منتر کرتے یا ایک نظر ڈالتے اور سب لوگ مسلمان ہو جاتے، لیکن ایسا نہیں ہوا۔ بلکہ اگر کسی شخص

(۱) العنکبوت: ۶۹

سے جب تک کچھ نہ کچھ عمل نہ ہو اس وقت تک نبی کی زیارت بھی فائدہ نہیں دیتی، دیکھئے ابوجہل نے اور ابولہب نے بھی حضورِ اقدس ﷺ کی زیارت کی، لیکن چونکہ اندر طلب نہیں تھی، عمل اور عزم نہیں تھا، اس لئے اس زیارت نے بھی فائدہ نہیں دیا۔

معجزہ میں نبی کے عمل کا دخل

اور یہ دیکھئے کہ اللہ تعالیٰ انبیاء علیہم السلام کے ہاتھ پر معجزات ظاہر فرماتے ہیں، یہ معجزات اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتے ہیں، لیکن ہر معجزہ میں یہ نظر آئے گا کہ کچھ نہ کچھ عمل اس نبی سے ضرور کروایا گیا، مثلاً احادیث شریف میں کئی واقعات ایسے آئے ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ معجزہ کے طور پر آپ ﷺ کی برکت سے کھانے میں یا پانی میں برکت ہوگئی۔

غزوۂ احزاب کے موقع پر ایک صحابی حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ کے چہرے پر بھوک کے آثار دیکھے تو وہ گھر گئے اور بیوی سے کہا "میں نے حضورِ اقدس ﷺ کے چہرۂ انور پر بھوک کے آثار دیکھے ہیں، کچھ کھانا ہو تو تیار کرلو"

بیوی نے کہا "تھوڑا کھانا ہے، دو چار آدمیوں کے لئے کافی ہو جائے گا، اس لئے آپ چپکے سے حضورِ اقدس ﷺ کو اور آپ کے ساتھ ایک دو حضرات کو دعوت دیں، مجمع میں سب کے سامنے دعوت نہ دیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ زیادہ افراد آجائیں اور یہ کھانا ناکافی ہو جائے"

چنانچہ خاتون نے کھانے کی ہانڈی پکانے کے لئے چولہے پر رکھ دی، اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ حضورِ اقدس ﷺ کی خدمت میں پہنچے اور چپکے سے عرض کیا "یا رسول اللہ ﷺ! گھر پر آپ کے لئے کچھ کھانا تیار کیا ہے، آپ اور آپ کے ساتھ دو چار حضرات تشریف لے آئیں"

جب آپ نے یہ سنا تو آپ نے پورے لشکر کو دعوت دے دی کہ چلو، جابر کے یہاں دعوت ہے۔

اب حضرت جابر رضی اللہ عنہ پریشان ہوئے کہ کھانا تو صرف دو چار آدمیوں کا ہے اور آپ نے سارے لشکر کو دعوت دے دی، اور بیوی نے کہا تھا کہ چپکے سے دعوت دینا، اب پورا لشکر چلا آرہا ہے۔ جب گھر کے اندر گئے تو بیوی کو بتایا کہ یہ تو پورا لشکر آگیا ہے۔ ان کی بیوی پہلے تو ناراض ہوئیں اور ان کو کہا "بِكَ وَبِكَ" تمہارا ایسا ہو اور ویسا ہو! تم نے چپکے سے حضور ﷺ سے نہیں کہا ہوگا۔

انہوں نے کہا کہ میں نے چپکے سے کہا تھا، لیکن حضورِ اقدس ﷺ نے سب کو دعوت دے دی، وہ خاتون بھی تو آخر صحابیہ تھیں، چنانچہ ان خاتون نے کہا کہ اگر تم نے حضور ﷺ سے یہ کہہ دیا تھا کہ چند آدمیوں کا کھانا ہے، پھر بھی آپ ﷺ نے سارے لشکر کو دعوت دیدی تو پھر مجھے کوئی خوف نہیں،

اس لئے کہ پھر حضور ﷺ ذمہ دار ہیں۔

جب حضور ﷺ تشریف لائے تو آپ نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ جاؤ بیوی سے کہہ دو کہ ہانڈی سے کھانا نکال کر دیتی جائیں اور ہانڈی کو چولہے پر چڑھی رہنے دیں۔ چنانچہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ سارا لشکر کھانے کے لئے بیٹھ گیا اور میں کھانا لا کر ان کو کھلاتا رہا، لیکن وہ ہانڈی ختم ہی نہیں ہوتی تھی، یہاں تک کہ پورے لشکر نے سیر ہو کر کھانا کھالیا۔ یہ صرف تین چار آدمیوں کا کھانا تھا لیکن پورے لشکر کو کافی ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ نے حضورِ اقدس ﷺ کے دستِ مبارک پر یہ معجزہ ظاہر فرمایا۔(۱)

کھانا تم پکاؤ، برکت ہم ڈالیں گے

دیکھنے کی بات یہ ہے کہ یہ معجزہ اس طرح بھی تو ظاہر ہو سکتا تھا کہ کوئی ہانڈی ہی نہ ہوتی، کوئی سالن ہی نہ ہوتا، اور اللہ تعالیٰ غیب سے کھانا بھیج دیتے۔ لیکن اس طرح معجزہ ظاہر نہیں کیا گیا، بلکہ اس طرح ظاہر کیا گیا کہ کھانا تم پکاؤ، اگرچہ وہ تھوڑا ہی ہو، پھر ہم اس تھوڑے کھانے میں برکت ڈال دیں گے اور اس کے اندر اضافہ کر دیں گے۔ اس کے ذریعہ یہ سبق دے دیا کہ اپنی طرف سے کچھ نہ کچھ عمل کرنا ہے، تبھی معجزہ ظاہر ہوگا، تمہارے عمل کے بغیر معجزہ بھی ظاہر نہیں ہوگا۔

پانی میں برکت کا واقعہ

غزوۂ تبوک میں آپ ﷺ تشریف لے جا رہے تھے، پانی کی قلت تھی، لشکر بڑا تھا، پیاس لگی ہوئی تھی اور پانی نہیں مل رہا تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ فلاں مقام پر راستے میں ایک چشمہ آئے گا، جب وہ چشمہ آجائے تو مجھے اطلاع کریں اور میری اجازت کے بعد لشکر اس چشمے سے پانی پی لے۔ چنانچہ راستے میں چشمہ آیا، اس چشمہ میں تھوڑا سا پانی تھا جس کو چند افراد پی سکتے تھے۔ آپ ﷺ نے اپنا دستِ مبارک اس چشمہ کے پانی میں ڈالا اور پھر فرمایا کہ اب لشکر اس پانی کو استعمال کرے، چنانچہ سارا لشکر اس پانی سے سیراب ہو گیا۔(۲)

یہاں بھی اگر اللہ تعالیٰ چاہتے تو ویسے ہی آسمان سے پانی نازل فرما دیتے، یا کوئی اور ایسا طریقہ ہو جاتا جس کے ذریعے سب سیراب ہو جاتے، لیکن ایسا نہیں کیا، بلکہ پہلے یہ حکم دیا کہ چشمہ

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب المغازی، باب غزوة الخندق وهی الأحزاب، رقم: ۳۷۹۰۔ البدایة والنهایة (۹۷/٤)، حیاة الصحابة (۲۵۲/۲تا۲۵۳)

(۲) البدایة والنهایة (۱۰۰/۱)

تلاش کرو اور اس کے ذریعہ تھوڑا سا پانی تم اپنے عمل سے حاصل کرو اور پھر اپنا ہاتھ اس کے اندر داخل کرو، اس کے بعد اس کے اندر ہم برکت ڈالیں گے۔ اس واقعہ کے ذریعہ بھی اللہ تعالیٰ نے یہ سبق دیدیا کہ اپنا عمل کرنا شرط ہے، جب تک آدمی اپنے ہاتھ پاؤں نہیں ہلائے گا اس وقت تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی مدد کا وعدہ نہیں۔

ید بیضاء کا معجزہ

انبیاء علیہم السلام کے تمام معجزات میں یہ نظر آتا ہے کہ ہر نبی سے تھوڑا عمل ضرور کرایا گیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ''ید بیضاء'' کا معجزہ دیا گیا، ان سے فرمایا کہ اپنا ہاتھ بغل میں داخل کر کے پھر نکالو، جب نکالا تو وہ ہاتھ چمکنے لگا۔ یہ بھی تو ہوسکتا تھا کہ بغل میں ہاتھ داخل کیے بغیر چمکنے لگتا، لیکن فرمایا کہ تھوڑا سا عمل تم کرو کہ اس ہاتھ کو بغل میں لے جاؤ، جب تم اس کو نکالو گے تو ہم اس کو چمک دار بنادیں گے۔

جب معجزات میں یہ بات ہے کہ نبی سے کچھ نہ کچھ عمل ضرور کرایا گیا تو دوسری چیزوں میں یہ اصول بطریق اولیٰ پایا جانا ضروری ہے کہ اپنی طرف سے کچھ نہ کچھ عمل ضرور کرنا ہے، جب اپنا عمل کرلو گے تو پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے برکت اور مدد آئے گی۔ اس لئے قدم بڑھانے کی ضرورت ہے، اگر آدمی دور ہی سے اپنے اوپر ہوا سوار کر کے بیٹھ جائے اور یہ کہنے لگے کہ آج تو زمانہ خراب ہے، حالات خراب ہیں، ماحول خراب ہے، اور اس کی وجہ سے آدمی پھر ہاتھ پاؤں ہلانا چھوڑ دے تو پھر کچھ نہیں ہوسکتا۔

جب چلو گے تو راستہ کھلتا چلا جائے گا

حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اس کی ایک مثال دیا کرتے تھے جو یاد رکھنے کی ہے۔ فرماتے تھے کہ اگر تم کسی لمبی اور سیدھی سڑک پر کھڑے ہو اور اس سڑک کے دونوں طرف درختوں کی قطاریں ہوں، اب اگر یہاں کھڑے کھڑے سڑک کو دیکھو گے تو یہ نظر آئے گا کہ آگے چل کر درخت کی قطاریں آپس میں مل گئی ہیں اور آگے راستہ بند ہے۔ اب اگر کوئی احمق یہاں کھڑے ہو کر کہے کہ آگے چونکہ راستہ بند ہے، اس لئے اس راستے پر چلنا فضول ہے، اور وہ آگے قدم نہ بڑھائے تو وہ احمق ساری عمر وہیں کھڑا رہے گا اور کبھی منزل تک نہیں پہنچ سکے گا۔ لیکن اگر وہ چلنا شروع کرے گا تب اس کو پتہ چلے گا کہ درحقیقت راستہ بند نہیں تھا بلکہ میری نگاہ دھوکہ دے رہی تھی۔

گناہ چھوڑنے کی کوشش کیجئے

اللہ تعالیٰ کے دین کا معاملہ بھی یہی ہے، اگر آدمی دور دور سے یہ سوچ کر بیٹھ جائے کہ آج کل کے دور میں دین پر عمل کرنا بڑا مشکل ہے، یہ تو بیسویں صدی ہے، اس میں گناہوں سے بچنا بڑا مشکل ہے، اس زمانے میں ہم کیسے اپنا ماحول تبدیل کریں؟ ٹی وی کیسے چھوڑیں؟ وی سی آر کیسے چھوڑیں؟ بے پردگی کیسے چھوڑیں؟ بدنگاہی کیسے چھوڑیں؟ جھوٹ کیسے چھوڑیں؟ رشوت کیسے چھوڑیں؟ اگر ان کاموں کو مشکل سمجھ کر انسان بیٹھا رہے تو وہ انسان کبھی کامیاب نہیں ہوگا۔ لیکن اگر انسان یہ سوچے کہ پہلے میں یہ گناہ سو مرتبہ کرتا تھا اور اب میں اس میں کچھ تو کمی کروں، سو میں سے پچاس مرتبہ کم کروں، جب انسان کمی کرنے کا اقدام خود سے کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس میں تمہاری مدد فرمائیں گے، اگر تم نے سو میں سے پچاس کر لیا تو اللہ تعالیٰ پھر پچاس کے پچیس بھی کرا دیں گے انشاء اللہ، اور اگر تم نے پچاس سے پچیس کر لیے تو اللہ تعالیٰ صفر بھی کرا دیں گے۔

صبح سے شام تک کے کاموں کا جائزہ لیں

ہمارے حضرت والا فرمایا کرتے تھے کہ ہر شخص اپنی صبح سے لے کر شام تک کی زندگی کا جائزہ لے کہ میں کیا کیا کرتا ہوں؟ کتنے فرائض و واجبات میں ادا نہیں کرتا؟ کتنی سنتیں میں ترک کرتا ہوں؟ کتنے نیک اعمال ایسے ہیں جو میں نہیں کرتا؟ اور کتنی برائیاں، کتنی غلطیاں اور کتنے گناہ ایسے ہیں جو میں کرتا ہوں؟ ان سب کی ایک فہرست بناؤ، پھر اس فہرست میں غور کر کے دیکھو کہ کتنے گناہ ایسے ہیں جو تم کسی تکلیف کے بغیر فوراً چھوڑ سکتے ہو، ان کو تو فوراً چھوڑ دو، اور جن گناہوں کے چھوڑنے میں تھوڑا سا وقت درکار ہے، ان کو چھوڑنے کے لئے کوشش شروع کر دو، اور اللہ تعالیٰ سے مدد مانگتے رہو کہ یا اللہ! جتنے گناہ چھوڑنا میرے بس میں تھا، ان کو تو میں نے چھوڑ دیا، اے اللہ! بقیہ گناہوں کو چھوڑنا میرے بس میں نہیں ہے، آپ اپنے فضل سے ان کو چھڑا دیجئے۔

یہ کام کرو، پھر اللہ تعالیٰ مدد فرمائیں گے۔

قدم بڑھاؤ اور پھر دعا کرو

دو کام ہمیشہ یاد رکھو! ایک یہ کہ اپنی طرف سے قدم بڑھانا اور دوسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ سے تکمیل کی دعا کرنا۔ ساری عمر یہ دو کام کرتے رہو، پھر انشاء اللہ تم کامیاب ہو جاؤ گے۔

ہمارے حضرت فرمایا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ سے باتیں کیا کرو، اور کہو:

''یا اللہ! میں فلاں فلاں گناہوں کے اندر مبتلا تھا، میں نے قدم بڑھایا اور اتنے گناہ چھوڑ دیئے، البتہ باقی گناہوں کے چھوڑنے میں نفس و شیطان سے مغلوب ہو رہا ہوں، حالات اور ماحول سے مغلوب ہو رہا ہوں، اس لئے وہ گناہ میں نہیں چھوڑ پا رہا ہوں، اور آپ اس مغلوبیت کو ختم کر سکتے ہیں، میرے بس میں نہیں ہے۔ اے اللہ! آپ اس رکاوٹ کو اور مغلوبیت کو دور فرما دیجئے، یا مجھ سے رکاوٹ کو دور فرما دیجئے یا مجھے پھر آخرت میں عذاب نہ دیجئے گا''

اس طرح باتیں کرو، پھر دیکھو کیسے کام بنتا ہے اور کس طرح اللہ تعالیٰ گناہوں سے بچنے کی توفیق عطا فرماتے ہیں۔ لہٰذا اپنے حصے کا کام کرو جتنا تم کر سکتے ہو، باقی کی تکمیل کے لئے اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے رہو۔

حضرت یوسف علیہ السلام کا دروازے کی طرف بھاگنا

حضرت یوسف علیہ السلام کو دیکھئے! زلیخا نے ان کو گناہ کی دعوت دی اور دعوت دیتے وقت تمام دروازوں پر تالے ڈال دیئے تا کہ بھاگنے کا راستہ باقی نہ ہو، حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ دروازوں پر تالے پڑے ہوئے ہیں، لیکن پھر بھی آپ دروازے کی طرف دوڑے، دروازے تک اس لئے بھاگے تا کہ اللہ میاں سے کہہ سکیں کہ یا اللہ! دروازے تک بھاگنا میرا کام تھا اور آگے دروازے کھولنا آپ کا کام ہے۔ اگر حضرت یوسف علیہ السلام دروازے تک نہ بھاگتے تو دروازوں کے تالے کھلنے کی کوئی گارنٹی نہیں تھی، لیکن چونکہ دروازے تک بھاگے اور وہاں پہنچ کر یہ کہہ دیا کہ یا اللہ! اتنا میرے بس میں تھا جو میں نے کر دیا، آگے دروازے کھولنا میرے بس کا کام نہیں۔ فرمایا:

﴿وَإِلَّا تَصْرِفْ عَنِّيْ كَيْدَهُنَّ أَصْبُ إِلَيْهِنَّ وَأَكُنْ مِّنَ الْجَاهِلِيْنَ﴾ (۱)

''اگر آپ نے مجھ سے ان کے فتنوں کو دور نہ فرمایا تو میں اس میں مبتلا ہو جاؤں گا اور اس کے نتیجے میں جاہلوں میں سے ہو جاؤں گا''

جب اللہ تعالیٰ نے یہ دیکھا کہ میرے بندے نے اپنے حصے کا کام کر لیا، تو اب ہم اپنے حصے کا کام کریں گے۔ چنانچہ دروازوں کے تالے ٹوٹ گئے اور دروازے کھل گئے۔ اسی کو مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

گرچہ رخنہ نیست عالم را پدید
خیرہ یوسف وار می باید دوید

(۱) یوسف: ۳۳

یعنی اگرچہ اس عالم میں بھی تمہیں بھاگنے کا کوئی راستہ نظر نہیں آرہا ہے، اور گناہوں سے، فحاشی سے، عریانی سے، بددینی سے بھاگنے کا راستہ نظر نہیں آرہا ہے، لیکن جس طرح حضرت یوسف علیہ السلام دروازے تک بھاگے تھے، تم بھی دروازے تک تو بھاگ کر دکھاؤ، اور پھر اللہ میاں سے کہو کہ یا اللہ! آگے بچانا آپ کا کام ہے۔ اس وقت انشاء اللہ دروازے کھل جائیں گے اور اللہ کی مدد آئے گی۔ یہی مضمون ہے اس حدیثِ قدسی کا جس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جو بندہ میری طرف ایک بالشت بڑھتا ہے تو میں ایک ہاتھ اس کی طرف بڑھتا ہوں۔

رات کو سونے سے پہلے یہ عمل کیجئے

لہٰذا جب رات کو سونے لگو تو اللہ تعالیٰ سے کچھ باتیں کرلو، اور اللہ تعالیٰ سے کہہ دو کہ یا اللہ! آج کا دن گزر گیا، آج کے دن میں اتنے گناہوں سے بچ سکا اور اتنے گناہوں سے نہیں بچ سکا، اتنا کام کرسکا اور اتنا کام نہیں کرسکا اور میں مغلوب ہوگیا، یا اللہ! اپنی رحمت سے اس مغلوبیت کو دور فرمادیجئے، میں آپ کے راستے پر چلنا چاہتا ہوں، لیکن یہ نفس و شیطان اور میرا یہ ماحول مجھے آپ کے راستے سے بہکاتے ہیں، اے اللہ! مجھے ان کے اُوپر غلبہ عطا فرما۔ یہ دعا رات کو کرلو۔

صبح اُٹھ کر یہ عہد کرلیں

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ روزانہ صبح کو بیٹھ کر اللہ تعالیٰ سے عہد و پیمان کرلیا کرو:

> ''یا اللہ! آج کا دن شروع ہو رہا ہے اور آج جب میں اپنے کاروبارِ زندگی میں نکلوں گا تو خدا جانے گناہوں کے کیا کیا دواعی اور محرکات سامنے آئیں گے اور کیسے کیسے حالات گزریں گے، میں اس وقت آپ کی بارگاہ میں بیٹھ کر عزم کر رہا ہوں اور ارادہ کر رہا ہوں کہ آپ کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق چلوں گا اور آپ کی رضا کے راستے پر چلنے کی کوشش کروں گا، لیکن اے اللہ! مجھے اپنی طاقت اور ہمت پر بھروسہ نہیں ہے، چلنا تو چاہ رہا ہوں، لیکن ہوسکتا ہے کہ گر پڑوں، لڑکھڑا جاؤں، اے اللہ! میں جہاں گرنے لگوں، اپنی رحمت سے مجھے تھام لیجئے گا اور مجھے اس غلط راستے سے بچا لیجئے گا۔ یا اللہ! میں بے ہمت ہوں، بے حوصلہ ہوں، ہمت دینے والے بھی آپ ہیں، حوصلہ دینے والے بھی آپ ہیں، اپنی رحمت سے ہمت اور حوصلہ بھی عطا فرمادیجئے۔ اور اگر اس کے بعد بھی میں گرا تو پھر آپ مجھ سے

قیامت کے روز مواخذہ نہ فرمایئے گا، پھر میری گرفت نہ فرمایئے گا، اس لئے کہ میں چلنا چاہتا ہوں، اگر آپ نہیں تھامیں گے تو میں گمراہ ہو جاؤں گا، اب اگر میں گمراہ ہو گیا تو آپ کی ذمہ داری ہے، پھر آپ مجھ سے مواخذہ نہ فرمایئے گا''

روزانہ صبح کے وقت اللہ تعالیٰ سے یہ عہد و پیمان کرو، اور پھر حتی الامکان اپنے عمل کے وقت کوشش کرلو، پھر بھی اگر بالفرض بھول چوک سے بتقاضائے بشریت کہیں لڑکھڑا گئے اور اس پر اللہ تعالیٰ سے استغفار کرلیا اور توبہ کرلی تو انشاء اللہ پھر راستے پر آجاؤ گے۔ لیکن صبح کے وقت یہ عہد و پیمان کرلو۔

صبح یہ دعا کرلیا کرو

ہمارے حضرت رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ صبح فجر کی نماز کے بعد وظائف اور ذکر واذکار سے فارغ ہو کر یہ پڑھ لیا کرو:

﴿إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ (۱)

''اے اللہ! میری نماز، میری عبادت، میرا جینا، میرا مرنا، سب آپ کے لئے ہے''

میں اس وقت ارادہ کر رہا ہوں کہ جو کچھ کروں گا سب آپ کی رضا کے لئے کروں گا، لیکن مجھے اپنی ذات پر بھروسہ نہیں، خدا جانے کہاں لڑکھڑا جاؤں، آپ میری مدد فرمایئے۔ یہ کرنے کے بعد پھر کاروبارِ زندگی کے اندر نکلو، انشاء اللہ پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے مدد ہوگی۔ روزانہ یہ کام کرلو، پھر دیکھو گے کیا سے کیا ہو جائے گا۔ اور اگر پھر کسی جگہ پر لڑکھڑا بھی گئے تو اللہ تعالیٰ سے بات تو کرلی ہے کہ یا اللہ! میرا ثابت قدم رہنا میرے بس سے باہر ہے، تو اُمید ہے کہ معافی کا سامان ہو ہی جائے گا، اس کے بعد جب دوبارہ اگلے روز صبح بیٹھو تو پہلے استغفار کرلو اور پھر دوبارہ اس عزم کو تازہ کرلو۔

آج کو گذشتہ کل سے اچھا بناؤ

اور یہ تہیہ کرلو کہ آج میں کل کے مقابلے میں زیادہ بہتر عمل کروں گا، اور آج میں گناہوں سے زیادہ بچنے کی کوشش کروں گا۔

حدیث شریف میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس کا آج اور کل برابر ہو گا وہ شخص بڑے خسارے میں ہے۔ (۲)

---

(۱) الأنعام: ۱٦۲

(۲) احیاء علوم الدین (٦/٤١١)، الدر المنتشرة فی الأحادیث المشتهرة (١/٤٠)، کشف الخفاء ومزیل الالباس للعجلونی (٢/٢٣٣)، رقم: ٢٤٠٥، حلیة الأولیاء (٣/٣٦٢)

اس لئے کہ اس نے کوئی ترقی نہیں کی، کل کے مقابلے میں آج اس نے کچھ تو ترقی کی ہوتی، کچھ تو آگے بڑھا ہوتا۔ اس لئے حضورِ اقدس ﷺ نے یہ دعا تلقین فرمائی کہ یہ دعا کرلیا کرو:

((اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ يَوْمَنَا خَيْرًا مِّنْ اَمْسِنَا وَغَدَنَا خَيْرًا مِّنْ يَّوْمِنَا))

''اے اللہ! ہمارے آج کو گذشتہ کل سے بہتر بنادیجئے اور ہمارے آئندہ کل کو آج سے بہتر بنادیجئے''

یہ دعا کرو اور عزم اور تہیہ کر کے کام کرو، اور اللہ تعالیٰ سے مدد مانگو تو پھر اللہ تعالیٰ مدد فرمائیں گے اور انشاء اللہ رفتہ رفتہ گرتے پڑتے منزل تک پہنچ جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ مجھے بھی اور آپ سب کو اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

نیک کام میں دیر نہ کیجئے ☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ! فَأَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ.
﴿وَسَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ﴾ (۱)

علامہ نووی رحمہ اللہ نے آگے جو باب قائم کیا ہے، وہ یہ ہے:
"بَابُ الْمُبَادَرَةِ اِلَى الْخَيْرَاتِ" (۲)

اس کے معنی یہ ہیں کہ جب انسان اپنی حقیقت پر غور کرے گا، اور اللہ جل جلالہٗ کی عظمتِ شان، اس کی قدرتِ کاملہ اور حکمتِ بالغہ پر غور کرے گا، اور اس کی شانِ ربوبیت پر غور کرے گا، تو اس غور و فکر کے نتیجے میں اللہ تبارک و تعالیٰ کی عبادت کی طرف دل مائل ہوگا اور خود بخود دل میں داعیہ پیدا ہوگا کہ جس مالک نے یہ ساری کائنات بنائی ہے اور جس مالک نے یہ نعمتیں مجھ پر نازل فرمائی ہیں اور جس مالک نے مجھے رحمتوں کی بارش میں رکھا ہے، اس مالک کا بھی مجھ پر کوئی حق ہوگا؟ جب یہ داعیہ اور میلان پیدا ہو، اس وقت کیا کرنا چاہئے؟

اس سوال کے جواب کے لئے علامہ نووی رحمہ اللہ نے یہ باب قائم فرمایا ہے کہ جب بھی اللہ تعالیٰ کی عبادت کا داعیہ پیدا ہو، اور نیک کام کے کرنے کا محرک سامنے آئے، تو اس وقت ایک مومن کا کام یہ ہے کہ جلد از جلد اس نیک کام کو کر لے۔ اس میں دیر نہ لگائے۔ یہی معنی ہیں "مبادرۃ" کے، یعنی کسی کام کو جلدی سے کر لینا، ٹال مٹول نہ کرنا، اور آئندہ کل پر نہ ٹالنا۔

نیکی کے کاموں میں دوڑ لگاؤ

علامہ نووی رحمہ اللہ سب سے پہلے یہ آیتِ کریمہ لائے ہیں:

☆ اصلاحی خطبات (۱/۵۹ تا ۹۱)، درسِ ریاض الصالحین، باب المبادرۃ الی الخیرات، ص: ۵۸

(۱) آل عمران: ۱۳۳

(۲) ریاض الصالحین، ص: ۵۸

﴿وَسَارِعُوْا إِلَى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْأَرْضُ أُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ﴾ (۱)

تمام انسانیت کو خطاب کر کے اللہ تعالیٰ فرما رہے ہیں کہ اپنے پروردگار کی مغفرت کی طرف اور اس جنت کی طرف جلدی سے دوڑو، جس کی چوڑائی آسمانوں اور زمین کے برابر، بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ ہے اور وہ متقی لوگوں کے لئے تیار کی گئی ہے۔

''مسارعت'' کے معنی ہیں، جلد سے جلد کوئی کام کرنا، دوسرں سے آگے بڑھنے کی کوشش کرنا۔

ایک دوسری آیت میں فرمایا:

﴿فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ﴾ (۲)

یعنی بھلائی اور نیکی کے کاموں میں ریس اور دوڑ لگاؤ۔ خلاصہ اس کا یہ ہے کہ جب کسی نیک کام کا ارادہ اور داعیہ دل میں پیدا ہو تو اس کو ٹلاؤ نہیں۔

شیطان کا ایک داؤ

اس لئے کہ شیطان کے داؤ اور اس کے حربے ہر ایک کے ساتھ الگ الگ ہوتے ہیں، کافر کے لئے اور ہیں، مومن کے لئے اور ہیں۔ مومن کے دل میں شیطان یہ بات نہیں ڈالے گا کہ یہ نیکی کا کام مت کیا کرو، یہ بُرے کام ہیں۔ یہ بات براہِ راست اس کے دل میں نہیں ڈالے گا، اس لئے کہ وہ جانتا ہے کہ یہ صاحبِ ایمان ہونے کی وجہ سے نیکی کے کام کو بُرا نہیں سمجھ سکتا۔ لیکن مومن کے ساتھ اس کا یہ حربہ ہوتا ہے کہ اس سے یہ کہتا ہے کہ یہ نماز پڑھنا، یہ فلاں نیک کام کرنا تو اچھا ہے، اس کو کرنا چاہئے، لیکن انشاء اللہ کل سے شروع کریں گے۔ اب جب کل آئے گی تو پھر یہ کہے گا: اچھا بھائی! کل سے شروع کروں گا، تو وہ کل کبھی زندگی بھر نہیں آئے گی۔ یا کسی اللہ والے کی بات دل میں اثر کر گئی کہ یہ بات تو صحیح ہے، عمل کرنا چاہئے، اپنی زندگی میں تبدیلی لانی چاہئے، گناہوں کو چھوڑنا چاہئے، نیکیوں کو اختیار کرنا چاہئے، لیکن انشاء اللہ اس پر جلد از جلد عمل کریں گے، جب اس کو ٹلا دیا تو پھر کبھی اس پر عمل کی نوبت نہیں آئے گی۔

عمرِ عزیز سے فائدہ اُٹھایئے

اسی طرح زندگی کے اوقات گزرتے جا رہے ہیں۔ عمرِ عزیز گزرتی جا رہی ہے۔ کچھ پتہ نہیں کہ کتنی عمر باقی ہے؟ قرآن کریم کا یہ ارشاد ہے کہ کل پر مت ٹالو، جو داعیہ اس وقت پیدا ہوا ہے، اس پر اسی وقت عمل کرو، کیا معلوم کہ کل تک یہ داعیہ رہے یا نہ رہے، اول تو یہ بھی نہیں پتہ کہ تم خود زندہ رہو یا

(۱) آلِ عمران: ۱۳۳　(۲) البقرة: ۱۴۸

نہ رہو اور اگر تم خود زندہ رہو تو یہ پتہ نہیں کہ یہ داعیہ باقی رہے گا یا نہیں؟ اور اگر داعیہ باقی رہا تو کیا معلوم کہ اس وقت حالات موافق ہوں یا نہ ہوں۔ بس! اس وقت جو داعیہ پیدا ہوا ہے اس پر عمل کر کے فائدہ حاصل کرلو۔

نیکی کا داعیہ اللہ تعالیٰ کا مہمان ہے

یہ داعیہ اللہ جل شانہٗ کی طرف سے مہمان ہے، اس مہمان کی خاطر مدارات کرلو، اس کی خاطرِ مدارات یہ ہے کہ اس پر عمل کرلو، اگر نفل نماز پڑھنے کا داعیہ پیدا ہوا، اور یہ سوچا کہ یہ فرض و واجب تو ہے نہیں، اگر نہیں پڑھیں گے تو کوئی گناہ تو ہوگا نہیں، چلو چھوڑو۔ یہ تم نے اس مہمان کی ناقدری کردی جو اللہ تعالیٰ نے تمہاری اصلاح کی خاطر بھیجا تھا۔ اگر تم نے اسی وقت فوراً عمل نہ کیا تو پیچھے رہ جاؤ گے، پھر معلوم نہیں کہ دوبارہ مہمان آئے، یا نہ آئے، بلکہ وہ آنا بند کردے گا، کیونکہ وہ مہمان یہ سوچے گا کہ یہ شخص میری بات تو مانتا نہیں، اور میری ناقدری کرتا ہے، میری خاطر مدارات نہیں کرتا، میں اب اس کے پاس نہیں جاتا، اس طرح دل میں نیکی کا داعیہ پیدا ہونا ہی بند ہوجائے گا۔ بہرحال ویسے تو ہر کام میں جلدی اور عجلت کرنا بُرا ہے، لیکن جب دل میں کسی نیک کام کے کرنے کا داعیہ پیدا ہو تو اس پر جلدی عمل کرلینا ہی اچھا ہے۔

فرصت کے انتظار میں مت رہیں

اگر اپنی اصلاح کی فکر کا دل میں خیال آیا کہ زندگی ویسے ہی گزری جارہی ہے، نفس کی اصلاح ہونی چاہئے، اور اپنے اخلاق اور اعمال کی اصلاح ہونی چاہئے۔ لیکن ساتھ ہی یہ سوچا کہ جب فلاں کام سے فارغ ہوجائیں گے، پھر اصلاح شروع کریں گے، یہ فرصت کے انتظار میں عمرِ عزیز کے جو لمحات گزر رہے ہیں، وہ فرصت کبھی آنے والی نہیں ہے۔

کام کرنے کا بہترین گُر

ہمارے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس اللہ سرہ فرمایا کرتے تھے:

”جو کام فرصت کے انتظار میں ٹال دیا، وہ ٹل گیا، وہ پھر نہیں ہوگا۔ اس واسطے کہ تم نے اس کو ٹال دیا۔ کام کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ دو کاموں کے درمیان تیسرے کام کو گھسا دو، یعنی وہ دو کام جو تم پہلے سے کررہے ہو، اب تیسرا کام کرنے کا خیال آیا، تو ان دو کاموں کے درمیان تیسرے کام کو زبردستی گھسا دو، وہ تیسرا کام بھی ہوجائے

گا، اور اگر یہ سوچا کہ ان دو کاموں سے فارغ ہو کر پھر تیسرا کام کریں گے تو پھر وہ کام نہیں ہوگا۔ یہ منصوبے اور پلان بنانا کہ جب یہ کام ہو جائے گا تو پھر کام کریں گے، یہ سب ٹالنے والی باتیں ہیں، شیطان عموماً اسی طرح دھوکہ میں رکھتا ہے''

نیک کاموں میں مقابلہ بُرا نہیں

اس لئے ''مبادرة الی الخیرات'' یعنی نیک کاموں میں جلدی کرنا اور آگے بڑھنا قرآن و سنت کا تقاضا ہے۔ اور علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے اسی کے لئے یہ باب قائم فرمایا ہے ''باب المبادرة الی الخیرات'' یعنی بھلائیوں کی طرف جلدی سے سبقت کرنا۔

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے یہاں دو لفظ استعمال کیے ہیں: ایک ''مبادرة'' یعنی جلدی کرنا، دوسرا ''مسابقة'' یعنی مقابلہ کرنا، ریس لگانا، ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرنا۔ اور یہ مقابلہ کرنا اور ریس لگانا نیکی کے معاملے میں محبوب ہے، لیکن دوسری چیزوں میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرنا بُرا ہے، جیسے مال کے حصول میں، عزت کے حصول میں، شہرت کے معاملے میں، دنیا کے حصول میں، جاہ طلبی کے معاملے میں، ان سب میں یہ بات بُری ہے کہ انسان دوسرے سے آگے بڑھنے کی حرص میں لگ جائے۔ لیکن نیکیوں کے معاملے میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کا جذبہ ایک محمود اور قابلِ تعریف جذبہ ہے۔

قرآن کریم خود کہہ رہا ہے کہ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ نیکیوں میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرو۔ ایک شخص کو تم دیکھ رہے ہو کہ ماشاء اللہ عبادت میں لگا ہوا ہے، طاعات میں لگا ہوا ہے، گناہوں سے بچ رہا ہے، اب کوشش کرو کہ میں اس سے بھی زیادہ آگے بڑھ جاؤں، اس میں ریس لگانا بُرا نہیں۔

دُنیاوی اسباب میں مقابلہ درست نہیں

یہاں معاملہ اُلٹا ہو گیا ہے، اس وقت ہماری پوری زندگی ریس لگانے میں گزر رہی ہے۔ لیکن ریس اس میں لگ رہی ہے کہ پیسہ زیادہ سے زیادہ کہاں سے آجائے۔ دوسرے نے اتنا کما لیا، میں اس سے زیادہ کما لوں، دوسرے نے ایسا بنگلہ بنا لیا، میں اس سے اعلیٰ درجے کا بنا لوں، دوسرے نے ایسی کار خریدی، میں اس سے اعلیٰ درجے کی خرید لوں، دوسرے نے ایسا ساز و سامان جمع کر لیا، میں اس سے اعلیٰ درجے کا جمع کر لوں۔ پوری قوم اسی ریس کے اندر مبتلا ہے، اور اس ریس میں حلال و حرام کی فکر مٹ گئی ہے، اس لئے کہ جب دماغ پر یہ جذبہ سوار ہو گیا کہ دنیاوی ساز و سامان میں دوسرے سے

آگے بڑھنا ہے، تو حلال مال کے ذریعہ آگے نکلنا تو بڑا مشکل ہے، تو پھر حرام کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ اس طرح اب حلال و حرام ایک ہو رہے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ جس چیز میں ریس لگانا اور مقابلہ کرنا شرعاً بُرا تھا وہاں سب مقابلے پر لگے ہوئے ہیں اور ایک دوسرے سے آگے بڑھ رہے ہیں، اور جس چیز میں مقابلہ کرنا، ریس لگانا، ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی فکر کرنا مطلوب تھا، اس میں پیچھے رہ گئے ہیں۔

غزوۂ تبوک کے موقع کا ایمان افروز واقعہ

حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو دیکھئے کہ غزوۂ تبوک کے موقع پر انہوں نے کیا کِیا۔ غزوۂ تبوک بڑا کٹھن غزوہ تھا۔ ایسا صبر آزما غزوہ اور ایسی صبر آزما مہم شاید کوئی اور پیش نہیں آئی جیسی غزوۂ تبوک کے موقع پر پیش آئی۔ سخت گرمی کا موسم، وہ موسم جس میں آسمان سے شعلے برستے ہیں، زمین آگ اُگلتی ہے، اور تقریباً بارہ سو کلومیٹر کا صحرائی سفر، اور کھجوریں پکنے کا زمانہ، جس پر سارے سال کی معیشت کا دارومدار ہوتا ہے، سواریاں میسر نہیں، پیسے موجود نہیں، اور اس وقت میں یہ حکم دیا جا رہا ہے کہ ہر مسلمان کے لئے نفیرِ عام ہے کہ وہ اس غزوہ میں چلے، اور اس میں شریک ہو۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجدِ نبوی میں کھڑے ہو کر اعلان فرمایا کہ یہ غزوہ کا موقع ہے، اور سواریوں کی ضرورت ہے، اُونٹنیاں چاہئیں، پیسوں کی ضرورت ہے۔ مسلمانوں کو چاہئے کہ بڑھ چڑھ کر اس میں چندہ دیں، اور جو شخص اس میں چندہ دے گا، میں اس کے لئے جنت کی ضمانت دیتا ہوں۔ اب صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کہاں پیچھے رہنے والے تھے، جبکہ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے یہ جملہ سن لیں کہ ان کے لئے جنت کی ضمانت ہے، اب ہر شخص اپنی استطاعت کے مطابق چندہ دے رہا ہے، کوئی کچھ لا رہا ہے، کوئی کچھ لا رہا ہے۔

حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں اپنے گھر گیا، اور میں نے اپنے گھر کا جتنا کچھ ساز و سامان اور روپیہ پیسہ تھا وہ آدھا آدھا تقسیم کر دیا، اور پھر آدھا حصہ لے کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں چلا گیا، اور دل میں خیال آنے لگا کہ آج وہ دن ہے کہ شاید میں ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے آگے نکل جاؤں۔ یہ جو جذبہ پیدا ہو رہا ہے کہ میں ان سے آگے بڑھ جاؤں، یہ ہے "مسابقۃ الی الخیرات"، مگر کبھی ان کے دل میں یہ جذبہ پیدا نہیں ہوا کہ میں حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ سے پیسے میں آگے بڑھ جاؤں، کبھی یہ جذبہ پیدا نہیں ہوا کہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کے پاس بہت پیسے ہیں، ان سے زیادہ پیسے مجھے حاصل ہو جائیں، لیکن یہ جذبہ پیدا ہوا کہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو اللہ تعالیٰ نے نیکی کا جو مقام بخشا ہے، ان سے آگے بڑھ جاؤں، تھوڑی دیر میں حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ بھی تشریف لائے، اور جو کچھ تھا حاضر کر دیا۔

سرکارِ دو عالم ﷺ نے پوچھا ''اے عمر! گھر میں کیا چھوڑ آئے ہو؟''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا ''یا رسول اللہ ﷺ! آدھا مال گھر والوں کے لئے چھوڑ دیا، اور آدھا غزوہ کے لئے اور جہاد کے لئے لے آیا ہوں''

آپ ﷺ نے ان کو دعائیں دیں کہ اللہ تعالیٰ تمہارے مال میں برکت دے۔

اس کے بعد صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے پوچھا ''تم نے اپنے گھر میں کیا چھوڑا؟''

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عرض کیا ''یا رسول اللہ ﷺ! گھر میں اللہ اور اس کے رسول کو چھوڑ آیا ہوں، جو کچھ گھر میں تھا سارے کا سارا سمیٹ کر یہاں لے آیا ہوں''

حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس دن مجھے پتہ چلا کہ میں چاہے ساری عمر کوشش کرتا رہوں لیکن حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔ (۱)

ایک مثالی معاملہ

ایک مرتبہ فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ آپ میرے ساتھ ایک معاملہ کریں تو میں بڑا احسان مند ہوں گا۔

انہوں نے پوچھا: کیا معاملہ؟

فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میری ساری عمر کی جتنی نیکیاں ہیں، جتنے اعمالِ صالحہ ہیں، وہ سب مجھ سے لے لیں، اور وہ ایک رات جو آپ نے نبی کریم ﷺ کے ساتھ غارِ ثور میں گزاری، اس کا ثواب مجھے دے دیں، یعنی وہ ایک رات جو آپ نے نبی کریم ﷺ کے ساتھ غارِ ثور میں گزاری، وہ میرے سارے اعمال پر بھاری ہے۔ (۲)

غرض یہ کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی زندگی کو دیکھیں تو کہیں یہ بات نظر نہیں آتی کہ یہ سوچیں کہ فلاں نے اتنے پیسے جمع کر لیے، میں بھی جمع کرلوں، فلاں کا مکان بڑا شاندار ہے، میرا بھی ویسا ہو جاتا، فلاں کی سواری بہت اچھی ہے، ویسی مجھے بھی مل جاتی۔ لیکن اعمالِ صالحہ میں مسابقت نظر آتی ہے۔ اور آج ہمارا معاملہ بالکل اُلٹا چل رہا ہے، اعمالِ صالحہ میں آگے بڑھنے کی کوئی فکر نہیں، اور مال کے اندر صبح سے لے کر شام تک دوڑ ہو رہی ہے، اور ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی فکر میں ہیں۔

---

(۱) سنن الترمذی، کتاب المناقب عن رسول اللہ، باب فی مناقب أبی بکر وعمر کلیھما، رقم: ۳۶۰۸، سنن أبی داؤد، کتاب الزکاۃ، باب فی الرخصۃ فی ذلك، رقم: ۱۴۲۹، سنن الدارمی، کتاب الزکاۃ، رقم: ۱۶۰۱

(۲) البدایۃ والنھایۃ (۱۸۰/۳)، حلیۃ الأولیاء (۳۳/۱)

ہمارے لئے نسخۂ اکسیر

نبی کریم ﷺ نے ایک عجیب ارشاد فرمایا، جو ہمارے لئے نسخۂ اکسیر ہے، فرمایا:

''دنیا کے معاملے میں ہمیشہ اپنے سے نیچے والے کو دیکھو، اور اپنے سے کمتر حیثیت والوں کے ساتھ رہو، اُن کی صحبت اختیار کرو، اور ان کے حالات کو دیکھو۔ اور دین کے معاملے میں ہمیشہ اپنے سے اُونچے آدمی کو دیکھو، اور ان کی صحبت اختیار کرو''(۱)

اس لئے کہ جب دنیا کے معاملے میں اپنے سے کمتر لوگوں کو دیکھو گے تو جو نعمتیں اللہ تعالیٰ نے تمہیں دی ہیں، ان نعمتوں کی قدر ہوگی کہ یہ نعمت اس کے پاس نہیں ہے، اور اللہ تعالیٰ نے مجھے دے رکھی ہے، اور اس سے قناعت پیدا ہوگی، شکر پیدا ہوگا اور دنیا طلبی کی دوڑ کا جذبہ ختم ہوگا۔ اور دین کے معاملے میں جب اُوپر والوں کو دیکھو گے کہ یہ شخص تو دین کے معاملے میں مجھ سے آگے بڑھ گیا تو اس وقت اپنی کمی کا احساس پیدا ہوگا، اور آگے بڑھنے کی فکر پیدا ہوگی۔

حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ نے راحت کیسے حاصل کی؟

حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ جو محدث بھی ہیں، فقیہ بھی ہیں، صوفی بھی ہیں، وہ فرماتے ہیں:

''میں نے اپنی زندگی کا ابتدائی حصہ مالداروں کے ساتھ گزارا (خود بھی مالدار تھے) صبح سے شام تک مالداروں کے ساتھ رہتا تھا، لیکن جب تک مالداروں کی صحبت میں رہا، مجھ سے زیادہ غمگین انسان کوئی نہیں تھا، کیونکہ جہاں جاتا، یہ دیکھتا کہ اس کا گھر میرے گھر سے اچھا ہے، اس کی سواری میری سواری سے اچھی ہے، اس کا کپڑا میرے کپڑے سے اچھا ہے۔ ان چیزوں کو دیکھ دیکھ کر میرے دل میں کڑھن پیدا ہوتی تھی کہ مجھے تو ملا نہیں اور اس کو مل گیا۔ لیکن بعد میں دنیاوی حیثیت سے جو کم مال والے تھے، اُن کی صحبت اختیار کی، اور ان کے ساتھ اُٹھنے بیٹھنے لگا، تو میں راحت میں آگیا، اس واسطے کہ جس کو بھی دیکھتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ میں تو بہت خوشحال ہوں، میرا کھانا بھی اس کے کھانے سے اچھا ہے، میرا کپڑا بھی اس کے کپڑے سے اچھا ہے، میرا گھر بھی اس کے گھر سے اچھا ہے، میری سواری بھی اس کی سواری سے اچھی ہے، اس واسطے میں اب الحمد للہ راحت میں آگیا ہوں''(۲)

---

(۱) مسند أحمد بن حنبل، مسند الأنصار، مسند أبي ذر الغفاري، رقم: ۲۰۴۴۷، ۲۰۵۴۰

(۲) سنن الترمذي، كتاب اللباس عن رسول الله صلى الله عليه وسلم، (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر دیکھئے)

قناعت کے حصول کا ذریعہ

یہ نبی کریم ﷺ کے ارشاد پر عمل کرنے کی برکت ہے، کوئی شخص تجربہ کر کے دیکھ لے۔ دنیا کے معاملے میں اپنے سے اُونچے کو دیکھتے رہو گے تو کبھی پیٹ نہیں بھرے گا، کبھی قناعت حاصل نہیں ہوگی، کبھی آنکھوں کو سیری نصیب نہیں ہوگی، ہر وقت یہی فکر ذہن پر سوار رہے گی جس کے بارے میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

((لَوْ كَانَ لِابْنِ آدَمَ وَادِيًا مِنْ ذَهَبٍ أَحَبَّ أَنْ يَكُوْنَ لَهُ وَادِيَانِ))(۱)

''اگر ابنِ آدم کو ایک وادی سونے کی بھر کر مل جائے تو وہ یہ چاہے گا کہ دو وادیاں مل جائیں''

اور جب دو مل جائیں گی تو چاہے گا کہ تین مل جائیں۔ اور اسی طرح پوری زندگی اسی دوڑ میں صرف ہو جائے گی، اور کبھی راحت کی منزل پر، قناعت اور سکون کی منزل پر پہنچ نہیں پائے گا۔

مال و دولت کے ذریعہ راحت نہیں خریدی جاسکتی

میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس اللہ سرہ کیا اچھی بات فرمایا کرتے تھے، لوحِ دل پر نقش کرنے کے قابل ہے۔ فرمایا کرتے تھے:

''راحت اور آرام اور چیز ہے اور اسبابِ راحت اور چیز ہیں۔ اسبابِ راحت سے راحت حاصل ہونا کوئی ضروری نہیں، ''راحت'' اللہ جل جلالہ کا عطیہ ہے، اور ہم نے آج اسبابِ راحت کا نام راحت رکھ دیا ہے۔ بہت سارا روپیہ رکھا ہو تو کیا بھوک کے وقت وہ اس کو کھالے گا؟ کیا اگر کپڑے کی ضرورت ہوگی تو اسی کو پہن لے گا؟ کیا گرمی لگنے کے وقت وہ پیسہ اس کو ٹھنڈک پہنچا سکے گا؟ بذاتِ خود نہ تو یہ پیسہ راحت ہے اور نہ ہی اس کے ذریعہ تم راحت خرید سکتے ہو۔ اور اگر اس کے ذریعے تم نے اسبابِ راحت خرید بھی لیے، مثلاً تم نے اس کے ذریعے کھانے پینے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) باب ماجاء فی ترقیع الثوب، رقم:۱۷۰۲، حلیة الأولیاء (۱۸۹/۲)، فیض القدیر (۹۳/۲)، تفسیر ابن کثیر (۶٤٥/۱)، صفة الصفوة (۱۱۰/۳)، واضح رہے کہ مذکورہ تمام مراجع میں یہ قول عبداللہ بن المبارک کے بجائے عون بن عبداللہ بن عتبہ کی طرف منسوب ہے۔

(۱) صحیح البخاری، کتاب الرقاق، باب ما یتقی من فتنة المال، رقم: ٥٩٥٦، صحیح مسلم، کتاب الزکاة، باب لو أن لأبن آدم الخ، رقم: ۱۷۳۷، سنن الترمذی، کتاب المناقب عن رسول اللہ، رقم: ۳۷۲٦

کی چیزیں خریدلیں، اچھے کپڑے خرید لیے، گھر کی سجاوٹ کا سامان خریدلیا، لیکن کیا راحت حاصل ہوگئی؟ یاد رکھو! محض ان اسباب کو جمع کر لینے سے راحت کا مل جانا کوئی ضروری نہیں، اس لئے کہ ایک شخص کے پاس راحت کے تمام اسباب موجود ہیں، لیکن صاحب بہادر کو گولی کھائے بغیر نیند نہیں آتی، بستر آرام دہ، ایئر کنڈیشنڈ کمرہ اور نوکر چاکر سبھی کچھ موجود ہے، لیکن نیند نہیں آرہی ہے۔ اب بتاؤ! اسبابِ راحت سارے موجود، لیکن نیند ملی؟ راحت ملی؟ اور ایک وہ شخص ہے جس کے گھر پر نہ تو پکی چھت ہے، بلکہ ٹین کی چادر ہے، نہ چار پائی ہے، بلکہ فرش پر سو رہا ہے، لیکن بس ایک ہاتھ اپنے سر کے نیچے رکھا، اور سیدھا نیند کی آغوش میں چلا گیا، اور آٹھ گھنٹے کی بھرپور نیند لے کر صبح کو بیدار ہوا۔ بتاؤ! راحت اُس کو ملی یا اِس کو ملی؟ اُس کے پاس اسبابِ راحت موجود تھے، لیکن راحت نہیں ملی، اور اِس مزدور کے پاس اسبابِ راحت موجود نہیں تھے، لیکن راحت مل گئی۔ یاد رکھو! اگر دنیا کے اسباب جمع کرنے کی فکر میں لگ گئے، اور دوسروں سے آگے بڑھنے کی فکر میں لگ گئے، تو خوب سمجھ لو کہ اسبابِ راحت تو جمع ہو جائیں گے، لیکن راحت پھر بھی حاصل نہ ہوگی"

وہ دولت کس کام کی جو سکون نہ دے سکے!

حضرت والد ماجد قدس اللہ سرہ کے زمانے میں ایک صاحب تھے، بہت بڑے مل اونر، اور ان کا کاروبار یہاں صرف پاکستان میں ہی نہیں تھا، بلکہ مختلف ممالک میں ان کا کاروبار پھیلا ہوا تھا۔ ایک دن ویسے ہی والد صاحب نے پوچھا کہ "آپ کی اولاد کتنی ہے؟"

انہوں نے جواب دیا "ایک لڑکا سنگاپور میں ہے، ایک لڑکا فلاں ملک میں ہے، سب دوسرے ملکوں میں ہیں"

دوبارہ پوچھا "آپ کی لڑکوں سے ملاقات تو ہوتی رہتی ہوگی، وہ آتے جاتے رہتے ہوں گے؟"

انہوں نے بتایا "ایک لڑکے سے ملاقات ہوئے ۱۵ سال ہوگئے ہیں"

۱۵ سال سے باپ نے بیٹے کی شکل نہیں دیکھی، اور بیٹے نے باپ کی شکل نہیں دیکھی۔ تو اب بتاؤ ایسا روپیہ اور ایسی دولت کس کام کی جو اولاد کو باپ کی شکل بھی نہ دکھا سکے، اور باپ کو اولاد کی شکل نہ دکھا سکے۔ یہ ساری دوڑ دھوپ اسبابِ راحت کے لئے ہو رہی ہے، لیکن راحت مفقود ہے۔ اس لئے یاد رکھو کہ راحت پیسے کے ذریعہ نہیں خریدی جاسکتی۔

پیسے سے ہر چیز نہیں خریدی جاسکتی

ابھی چند روز پہلے ایک صاحب نے ذکر کیا کہ وہ رمضان میں عمرے کو تشریف لے گئے، اور ایک اور صاحب دولت مند بھی عمرے کو جارہے تھے تو میں نے ان سے کہا کہ عمرے کو جارہے ہو، پہلے سے ذرا انتظام کر لینا، تاکہ رہنے کے لئے اور کھانے پینے کے لئے صحیح انتظام ہو جائے۔ وہ اپنی دولت کے گھمنڈ میں تھے، کہنے لگے: ارے میاں! چھوڑو انتظام وغیرہ اللہ کا شکر ہے، پیسے بہت موجود ہیں، پیسے سے دنیا کی ہر چیز مل جاتی ہے، آرام دہ رہائش بھی مل جاتی ہے، کھانا بھی مل جاتا ہے، کوئی فکر کی بات نہیں، ہمارے پاس پیسہ خوب ہے، دس ریال کی جگہ بیس ریال خرچ کر دیں گے۔ وہی صاحب بتارہے تھے کہ میں نے دو دن کے بعد دیکھا تو حرم شریف کے دروازے پر سر جھکائے بیٹھے ہیں، میں نے پوچھا: بھائی کیا ہوا؟ کہنے لگے: سحری میں اُٹھے تھے، لیکن ہوٹل میں کھانا نہیں ملا، کھانا ختم ہو گیا تھا۔ دماغ میں گھمنڈ تھا کہ پیسے سے ہر چیز خریدی جاسکتی ہے، اللہ تعالیٰ نے انہیں دکھا دیا کہ دیکھو! پیسہ تمہاری جیب میں رکھا رہ گیا، اور روزہ بغیر سحری کے رکھا۔

سکون حاصل کرنے کا راستہ

یہ پیسہ، یہ سازوسامان، یہ مال و دولت جو کچھ تم جمع کر رہے ہو، یہ بذاتِ خود راحت دینے والی چیز نہیں ہے، راحت پیسے سے خریدی نہیں جاسکتی، وہ محض اللہ تعالیٰ کا عطیہ ہے، جب تک قناعت پیدا نہیں ہوگی، اور جب تک یہ خیال پیدا نہیں ہوگا کہ اللہ تعالیٰ حلال طریقے سے جتنا مجھے دے رہے ہیں، اسی سے میرا کام چل رہا ہے، اس وقت تک تمہیں سکون حاصل نہیں ہوگا۔ ورنہ کتنے لوگ ایسے ہیں جن کے پاس دولت بے حد وحساب ہے لیکن ایک لمحے کا سکون نہیں، ایک لمحے کا قرار نہیں، رات کو نیند نہیں آتی، اور بھوک اُڑی ہوئی ہے۔ یہ سب اس دنیا کی دوڑ کا نتیجہ ہے۔ اسی لئے اللہ کے رسول ﷺ یہ فرماتے ہیں کہ ”دنیا کے معاملے میں اپنے سے اُونچے آدمی کو نہ دیکھو کہ وہ کہاں جارہا ہے، بلکہ اپنے سے نیچے والے کو دیکھو کہ ان کے مقابلے میں تمہیں اللہ تعالیٰ نے کیا کچھ دے رکھا ہے، اس کے ذریعے تمہیں قرار آئے گا، تمہیں راحت ملے گی اور سکون حاصل ہوگا۔ لیکن دین کے معاملے میں اپنے سے اُونچے کو دیکھو۔ کیوں؟ اس لئے کہ اس کے ذریعے آگے بڑھنے کا جذبہ پیدا ہوگا، اور آگے بڑھنے کی بے تابی ہوگی۔ لیکن یہ بے تابی بڑی لذیذ بے تابی ہے۔ اور اس کے مقابلہ میں دنیا جمع کرنے کی بے تابی اور بے چینی تکلیف دہ ہے، وہ پریشان کن ہے، وہ راتوں کی نیند اُڑا دیتی ہے۔ لیکن دین کے لئے جو بے تابی ہوتی ہے وہ بڑی مزیدار ہے، بڑی لذیذ ہے۔ اگر انسان ساری عمر اسی بے تابی میں

رہے، تب بھی وہ لذت میں رہے گا، راحت اور سکون میں رہے گا۔ لیکن ہماری ساری زندگی کا پہیہ اُلٹا چل رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہماری فکر کو درست فرمائے، ہمارے دلوں کو درست فرمائے، اور جو راستہ اللہ کے رسول ﷺ نے ہمیں بتایا ہے، اس پر اللہ تعالیٰ ہمیں چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔

اسی سلسلے میں آگے یہ حدیثیں آرہی ہیں۔

فتنے کا زمانہ آنے والا ہے

یہ پہلی حدیث حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

((انَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: بَادِرُوْا بِالْأَعْمَالِ الصَّالِحَةِ فَتَكُوْنُ فِتَنٌ كَقِطَعِ اللَّيْلِ الْمُظْلِمِ يُصْبِحُ الرَّجُلُ مُؤْمِنًا وَيُمْسِيْ كَافِرًا وَيُمْسِيْ مُؤْمِنًا وَيُصْبِحُ كَافِرًا يَبِيْعُ دِيْنَهُ بِعَرَضٍ مِّنَ الدُّنْيَا)) (۱)

”نیک عمل جلدی جلدی کرلو، جتنا وقت مل رہا ہے، اس کو غنیمت جانو، اس لئے کہ بڑے فتنے آنے والے ہیں، ایسے فتنے جیسے اندھیری رات کے ٹکڑے“

اس کا مطلب یہ ہے کہ جب اندھیری رات شروع ہوتی ہے، اور اس کا ایک حصہ گزر جاتا ہے تو اس کے بعد آنے والا دوسرا حصہ بھی رات ہی کا حصہ ہوتا ہے، اور اس میں تاریکی اور بڑھتی چلی جاتی ہے، اور پھر تیسرے حصے میں اندھیرا اور بڑھ جاتا ہے۔ اب اگر آدمی اس انتظار میں رہے کہ ابھی مغرب کا وقت ہے، تھوڑی سی تاریکی ہے، کچھ وقت گزرنے کے بعد روشنی ہو جائے گی، اس وقت کام کروں گا تو وہ شخص احمق ہے۔ اس واسطے کہ اب جو وقت گزرے گا تو اور زیادہ تاریکی کا وقت آئے گا۔ لہٰذا سرکارِ دو عالم ﷺ فرما رہے ہیں کہ اگر تمہارے دل میں یہ خیال ہے کہ اور تھوڑا سا وقت گزر جائے پھر کام شروع کروں گا تو یاد رکھو کہ اور وقت جو آنے والا ہے، وہ زیادہ تاریکی والا ہے، آئندہ جو فتنے آنے والے ہیں وہ بھی اندھیری رات کے ٹکڑوں کی طرح ہیں کہ ہر فتنے کے بعد بڑا فتنہ آنے والا ہے۔ پھر آگے فرمایا کہ صبح کو انسان مومن ہوگا اور شام کو کافر ہو جائے گا یعنی ایسے فتنے آنے والے ہیں جو انسان کے ایمان کو سلب کرلیں گے، صبح کو مومن بیدار ہوا تھا، لیکن فتنے کا شکار ہو کر شام کے وقت کافر ہوگیا، اور شام کو مومن تھا، صبح کو کافر ہوگیا، اور یہ کافر اس طرح ہو جائے گا کہ اپنے دین کو دنیا کے تھوڑے سے ساز و سامان کے بدلے میں بیچ ڈالے گا۔ صبح کو مومن اُٹھا تھا اور جب کاروبارِ زندگی میں

(۱) صحيح مسلم، كتاب الإيمان، باب الحث على المبادرة بالأعمال قبل تظاهر الفتن، رقم: ۱۶۹، سنن الترمذي، كتاب الفتن عن رسول الله، رقم: ۲۱۲۱، مسند أحمد، رقم: ۷۶۸۷، رياض الصالحين، ص: ۵۹

پہنچا تو فکر لگی ہوئی تھی دنیا جمع کرنے کی، مال و دولت جمع کرنے کی، اور اس دوران مال حاصل کرنے کا ایک ایسا موقع سامنے آیا جس کے ساتھ شرط یہ تھی کہ دین چھوڑ و تو تمہیں دنیا مل جائے گی۔ اب اس وقت دل میں کشمکش پیدا ہوئی کہ اپنے دین کو چھوڑ کر یہ مال حاصل کرلوں، یا اس مال پر لات مار کر دین کو اختیار کرلوں۔ لیکن چونکہ وہ شخص پہلے سے ٹلانے کا عادی بنا ہوا تھا، اس لئے اس نے سوچا کہ دین کے بارے میں باز پرس معلوم نہیں کب ہوگی؟ کب مریں گے؟ اور کب حشر ہوگا؟ کب ہمارا حساب و کتاب ہوگا؟ وہ تو بعد کی بات ہے، ابھی فوری معاملہ تو یہ ہے کہ یہ مال حاصل کرلو۔ اب وہ دنیا کا ساز و سامان حاصل کرنے کے لئے اپنا دین بیچ ڈالے گا۔ اس لئے فرمایا کہ صبح کو مومن اُٹھا تھا، شام کو کافر ہو کر سویا۔ اللہ تعالیٰ محفوظ رکھے، اللہ تعالیٰ بچائے، آمین۔

''ابھی تو جوان ہیں'' ایک شیطانی دھوکہ

لہٰذا کس چیز کا انتظار کر رہے ہو؟ اگر نیک عمل کرنا ہے اور مسلمان کی طرح زندہ رہنا ہے تو انتظار کس چیز کا؟ جو عمل کرنا ہے بس جلدی کرلو۔ اب ہم سب اپنے اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھ لیں کہ حضور ﷺ کے اس ارشاد پر عمل کر رہے ہیں یا نہیں؟ ہمارے دلوں میں دن رات یہ خیال آتا رہتا ہے کہ اچھا اب نیک عمل کریں گے، اور شیطان یہ دھوکہ دیتا رہتا ہے کہ ابھی تو بہت عمر پڑی ہے، ابھی تو نوجوان ہیں، ابھی تو اُدھیڑ عمر کو پہنچیں گے، اور پھر بوڑھے ہوں گے، پھر اس وقت نیک اعمال شروع کردیں گے۔ نبی کریم سرکارِ دو عالم ﷺ جو حکیم ہیں، اور ہماری رگوں سے واقف ہیں، وہ جانتے ہیں کہ شیطان ان کو اس طرح بہکائے گا۔ اس لئے فرمادیا کہ جلدی جلدی نیکیاں کرلو، اور جو نیک کاموں کی باتیں سن رہے ہو، اس پر عمل کرتے چلے جاؤ۔ کل کا انتظار مت کرو، اس لئے کہ کل آنے والا فتنہ معلوم نہیں تمہیں کہاں پہنچائے گا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کی حفاظت فرمائے۔ آمین۔

نفس کو بہلا کر اس سے کام لو

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب قدس اللہ سرہ فرمایا کرتے تھے کہ نفس کو ذرا دھوکہ دے کر اس سے کام لیا کرو۔ اپنا واقعہ بیان فرمایا کہ روزانہ تہجد پڑھنے کا معمول تھا۔ آخر عمر اور ضعف کے زمانے میں ایک دن بحمد اللہ تہجد کے وقت جب آنکھ کھلی تو طبیعت میں بڑی سستی اور کسل تھا، دل میں خیال آیا کہ آج تو طبیعت بھی پوری طرح ٹھیک نہیں، کسل بھی ہے، اور عمر بھی تمہاری زیادہ ہے، اور تہجد کی نماز کوئی فرض و واجب بھی نہیں ہے، پڑے رہو، اور آج اگر تہجد چھوڑ دو گے تو کیا ہو جائے گا؟ فرماتے ہیں کہ میں نے سوچا کہ بات تو ٹھیک ہے کہ تہجد فرض واجب بھی نہیں ہے، اور طبیعت بھی ٹھیک

نہیں ہے، باقی یہ وقت تو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں قبولیت کا وقت ہے۔

حدیث میں آتا ہے کہ جب رات کا تہائی حصہ گزر جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی خصوصی رحمتیں اہلِ زمین پر متوجہ ہوتی ہیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے منادی پکارتا ہے کہ کوئی مغفرت مانگنے والا ہے کہ اس کی مغفرت کی جائے۔[1]

ایسے وقت کو بیکار گزارنا بھی ٹھیک نہیں ہے، نفس کو بہلادیا کہ اچھا ایسا کرو کہ اُٹھ کر بیٹھ جاؤ اور بیٹھ کر تھوڑی سی دعا کرلو اور دعا کر کے سو جانا، چنانچہ اُٹھ کر بیٹھ گیا اور دعا کرنی شروع کر دی، دعا کرتے کرتے میں نے نفس سے کہا کہ میاں! جب تم اُٹھ کر بیٹھ گئے تو نیند تو تمہاری چلی گئی، اب غسل خانے تک چلے جاؤ، اور استنجاء وغیرہ سے فارغ ہو جاؤ، پھر آرام سے آکر لیٹ جانا۔ پھر جب غسل خانے پہنچا اور استنجاء وغیرہ سے فارغ ہو گیا تو سوچا کہ چلو وضو بھی کرلو، اس لئے کہ وضو کر کے دعا کرنے میں قبولیت کی توقع زیادہ ہے، چنانچہ وضو کرلیا اور بستر پر واپس آکر بیٹھ گیا، اور دعا شروع کر دی، پھر نفس کو بہلایا کہ بستر پر بیٹھ کر کیا دعا ہو رہی ہے، دعا کرنے کی جو تمہاری جگہ ہے، وہیں جا کر دعا کرلو، اور نفس کو جائے نماز تک کھینچ کر لے گیا، اور جا کر جلدی سے دو رکعت تہجد کی نیت باندھ لی۔

پھر فرمایا کہ اس نفس کو تھوڑا سا دھوکہ دے دے کر بھی لانا پڑتا ہے، جس طرح یہ نفس تمہارے ساتھ نیک کام کو ٹلانے کا معاملہ کرتا ہے، اسی طرح تم بھی اس کے ساتھ ایسا ہی معاملہ کیا کرو، اور اس کو کھینچ کھینچ کر لے جایا کرو، انشاء اللہ اس کی برکت سے اللہ تعالیٰ پھر اس عمل کی توفیق عطا فرما دیں گے۔

کہاں سربراہِ مملکت، کہاں شانِ الٰہی

ایک مرتبہ فرمایا کہ صبح فجر کی نماز کے بعد ۲ گھنٹے تک اپنے معمولات، تلاوت، ذکر و اذکار اور تسبیح میں گزارتا ہوں۔ ایک دن طبیعت میں کچھ سُستی تھی، میں نے اپنے دل میں سوچا کہ آج تو یہ کہہ رہے ہو کہ طبیعت میں کسل ہے، سُستی ہے، اُٹھا نہیں جاتا، اچھا یہ بتاؤ کہ اگر کوئی شخص اس وقت سربراہِ مملکت کا پیغام لے کر آئے کہ آپ کو کوئی انعام دینے کے لئے بلایا گیا ہے تو کیا پھر بھی سُستی باقی رہے گی؟ پھر بھی یہ کسل باقی رہے گا؟ نفس نے جواب دیا کہ نہیں، اس وقت تو کسل اور سُستی باقی

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب الدعوات، باب الدعاء نصف اللیل، رقم:۵۸۴۶، صحیح مسلم، کتاب صلاة المسافرین وقصرها، باب الترغیب فی الدعاء والذکر فی آخر اللیل، رقم:۱۲۶۱، سنن الترمذی، کتاب الصلاة، باب ماجاء فی نزول الرب عزوجل الی السماء، رقم:۴۰۸، سنن أبی داؤد، کتاب الصلاة، باب أی اللیل أفضل، رقم:۱۱۲۰، سنن ابن ماجه، کتاب اقامة الصلاة والسنة فیها، باب ماجاء فی أی ساعات اللیل أفضل، رقم:۱۳۵۶، مسند أحمد، رقم:۷۱۹۶

نہیں رہے گی، بلکہ دوڑے دوڑے جائیں گے، اور جا کر انعام وصول کرنے کی کوشش کریں گے۔ اور پھر اپنے نفس کو مخاطب کر کے کہیں کہ یہ وقت بھی اللہ جل جلالہ کے دربار میں حضوری کا وقت ہے، اور حضوری کی برکت سے اللہ تعالیٰ سے انعامات وصول کرنے کا وقت ہے، پھر کہاں کی سستی اور کہاں کا کسل، چھوڑو اس کسل اور سستی کو، بس یہ سوچ کر اپنے دل کو بہلایا، اور اپنے معمولات میں مشغول ہو گیا۔ بہر حال یہ نفس اور شیطان تو انسان کے بہکانے میں لگے ہوئے ہیں، لیکن ان کو بھی بہلایا کرو، اور جلدی سے ان اعمال کو کرنے کی فکر کیا کرو۔

جنت کا سچا طلب گار

دوسری حدیث حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں:

''غزوۂ اُحد کی لڑائی کے دوران جبکہ معرکہ گرم ہے، مسلمان اور کافروں کی لڑائی ہے، حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم قیادت فرما رہے ہیں، مسلمان کم ہیں اور کافر زیادہ ہیں، مسلمان بے سروسامان ہیں، اور کافر مسلح ہیں، اور ہر لحاظ سے معرکہ سخت ہے۔ اس وقت میں ایک دیہاتی قسم کا آدمی کھجوریں کھاتا جا رہا تھا، اس نے آکر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ یا رسول اللہ! یہ لڑائی جو آپ کروا رہے ہیں اس میں اگر ہم قتل ہو گئے تو ہمارا انجام کیا ہوگا؟ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا کہ اس کا انجام جنت ہے، سیدھے جنت میں جاؤ گے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے اس کو دیکھا کہ وہ کھجوریں کھاتا جا رہا تھا، لیکن جب اس نے یہ سنا کہ اس کا انجام جنت ہے تو کھجوریں پھینک کر سیدھا لڑائی میں گھس گیا، یہاں تک کہ اسی میں شہید ہو گیا''(۱)

اس لئے کہ جب اس نے سن لیا کہ اس جہاد کا انجام جنت ہے تو پھر اتنی تاخیر بھی گوارا نہیں کہ وہ ان کھجوروں کو پورا کر کے پھر جہاد میں شریک ہو۔ اور اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس کو جنت کے مقام تک پہنچا دیا۔ یہ اسی کی برکت تھی کہ نیکی کا جو داعیہ پیدا ہوا، اس پر عمل کرنے میں تاخیر نہیں کی، بلکہ فوراً آگے بڑھ کر اس پر عمل کر لیا۔

اذان کی آواز سن کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حالت

حضرت عائشہ علیہا السلام سے ایک صحابی نے پوچھا کہ اُمّ المؤمنین! سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم گھر کے

(۱) صحيح البخاري، كتاب المغازي، باب غزوة أحد، رقم: ۳۷٤۰، صحيح مسلم، كتاب الإمارة، رقم: ۳۵۱۸، سنن النسائي، كتاب الجهاد، رقم: ۳۱۰۳، مسند أحمد، رقم: ۱۳۷۹٤

باہر جو ارشادات فرماتے ہیں، اور گھر کے باہر جیسی زندگی گزارتے ہیں وہ تو ہم سب کو پتہ ہے، لیکن یہ بتایئے کہ گھر میں کیا عمل کرتے ہیں؟ (ان کے ذہن میں یہ ہوگا کہ گھر میں جا کر مصلیٰ بچھاتے ہوں گے، اور نماز اور ذکر واذکار اور تسبیح وغیرہ میں مشغول رہتے ہوں گے) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا:

> ''جب آپ گھر میں تشریف لاتے ہیں تو ہمارے ساتھ ہمارے گھر کے کاموں میں ہاتھ بھی بٹاتے ہیں، اور ہمارا دکھ درد بھی سنتے ہیں، ہمارے ساتھ خوش طبعی کی باتیں بھی کرتے ہیں، ہمارے ساتھ گھلے ملے رہتے ہیں۔ البتہ ایک بات ہے کہ جب اذان کی آواز کان میں پڑتی ہے تو اس طرح اُٹھ کر چلے جاتے ہیں جس طرح ہمیں پہچانتے بھی نہیں''(۱)

اعلیٰ درجے کا صدقہ

تیسری حدیث حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں:

"جَاءَ رَجُلٌ إِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! أَيُّ الصَّدَقَةِ أَعْظَمُ أَجْرًا؟ قَالَ ((أَنْ تَصَدَّقَ وَأَنْتَ صَحِيْحٌ شَحِيْحٌ تَخْشَى الْفَقْرَ وَتَأْمُلُ الْغِنٰى وَلَا تُمْهِلُ حَتّٰى إِذَا بَلَغَتِ الْحُلْقُوْمَ قُلْتَ: لِفُلَانٍ كَذَا وَلِفُلَانٍ كَذَا وَقَدْ كَانَ لِفُلَانٍ)) (۲)

ایک صاحب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے، اور پوچھا کہ سب سے زیادہ ثواب والا صدقہ کون سا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ سب سے اعلیٰ درجہ کا صدقہ یہ ہے کہ تم اپنی صحت کی حالت میں صدقہ کرو، اور ایسے وقت میں صدقہ کرو جب تمہارے دل میں مال کی محبت ہو، اور دل میں یہ خیال ہو کہ یہ مال ایسی چیز نہیں ہے کہ اسے یونہی لٹا دیا جائے، اور مال خرچ کرنے میں تکلیف بھی ہو رہی ہو اور یہ بھی اندیشہ ہو کہ اس صدقہ کرنے کے نتیجے میں بعد میں فقر کا شکار ہو جاؤں گا، اور بعد میں معلوم نہیں کیا حالات ہوں گے؟ اس وقت جو صدقہ کرو گے وہ بڑا اجر والا ہوگا۔ اس کے بعد فرمایا کہ صدقہ دینے کا دل میں خیال آیا ہے تو اس کو ٹلاؤ نہیں۔

---

(۱) صحيح البخاری، كتاب النفقات، باب خدمة الرجل فی أهله، رقم: ٤٩٤٤، سنن الترمذی، كتاب صفة القيامة والرقائق، رقم: ٢٤١٣، مسند أحمد، رقم: ٢٣٠٩٣

(۲) صحيح البخاری، كتاب الوصايا، باب الصدقة عند الموت، رقم: ٢٥٤٣، صحيح مسلم، كتاب الزكاة، رقم: ١٧١٣، سنن النسائی، كتاب الزكاة، رقم: ٢٤٩٥، سنن أبی داؤد، كتاب الوصايا، رقم: ٢٤٨١، رياض الصالحين، ص: ٥٩

اس میں اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ بعض لوگ صدقہ کرنے کوٹلاتے رہتے ہیں، اور یہ خیال کرتے ہیں کہ جب مرنے کا وقت بالکل قریب آجائے گا تو اس وقت کچھ وصیت کر جائیں گے کہ مرنے کے بعد میرا اتنا مال فلاں کو دے دینا، اور اتنا مال فلاں کو دینا، اور اتنا مال فلاں کام میں لگا دینا وغیرہ۔ تو حضور ﷺ فرمارہے ہیں کہ تم تو یہ کہہ رہے ہو کہ اتنا مال فلاں کو دے دینا، ارے اب تو وہ تمہارا مال رہا ہی نہیں، وہ تو کسی اور کا ہو گیا۔ اس لئے کہ شرعی مسئلہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص بیماری کی حالت میں کوئی صدقہ کرے، یا صدقہ کرنے کی وصیت کرے کہ اتنا مال فلاں کو دے دیا جائے، یا کسی شخص کو ہبہ کرے، اور اسی بیماری میں اس کا انتقال ہو جائے تو اس صورت میں صرف ایک تہائی مال کی حد تک صدقہ نافذ ہوگا، اور باقی دو تہائی مال ورثاء کو ملے گا، اس لئے کہ وہ وارثوں کا حق ہے۔ کیونکہ مرنے سے پہلے بیماری ہی میں اس مال کے ساتھ ورثاء کا حق متعلق ہو جاتا ہے۔

سوچا یہ تھا کہ آخری عمر میں جا کر سارا مال کسی صدقۂ جاریہ میں لگا دیں گے تو ساری عمر ثواب ملتا رہے گا۔ حالانکہ وہ تو حالتِ مجبوری کا صدقہ ہے، اور اجر و ثواب والا صدقہ تو وہ ہے جو صحت کے وقت میں مال کی ضرورت اور محبت اور اس کے جمع کرنے کے خیال کے وقت میں کیا جائے۔

وصیت ایک تہائی مال کی حد تک نافذ ہوتی ہے

یہاں یہ بات سمجھ لیجئے کہ بعض لوگ وصیت کے خواہشمند تو ہوتے ہیں کہ صدقۂ جاریہ میں کوئی چیز لگ جائے، اور مرنے کے بعد بھی اس کا ثواب ملتا رہے لیکن اگر وہ اپنی زندگی میں صحت کی حالت میں یہ وصیت لکھ گئے کہ میرے مرنے کے بعد اتنا مال فلاں ضرورت مند کو دے دیا جائے، تو یہ وصیت صرف ایک تہائی کی حد تک نافذ ہوگی، ایک تہائی سے زیادہ میں نافذ نہیں ہوگی، اسی لئے نبی کریم ﷺ فرمارہے ہیں:

''صدقہ کرنے کا داعیہ دل میں پیدا ہوا ہے اس پر ابھی عمل کرلو''

اپنی آمدنی کا ایک حصہ صدقہ کے لئے علیحدہ کر دیجئے

اور اس کا ایک طریقہ میں آپ کے سامنے پہلے بھی بیان کر چکا ہوں، جس کا بزرگوں نے تجربہ بھی کیا ہے۔ اس پر اگر انسان عمل کرلے تو پھر صدقہ کرنے کی توفیق ہو جاتی ہے، ورنہ ہم لوگ تو نیک کام کوٹلانے کے عادی بن چکے ہیں۔ وہ طریقہ یہ ہے کہ آپ کی جو آمدنی ہے اس کا ایک حصہ مقرر کرلیں کہ یہ حصہ اللہ کی راہ میں صدقہ کریں گے اللہ تعالیٰ جتنی توفیق دے، چاہے وہ دسواں حصہ مقرر کریں یا بیسواں حصہ وغیرہ۔ اور پھر جب آمدنی آئے تو اس میں سے وہ مقرر حصہ نکال کر علیحدہ رکھ

دیں اور اس کے لئے کوئی لفافہ بنالیں، اس میں ڈالتے جائیں۔ اب وہ لفافہ خود یاد دلاتا رہے گا کہ مجھے خرچ کرو۔ کسی صحیح مصرف پر لگاؤ، اس کی برکت سے اللہ تعالیٰ خرچ کرنے کی توفیق دے دیتے ہیں۔ ورنہ اگر خرچ کرنے کا موقع سامنے آتا ہے تو آدمی سوچتا رہتا ہے کہ خرچ کروں یا نہ کروں۔ لیکن جب وہ لفافہ موجود ہوگا، اور پہلے سے اس کے اندر پیسے موجود ہوں گے، تو وہ خود یاد دلائے گا، اور موقع سامنے آنے کی صورت میں سوچنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ اگر ہر انسان اپنی حیثیت کے مطابق یہ معمول بنالے تو اس کے لئے خرچ کرنا آسان ہو جائے گا۔

اللہ تعالیٰ کے یہاں گنتی نہیں دیکھی جاتی

یاد رکھو! اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں گنتی اور تعداد نہیں دیکھی جاتی، بلکہ جذبہ اور اخلاص دیکھا جاتا ہے، ایک آدمی جس کی آمدنی سو روپے ہے، وہ اگر ایک روپیہ اللہ کی راہ میں دیتا ہے، وہ اس آدمی کے برابر ہے جس کی آمدنی ایک لاکھ روپے ہے، اور ایک ہزار روپے اللہ کی راہ میں دیتا ہے، اور کچھ پتہ نہیں کہ وہ ایک روپیہ دینے والا اپنے اخلاص کی وجہ سے اس سے بھی آگے بڑھ جائے۔ اس واسطے گنتی کو نہ دیکھو۔ بلکہ یہ دیکھو کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے راستے میں صدقہ کرنے کی فضیلت حاصل کرنی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی رضامندی حاصل کرنی ہے تو پھر اپنی آمدنی کا تھوڑا سا حصہ اللہ کی راہ میں ضرور خرچ کردو۔

میرے والد ماجد قدس اللہ سرہ کا معمول

میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس اللہ سرہ ہمیشہ محنت سے حاصل ہونے والی آمدنی کا بیسواں حصہ اور بغیر محنت کے حاصل ہونے والی آمدنی کا دسواں حصہ علیحدہ لفافے میں رکھ دیا کرتے تھے۔ اور آپ کا یہ ساری زندگی کا معمول تھا، اگر ایک روپیہ بھی کہیں سے آیا تو اسی وقت اس کا دسواں حصہ نکال کر اس کی ریزگاری کرا کر اس لفافے میں ڈال دیتے، اور اگر سو روپے آئے ہیں تو دس روپے ڈال دیتے، وقتی طور پر اگرچہ اس عمل میں تھوڑی سی دشواری ہوتی تھی کہ فی الحال ٹوٹے ہوئے پیسے موجود نہیں ہیں، اب کیا کریں، اس کے لئے مستقل انتظام کرنا پڑتا تھا، لیکن ساری عمر کبھی اس عمل سے تخلف نہیں دیکھا اور میں نے وہ تھیلا کبھی ساری عمر بھی خالی نہیں دیکھا ـــــ الحمدللہ ـــــ اس عمل کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب آدمی اس طرح نکال نکال کر الگ کرتا رہتا ہے تو وہ تھیلا خود یاد دلاتا رہتا ہے کہ مجھے خرچ کرو، اور کسی صحیح مصرف پر لگاؤ۔ اللہ تعالیٰ اس کی برکت سے خرچ کرنے کی توفیق عطا فرمادیتے ہیں۔

ہر شخص اپنی حیثیت کے مطابق صدقہ کرے

ایک صاحب ایک مرتبہ کہنے لگے کہ صاحب! ہمارے پاس تو کچھ ہے نہیں، ہم کہاں سے خرچ کریں؟ میں نے عرض کیا کہ ایک روپیہ ہے؟ اور ایک روپیہ میں سے ایک پائی نکال سکتے ہو؟ فقیر سے فقیر آدمی کے پاس بھی ایک روپیہ ضرور ہوتا ہے، اور ایک روپیہ میں سے ایک پیسہ نکالنے میں کوئی بڑی کمی نہیں ہو جائے گی؟ بس ایک پیسہ نکال دو۔ تو اس شخص کے ایک پیسہ نکالنے میں اور دوسرے شخص کے ایک لاکھ میں سے ایک ہزار نکالنے میں کوئی فرق نہیں۔ اس لئے مقدار کو نہ دیکھو، بلکہ جس وقت جو جذبہ پیدا ہوا، اس پر عمل کرلو۔

یہ ہے اپنی اصلاح کا نسخۂ اکسیر۔ بس اپنے آپ کو ٹلانے سے بچاؤ۔ اگر انسان اس پر عمل کرلے تو انشاء اللہ تعالیٰ اس کی برکت سے اس کے لئے صحیح راہ پر مال خرچ کرنے کے بڑے راستے پیدا ہو جاتے ہیں، اور مال خرچ کرنے کے فضائل حاصل ہو جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کی توفیق عطا فرمائے۔

کس کا انتظار کر رہے ہو؟

عَنْ أَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ، انَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ((بَادِرُوْا بِالْأَعْمَالِ سَبْعًا، هَلْ تَنْتَظِرُوْنَ إِلَّا فَقْرًا مُنْسِیًا، أَوْ غِنًی مُطْغِیًا، اَوْ مَرَضًا مُفْسِدًا، اَوْ هَرَمًا مُفْنِدًا، اَوْ مَوْتًا مُجْهِزًا، اَوِ الدَّجَّالَ فَشَرُّ غَائِبٍ یُنْتَظَرُ، أَوِ السَّاعَةَ، فَالسَّاعَةُ اَدْهٰی وَأَمَرُّ)) أَوْ كَمَا قَالَ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ.(۱)

یہ روایت حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ اس میں "مبادرۃ الی الخیرات" یعنی نیک کاموں کی طرف بڑھنے کی جلدی سے فکر کرنے کے بارے میں فرمایا گیا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((بَادِرُوْا بِالْأَعْمَالِ سَبْعًا))

سات چیزوں کے آنے سے پہلے جلد از جلد اچھے اعمال کرلو، جس کے بعد اچھا عمل کرنے کا موقع نہ ملے گا، اور پھر ان سات چیزوں کو ایک دوسرے انداز سے بیان فرمایا۔

---

(۱) سنن الترمذی، کتاب الزهد عن رسول الله، باب ما جاء فی المبادرة بالعمل، رقم: ۲۲۲۸، مسند أحمد، باقی مسند المکثرین، رقم: ۷۹۵۲، ریاض الصالحین، ص: ۵۹

کیا فقر کا انتظار ہے؟

((هَلْ تَنْتَظِرُوْنَ إِلَّا فَقْرًا مُّنْسِيًا))

''کیا تم نیک اعمال کرنے کے لئے ایسے فقر و فاقے کا انتظار کر رہے ہو جو بھلا دینے والا ہو؟''

جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر اس وقت تمہیں خوش حالی میسر ہے، روپیہ پیسہ پاس ہے، کھانے پینے کی تنگی نہیں ہے، اور عیش و آرام سے زندگی بسر ہو رہی ہے، ان حالات میں اگر تم نیک اعمال کو ٹال رہے ہو تو کیا تم اس بات کا انتظار کر رہے ہو کہ جب موجودہ خوش حالی دور ہو جائے گی، اور خدانہ کرے فقر و فاقہ آ جائے گا، اور اس فقر و فاقے کے نتیجے میں تم اور چیزوں کو بھول جاؤ گے تو اس وقت نیک اعمال کرو گے۔ اگر تمہارا خیال یہ ہے کہ اس خوش حالی کے زمانے میں تو عیش ہے، اور مزے ہیں، اور پھر جب دوسرا وقت آئے گا، تو اس میں نیک عمل کریں گے، تو اس کے جواب میں حضور ﷺ فرما رہے ہیں کہ جب مالی تنگی آ جائے گی تو اس وقت نیک اعمال سے اور دور ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ اس وقت انسان اتنا پریشان ہوتا ہے کہ ضروری کام بھی بھول جاتا ہے۔ قبل اس کے کہ وہ وقت آئے اور تمہیں مالی پریشانی لاحق ہو، معاشی طور پر تنگی کا سامنا ہو، اس سے پہلے پہلے جو کچھ تمہیں خوش حالی میسر ہے، اس کو غنیمت سمجھ کر اس کو نیک عمل میں صرف کرو۔

کیا مالداری کا انتظار ہے؟

آگے فرمایا:

((أَوْ غِنًى مُّطْغِيًا))

''یا تم ایسی مالداری کا انتظار کر رہے ہو جو انسان کو سرکش بنا دے؟''

یعنی اگر اس وقت بہت زیادہ مالدار نہیں ہو اور یہ خیال کر رہے ہو کہ ابھی ذرا مالی تنگی ہے، یا یہ کہ مالی تنگی تو نہیں ہے لیکن دل یہ چاہ رہا ہے کہ ذرا اور پیسے آ جائیں، اور دولت مل جائے، تب نیک اعمال کریں گے۔ یاد رکھو! اگر مالداری زیادہ ہو گئی، اور پیسے بہت زیادہ آ گئے، اور دولت کے انبار جمع ہو گئے تو اس کے نتیجے میں اندیشہ یہ ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ مال و دولت تمہیں اور زیادہ سرکشی میں مبتلا کر دے۔ اس لئے کہ انسان کے پاس جب مال زیادہ ہو جاتا ہے، اور عیش و آرام زیادہ میسر آ جاتا ہے وہ خدا کو بھلا بیٹھتا ہے۔ لہٰذا جو کچھ کرنا ہے ابھی کر لو۔

کیا بیماری کا انتظار ہے؟

((أَوْ مَرَضًا مُفْسِدًا))

''یا ایسی بیماری کا انتظار کر رہے ہو جو تمہاری صحت کو خراب کر دے؟''

یعنی اِس وقت تو صحت ہے، طبیعت ٹھیک ہے، جسم میں طاقت اور قوت ہے۔ اگر اس وقت کوئی عمل کرنا چاہو گے تو آسانی کے ساتھ کر سکو گے، تو کیا نیک عمل کو اِس لئے ٹلا رہے ہو کہ جب یہ صحت رخصت ہو جائے گی اور خدا نہ کرے جب بیماری آ جائے گی تو پھر نیک عمل کریں گے۔ ارے جب صحت کی حالت میں نیک عمل نہیں کر پائے تو بیماری کی حالت میں کیا کرو گے؟ اور پھر بیماری خدا جانے کیسی آ جائے، اور کس وقت آ جائے، تو قبل اس کے کہ وہ بیماری آئے، نیک عمل کرلو۔

کیا بڑھاپے کا انتظار کر رہے ہو؟

((أَوْ هَرَمًا مُفَنِّدًا))

''یا تم سٹھیا دینے والے بڑھاپے کا انتظار کر رہے ہو؟''

اور یہ خیال کر رہے ہو کہ ابھی تو ہم جوان ہیں، ابھی تو ہماری عمر ہی کیا ہے، ابھی تو دنیا میں دیکھا ہی کیا ہے۔ اس جوانی کے زمانے کو ذرا عیش اور لذتوں کے ساتھ گزر جانے دو، پھر نیک عمل کرلیں گے۔ سرکارِ دو عالم ﷺ فرما رہے ہیں کہ کیا تم بڑھاپے کا انتظار کر رہے ہو؟ حالانکہ بعض اوقات بڑھاپے میں انسان کے حواس خراب ہو جاتے ہیں، اور اگر کوئی کام کرنا بھی چاہے تو نہیں کر پاتا، تو قبل اس کے کہ بڑھاپے کا دور آئے اس سے پہلے نیک عمل کرلو۔ بڑھاپے میں تو یہ حالت ہوتی ہے کہ نہ منہ میں دانت اور نہ پیٹ میں آنت، اور اب گناہ کرنے کی طاقت ہی نہ رہی، اس وقت اگر گناہ سے بچ بھی گئے تو کیا کمال کرلیا؟ جب جوانی ہو، طاقت موجود ہو، گناہ کرنے کے سامان موجود ہوں، گناہ کرنے کے اسباب موجود ہوں، گناہ کرنے کا جذبہ دل میں موجود ہو، اس وقت اگر انسان گناہ سے بچ جائے تو درحقیقت یہ ہے پیغمبرانہ طریقہ۔ چنانچہ اسی کے بارے میں شیخ سعدی فرماتے ہیں ؎

وقت پیری گرگ ظالم میشود پرہیزگار
در جوانی توبہ کردن شیوہ پیغمبری

ارے بڑھاپے میں تو ظالم بھیڑیا بھی پرہیزگار بن جاتا ہے۔ وہ اس لئے پرہیزگار نہیں بنا کہ اس کو کسی اخلاقی فلسفے نے پرہیزگار بنا دیا، یا اس کے دل میں خدا کا خوف آ گیا، بلکہ اس لئے پرہیزگار بن گیا کہ اب کچھ کر ہی نہیں سکتا، کسی کو چیر پھاڑ کر کھا نہیں سکتا، اب وہ طاقت ہی باقی نہیں رہی، اس

لئے ایک گوشہ کے اندر پرہیز گار بنا بیٹھا ہے۔ یاد رکھو! جوانی کے اندر توبہ کرنا، یہ ہے پیغمبری کا شیوہ، یہ ہے پیغمبروں کا شِعار۔ حضرت یوسف علیہ السلام کو دیکھئے کہ بھرپور جوانی ہے، طاقت ہے، قوت ہے، حالات میسر ہیں، اور گناہ کی دعوت دی جارہی ہے۔ لیکن اس وقت زبان پر یہ کلمہ آتا ہے:

﴿مَعَاذَ اللّٰهِ إِنَّهٗ رَبِّيْٓ اَحْسَنَ مَثْوَايَ﴾ (۱)

''میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں، بے شک میرا رب بہترین آسرا ہے''

یہ ہے پیغمبری کا شیوہ، کہ انسان جوانی کے اندر گناہ سے تائب ہو جائے، جوانی کے اندر انسان نیک عمل کرے۔ بڑھاپے میں تو اور کوئی کام بن نہیں پڑتا، ہاتھ پاؤں چلانے کی سکت ہی نہیں۔ اب گناہ کیا کرے؟ گناہ کے مواقع ہی ختم ہو گئے۔

اس لئے حضورِ اقدس ﷺ فرماتے ہیں کہ کیا تمہارا یہ خیال ہے کہ جب بوڑھے ہو جائیں گے تب نیک عمل کریں گے، تب نماز شروع کریں گے، اس وقت اللہ کو یاد کریں گے۔ اگر حج فرض ہو گیا تو یہ سوچتے ہیں کہ جب عمر زیادہ ہو جائے گی، تب جائیں گے۔ خدا جانے کتنے دن کی زندگی باقی ہے؟ کتنی مہلت ملی ہوئی ہے؟ بڑھاپا آتا ہے یا نہیں، اگر بڑھاپا آبھی گیا تو معلوم نہیں اس وقت حالات سازگار ہوں، یا نہ ہوں۔ اس لئے اسی وقت کر گزرو۔

کیا موت کا انتظار ہے؟

((أَوْ مَوْتًا مُجْهِزًا))

''یا تم اس موت کا انتظار کر رہے ہو جو اچانک آجائے''

ابھی تو تم نیک اعمال کو ٹلا رہے ہو کہ کل کر لیں گے، پرسوں کر لیں گے، کچھ اور وقت گزر جائے تو شروع کر دیں گے، کیا تمہیں یہ معلوم نہیں ہے کہ موت اچانک بھی آسکتی ہے۔ بعض اوقات تو موت پیغام دیتی ہے، الٹی میٹم دیتی ہے۔ لیکن بعض اوقات بغیر الٹی میٹم کے بھی آجاتی ہے اور آج کی دنیا میں تو حادثات کا یہ عالم ہے کہ کچھ معلوم نہیں، کس وقت انسان کے ساتھ کیا ہو جائے؟ ویسے تو اللہ تعالیٰ نوٹس بھیجتے رہتے ہیں۔

ملک الموت سے ملاقات

ایک حکایت لکھی ہے کہ ایک شخص کی ایک مرتبہ ملک الموت سے ملاقات ہو گئی (خدا معلوم کیسی حکایت ہے، لیکن بہر حال عبرت کی حکایت ہے) تو اس نے حضرت عزرائیل علیہ السلام سے کہا کہ

(۱) یوسف: ۲۳

جناب! آپ کا بھی عجیب معاملہ ہے، جب آپ کی مرضی ہوتی ہے آدھمکتے ہیں۔ دنیا کا قاعدہ تو یہ ہے کہ اگر کسی کو کوئی سزا دینی ہو تو پہلے سے اس کو نوٹس دیا جاتا ہے کہ فلاں وقت تمہارے ساتھ یہ معاملہ ہونے والا ہے، اس کے لئے تیار ہو جانا۔ اور آپ تو نوٹس کے بغیر چلے آتے ہیں۔ حضرت عزرائیل علیہ السلام نے جواب میں فرمایا: ارے بھائی! میں تو اتنے نوٹس دیتا ہوں کہ دنیا میں کوئی بھی نہیں دیتا ہوگا۔ مگر اس کا کیا علاج کہ کوئی نوٹس سنتا ہی نہیں؟ تمہیں معلوم نہیں کہ جب بخار آتا ہے تو وہ میرا نوٹس ہوتا ہے، جب سر میں درد ہوتا ہے وہ میرا نوٹس ہوتا ہے، جب بڑھاپا آتا ہے وہ میرا نوٹس ہوتا ہے، جب سفید بال آجاتے ہیں وہ میرا نوٹس ہوتا ہے، جب آدمی کے پوتے پیدا ہو جاتے ہیں وہ میرا نوٹس ہوتا ہے، تو میں تو مسلسل نوٹس بھیجتا رہتا ہوں، یہ اور بات ہے کہ تم سنتے ہی نہیں۔ یہ ساری بیماریاں اللہ تعالیٰ کی طرف سے نوٹس ہیں کہ دیکھو! وقت آنے والا ہے، قرآن کریم میں فرماتے ہیں:

﴿أَوَلَمْ نُعَمِّرْكُمْ مَّا يَتَذَكَّرُ فِيهِ مَنْ تَذَكَّرَ وَجَآءَكُمُ النَّذِيرُ﴾ (۱)

''یعنی آخرت میں ہم تم سے پوچھیں گے کہ کیا ہم نے تم کو اتنی عمر نہیں دی تھی جس میں اگر کوئی نصیحت حاصل کرنے والا نصیحت حاصل کرنا چاہتا تو نصیحت حاصل کر لیتا، اور تمہارے پاس ڈرانے والا بھی آگیا تھا''

یہ کون ڈرانے والا آیا تھا؟ اس کی تفسیر میں بعض مفسرین نے فرمایا کہ اس سے مراد حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، اس لئے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے آکر لوگوں کو ڈرایا کہ موت کا وقت جب آئے گا تو اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہونا ہوگا۔

بعض مفسرین نے فرمایا کہ ''نذیر'' سے مراد سفید بال ہیں، جب سر میں یا داڑھی میں سفید بال آگئے تو یہ ''نذیر'' ہے۔ یہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے ڈرانے والا آیا ہے کہ اب وقت قریب آرہا ہے، تیار ہو جاؤ۔

اور بعض مفسرین نے فرمایا کہ ''نذیر'' سے مراد ''پوتا'' ہے کہ جب کسی کے یہاں پوتا پیدا ہو جائے تو یہ پوتا ''نذیر'' ہے، ڈرانے والا ہے کہ اب وقت آنے والا ہے، تیار ہو جاؤ۔ اسی کو کسی عربی شاعر نے ایک شعر میں نظم کر دیا ہے کہ ؎

إِذَا الرِّجَالُ وَلَدَتْ أَوْلَادُهَا
وَبَلِيَتْ مِنْ كِبَرٍ أَجْسَادُهَا
وَجَعَلَتْ أَسْقَامُهَا تَعْتَادُهَا
تِلْكَ زُرُوْعٌ قَدْ دَنَا حِصَادُهَا

(۱) الفاطر: ۳۷

یعنی جب انسان کی اولاد کی اولاد پیدا ہو جائے اور بڑھاپے کی وجہ سے اس کا بدن پرانا ہو جائے، اور بیماریاں یکے بعد دیگرے آنے لگیں، کبھی ایک بیماری، کبھی دوسری بیماری، ایک بیماری ٹھیک ہوئی تو دوسری آگئی، تو سمجھ لو کہ یہ وہ کھیتیاں ہیں جن کی کٹائی کا وقت آ گیا ہے۔

بہر حال! سب اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے نوٹس ہیں۔ اگر چہ عادت اللہ یہی ہے کہ یہ نوٹس آتے رہتے ہیں، لیکن بعض اوقات موت اچانک بغیر نوٹس کے بھی آجاتی ہے۔ اسی لئے حضور ﷺ فرما رہے ہیں کہ تم ایسی موت کا انتظار کر رہے ہو جو نوٹس دیئے بغیر اچانک آجائے۔ کیا معلوم کہ کتنے سانس ابھی باقی ہیں۔ اس کا انتظار کیوں کر رہے ہو؟ اس کے بعد فرمایا:

کیا دجال کا انتظار ہے؟

((أَوِ الدَّجَّالَ))

کیا تم دجال کا انتظار کر رہے ہو؟

اور یہ سوچ رہے ہو کہ ابھی تو زمانہ نیک عمل کے لئے سازگار نہیں ہے۔ تو کیا دجال کا زمانہ سازگار ہوگا؟ جب دجال ظاہر ہوگا تو کیا اس فتنے کے عالم میں نیک عمل کر سکو گے؟ خدا جانے اس وقت کیا عالم ہوگا، گمراہی کے کیسے محرکات اور دواعی پیدا ہو جائیں گے، تو کیا تم اس وقت کا انتظار کر رہے ہو؟

((فَشَرُّ غَائِبٍ يُنْتَظَرُ))

یعنی دجال ان دیکھی چیزوں میں بدترین چیز ہے جس کا انتظار کیا جائے، بلکہ اس کے آنے سے پہلے پہلے نیک عمل کر لو، اور آخر میں فرمایا:

کیا قیامت کا انتظار ہے؟

((أَوِ السَّاعَةَ، فَالسَّاعَةُ أَدْهٰى وَأَمَرُّ))

یا پھر قیامت کا انتظار کر رہے ہو؟ تو سن رکھو کہ قیامت جب آئے گی تو اتنی مصیبت کی چیز ہوگی کہ اس مصیبت کا کوئی علاج انسان کے پاس نہیں ہوگا۔ لہٰذا اس کے آنے سے پہلے پہلے نیک عمل کر لو۔

ساری حدیث کا خلاصہ یہ ہے کہ کسی نیک عمل کو ٹلاؤ نہیں، اور آج کے نیک عمل کو کل پر مت چھوڑو، بلکہ جب نیک عمل کا جذبہ پیدا ہو، اس پر فوراً عمل بھی کر لو۔ اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ سب کو اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.

نفلی عبادت کی اہمیت ☆

بعد از خطبہ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ! فَأَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ o بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ o

عشرہ ذی الحجہ میں عبادت

اس سے پچھلے باب میں گناہوں کے برے انجام کو بیان کیا گیا تھا جس پر الحمد للہ بقدر ضرورت بیان ہو چکا اور اب یہ باب اللہ تعالیٰ کی عبادت کی فضیلت کے بیان میں ہے اور حسن اتفاق سے یہ باب آج ذی الحجہ کی پہلی تاریخ کو شروع ہو رہا ہے۔ اور ذی الحجہ کا پہلا عشرہ ایسا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دوسرے دنوں کے مقابلے میں اسے خصوصی امتیاز عطا فرمایا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''رمضان کے بعد کوئی دن ایسا نہیں ہے جس میں اللہ تعالیٰ کو عبادت اتنی پسند ہو جتنی اس عشرہ ذی الحجہ میں ہوتی ہے''

اور پھر اس کی تفصیل یوں بیان فرمائی:

''اس کے ایک دن کا روزہ ایک سال کے روزوں کے برابر ہے اور ایک رات کی عبادت (اجر وثواب کے اعتبار سے) شب قدر کی عبادت کے برابر ہے''(۱)

چونکہ حدیث کے الفاظ عام ہیں اس لئے علماء نے فرمایا ہے کہ خواہ کسی بھی قسم کی عبادت ہو وہ ان دنوں میں جتنی زیادہ انجام دی جائے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے اجر وثواب کی امید ہے۔

عبادت، تخلیق کا بنیادی مقصد

گذشتہ بیانات میں، میں دو باتوں پر کثرت سے زور دیتا رہا ہوں:

☆ اصلاحی مواعظ (۲/۲۳ تا ۴۶) جامعہ دارالعلوم، کراچی۔ یہ بیان عبداللہ بن المبارک کی مایہ ناز کتاب ''کتاب الزھد'' کے ایک حصے کا درس ہے، جس میں مفتی تقی عثمانی صاحب مدظلہ نے اس کتاب کے ایک باب ''باب ماجاء فی فضل العبادۃ'' پر روشنی ڈالی ہے۔

(۱) سنن الترمذی، کتاب الصوم عن رسول الله صلى الله عليه وسلم، باب ماجاء في العمل في أيام العشر، رقم: ۶۸۹، سنن ابن ماجه، كتاب الصيام، باب صيام العشر، رقم: ۱۷۱۸

(۱)　نفلی عبادات کے مقابلے میں گناہوں سے بچنے کی فکر زیادہ اہم ہے۔ اس لئے انسان کو چاہئے کہ اپنی روزمرہ کی زندگی میں گناہوں سے بچنے کا اہتمام کرے۔

(۲)　حقوق العباد کی ادائیگی کا اہتمام کیا جائے کیونکہ لوگوں نے حقوق العباد کو دین ہی سے خارج قرار دے دیا ہے۔

میں متعدد بار عرض کر چکا ہوں کہ دین کے پانچ شعبے ہیں:

(۱) عقائد (۲) عبادت (۳) معاملات (۴) معاشرت (۵) اخلاقیات

لیکن آج کے دور میں لوگوں نے عقائد اور عبادات کی حد تک دین کو محدود کر دیا ہے اور بقیہ تینوں شعبوں کو دین سے بالکل خارج سمجھ لیا ہے۔ اور ان میں بڑے بڑے گناہوں کے مرتکب ہونے کے باوجود اس کے گناہ ہونے کا خیال بھی دل میں نہیں کرتے۔ حالانکہ حقوق العباد کا معاملہ اتنا سنگین ہے کہ جب تک صاحب حق معاف نہ کرے، محض توبہ واستغفار سے وہ گناہ معاف نہیں ہوتا۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ عبادات فی نفسہ اہمیت نہیں رکھتیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کی عبادت خواہ کسی بھی مشروع شکل میں ہو، درحقیقت وہی تخلیقِ انسانی کا بنیادی مقصد ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ﴾ (۱)

''اور میں نے جن وانس کو صرف اپنی عبادت کے لئے پیدا کیا ہے''

فرشتے اور انسان کی عبادت کا فرق

یوں تو تخلیق انسانی سے پہلے فرشتے بھی عبادت کیا کرتے تھے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے انسان کو محض اپنی عبادت کے لئے اس وجہ سے پیدا فرمایا کہ فرشتوں کی عبادت درحقیقت فرشتوں کی طرف سے کسی کمال پر مبنی نہیں، اس لئے کہ ان کے اندر نفسانی خواہشات رکھی ہی نہیں گئیں۔ وہ اگر گناہ کرنا بھی چاہیں تو ان میں اس کی صلاحیت ہی نہیں ہے نہ انہیں بھوک پیاس لگتی ہے، نہ انہیں نیند اور اونگھ آتی ہے اور نہ کوئی دوسری نفسانی خواہش ان کے دل میں آتی ہے۔ جس کام کے لئے انہیں متعین کر دیا گیا وہ اسی کام میں لگے ہوئے ہیں۔ بخلاف انسان کے، کیونکہ اس کی تخلیق کے وقت اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے فرمایا میں ایسی مخلوق پیدا کر رہا ہوں جس میں ہر قسم کے تقاضے ہوں گے، نیکی کے بھی اور بدی کے بھی، بھوک اور پیاس کے بھی اور جنسی خواہشات کے بھی، لیکن اس مخلوق کا کمال یہ ہوگا کہ وہ اپنی ان خواہشات اور جذبات کو قابو میں رکھ کر جب میری عبادت کرے گی تو پھر یہ مخلوق تم سے بھی آگے بڑھ جائے گی۔ تم اگرچہ ہر وقت تسبیح وتقدیس اور عبادت میں لگے ہوئے لیکن یہ انسان ایسا ہوگا کہ اس کی

(۱)　الذاریات: ۵۶

آنکھوں پر نیند کا غلبہ ہوگا اور آرام دہ بستر اس کو خواب راحت کے مزے دینے کی دعوت دے رہا ہوگا اس کے باوجود جب یہ اس بستر کو چھوڑ کر میری یاد اور ذکر و عبادت کی خاطر کھڑا ہو کر مجھے پکارے گا تو اس وقت یہ تم سے بھی بازی لے جائے گا۔ انہی لوگوں کے بارے میں قرآن حکیم میں ارشاد ہے:

﴿تَتَجَافٰى جُنُوبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ خَوْفاً وَطَمَعاً﴾ (۱)

''ان کے پہلو اپنے بستروں سے جدا ہوتے ہیں وہ اپنے پروردگار کو خوف اور طمع کی حالت میں پکارتے ہیں''

انہیں خوف تو اس بات کا ہوتا ہے کہ پتہ نہیں یہ عمل اللہ کے یہاں مقبول بھی ہے یا نہیں، اور امید اس بات کی کہ شاید اللہ تعالیٰ اس عمل کی برکت سے مجھ پر فضل فرمادیں۔

ایک اور مقام پر اللہ رب العزت فرماتے ہیں:

﴿كَانُوا قَلِيلاً مِّنَ اللَّيْلِ مَا يَهْجَعُونَ ٥ وَبِالْأَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُونَ﴾ (۲)

''رات کے حصے میں یہ لوگ کم سوتے ہیں اور صبح کے وقت میں استغفار کرتے ہیں''

پس اصل مقصد یہ ہوا کہ خواہشات کا یہ پتلا اپنے پروردگار کی بندگی کے لئے تیار ہو اور دیگر احکامات کی بجا آوری بھی کرتا رہے۔ اس لئے عبادت کی اہمیت کو کسی طرح کم نہیں کہا جاسکتا۔ اور اگر اللہ تعالیٰ ان عبادات کو صحیح طور پر ادا کرنے کی توفیق عطا فرمادیں تو یہی عبادات نہ صرف یہ کہ انسان کی زندگی کے مقصد کو پورا کرتی ہیں بلکہ انسان کو نفس اور شیطان سے مقابلہ کرنے کی توانائی بھی بخشتی ہیں۔

عبادات کی دو قسمیں

اب یہ بات بھی سمجھ لینا ضروری ہے کہ عبادات کی دو قسمیں ہیں ایک وہ کہ جنہیں انجام دینا ضروری ہے جیسے فرائض اور واجبات، اور کسی درجے میں اس کے اندر سنن مؤکدہ بھی داخل ہیں۔ اور دوسری قسم نفلی عبادت کی ہے یعنی اگر کوئی ان عبادات کو انجام دے رہا ہے تو ثواب پائے اور نہ کرے تو کوئی گناہ نہیں۔

یہ باب اسی دوسری قسم کی عبادات کے بیان میں ہے کہ نوافل بھی انسان کو اپنے معمولات میں کسی حد تک شامل کرنے چاہئیں۔ اور تجربہ ہے کہ نوافل کو اپنے معمولات میں داخل کئے بغیر انسان کو نفس اور شیطان سے مقابلہ کرنے کی پوری قوت حاصل نہیں ہوتی۔

---

(۱) السجدة:۱٦ (۲) الذاریات:۱۷۔۱۸

نوافل، اللہ تعالیٰ کی محبت کا حق

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ فرائض اللہ کی عظمت کا حق ہیں جنہیں انجام دینا ضروری ہے اور نوافل اللہ تعالیٰ کی محبت کا حق ہیں۔ جب کسی سے محبت ہوتی ہے تو انسان صرف قانونی تعلقات پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ اس سے آگے بھی بڑھ کر ملتا ہے۔ مثلاً شوہر اور بیوی کا ایک تعلق ہے، اگر خاوند صرف قانونی تعلقات پورے کرے، مثلاً مہر ادا کردے اور نفقہ دے دیا کرے لیکن میاں بیوی جس طرح رہتے ہیں اس طرح نہیں رہتا تو وہ شخص اگرچہ قانونی تقاضا پورا کر رہا ہے لیکن محبت کا تقاضا پورا نہیں کر رہا جو اصل درکار ہے۔

کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے۔

کچھ اور ہے درکار میری تشنہ لبی کو
ساقی سے میرا واسطۂ جام نہیں ہے

اسی طرح ایک شخص صرف فرائض و واجبات ادا کرتا ہے تو اس کا اگرچہ اللہ تعالیٰ سے قانونی تعلق ہے لیکن یہ تعلق خشک اور کھردرا ہے۔ بخلاف اس شخص کے جو اپنے معمولات میں نوافل کو بھی شامل کر لیتا ہے کہ وہ محبت کے تقاضے کو بھی پورا کرنے والا ہے۔

نوافل کی کثرت کرنے والا اللہ کا قریبی ہے

ایک حدیث قدسی میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

''میرا بندہ نوافل کی جتنی کثرت کرتا جاتا ہے اتنا ہی میرے قریب ہوتا جاتا ہے یہاں تک کہ ایک وقت ایسا آتا ہے کہ میں ہی اس کی زبان بن جاتا ہوں، جس سے وہ بولتا ہے اور میں ہی اس کا پاؤں بن جاتا ہوں جن سے وہ چلتا ہے''(۱)

یعنی بندہ کی زبان پر وہی بات جاری ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ کو محبوب ہوتی ہے۔ ایک اور حدیث میں نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''تم جس شخص کو نوافل کی کثرت کرتے دیکھو تو اس کے قریب ہو جاؤ (یعنی اس کی صحبت اختیار کرو) کیونکہ اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکمت کی باتیں القاء کی جاتی ہیں''(۲)

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب الرقاق، باب التواضع، رقم: ۶۰۲۱

(۲) مشکوۃ المصابیح (۲/۴۴۶)

عبادت کی کثرت، محمود ہے

اس باب کی پہلی حدیث کے راوی حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ ہیں، فرماتے ہیں:

"عَنِ الْحَسَنِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ((رَحِمَ اللّٰهُ قَوْمًا يَحْسَبُهُمُ النَّاسُ بِمَرْضٰى وَمَا هُمْ بِمَرْضٰى)) قَالَ الْحَسَنُ: جَهَدَتْهُمُ الْبَلَاءُ"(۱)

''حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''اللہ تعالیٰ ان لوگوں پر اپنی رحمت نازل فرمائے جنہیں دیکھ کر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ بیمار ہیں حالانکہ حقیقت میں وہ بیمار نہیں ہوتے'' حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا ''عبادت کی کثرت نے ان کے جسموں پر ایسا اثر ڈالا ہے''

نیز ایک اور حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((أَكْثِرُوْا ذِكْرَ اللّٰهِ حَتّٰى يَقُوْلُوْا مَجْنُوْنٌ))(۲)

''اللہ تعالیٰ کی اتنی عبادت کرو کہ لوگ تمہیں مجنون اور دیوانہ کہنے لگیں''

آج کل طعنہ دیا جاتا ہے کہ مولویوں کی عقلیں خراب ہوگئی ہیں کہ دنیا کے مال و دولت اور شان و شوکت کو چھوڑ کر اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے معاملات میں لگے ہوئے ہیں۔ ان حالات میں انسان کو یہ طعنے اپنے لئے خوشخبری سمجھنے چاہئیں کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور عبادت میں جب تمہیں دیوانہ کہا جانے لگے تو یہ اللہ کے یہاں مقبولیت کی علامت ہے۔ اس لئے ان طعنوں سے گھبرانا نہیں چاہئے۔

عبادت میں مشغول شخص کے پاس رک جاؤ

حضرت کعب رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ کہیں سے گذر رہے تھے تو دیکھا کہ ایک شخص قرآن کی تلاوت کر رہا ہے اور اللہ تعالیٰ سے دعا مانگنے میں مشغول ہے۔ یہ دیکھ کر حضرت کعب رضی اللہ عنہ تھوڑی دیر کے لئے ٹھہر گئے اور اس کی تلاوت اور دعاؤں کو سننے لگے۔ اب بظاہر تو اس شخص کے پاس ٹھہرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی اس لئے کہ وہ اپنی عبادت میں مشغول تھا اور یہ اپنے سفر پر جا رہے تھے، انہیں یہاں رک کر

(۱) کتاب الزهد لابن المبارك، رقم:۹۲(۳۱/۱)، جامع الأحاديث، رقم:۱۲۷۲۲(۱۲٤/۱۳)، كنز العمال، رقم:۱٦٥۹۱ (٤۷۰/٦)　(۲) مسند أحمد، رقم:۱۱۲۲٦

اپنی منزل کھوٹی کرنے کی کیا ضرورت؟ لیکن وہ یہ سوچ کر رک گئے کہ جو انسان اللہ کی عبادت میں مشغول ہو، اس کے پاس تھوڑی دیر کھڑے ہو کر اس کی بات سن لینا بھی بعض اوقات انسان کے لئے فائدہ مند ہو جاتا ہے کہ پتہ نہیں یہ اللہ کا کیسا مقبول بندہ ہو اور اس پر اللہ تعالیٰ کی رحمت کی بارش کیسے برس رہی ہو، میں بھی اگر تھوڑی دیر کے لئے رک گیا تو ہو سکتا ہے کہ رحمت کی اس بارش کا ایک چھینٹا مجھ پر بھی پڑ جائے، یہی سبق دینے کے لئے حضرت کعب رضی اللہ عنہ اس شخص کے پاس رکے۔

مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ایک ملفوظ

میں نے اپنے والد ماجد قدس اللہ سرہٗ سے سنا وہ فرماتے تھے کہ جب میں کہیں سے گذر رہا ہوتا ہوں اور اس جگہ کسی کا وعظ ہو رہا ہو خواہ وہ واعظ کتنا ہی معمولی آدمی ہو لیکن میں تھوڑی دیر کے لئے اس کے پاس ضرور رک جاتا ہوں تاکہ اس کی بات اس نیت سے سن لوں کہ شاید اس کے منہ سے کوئی کلمہ ایسا نکل جائے جو میرے دل پر اثر انداز ہو جائے اور اللہ تعالیٰ مجھے اس سے فائدہ پہنچا دے۔ جیسا کہ بعض اوقات ایسا بھی ہوا ہے کہ ایک جملہ انسان کی زندگی کی کایا پلٹنے کے لئے کافی ہو جاتا ہے۔

ایک جملہ نے زندگی بدل ڈالی

حضرت محمد بن مسلمہ قعنبی رحمۃ اللہ علیہ جو کہ بڑے درجے کے محدثین میں سے ہیں اور سنن ابو داؤد میں ان کی بہت سی روایات موجود ہیں۔ وہ ایک مرتبہ کہیں جا رہے تھے، راستے میں ایک شخص جس کا نام شعبہ تھا جو بعد کے بہت بڑے محدّث ہوئے لیکن ابتدائی دور میں ایک آوارہ قسم کے اور فسق و فجور میں مبتلا آدمی تھے، انہوں نے دیکھا کہ ایک محدث گھوڑے پر سوار آ رہا ہے۔ خدا جانے اس کے دل میں کیا داعیہ پیدا ہوا کہ اس نے آگے بڑھ کر ان کے گھوڑے کی باگ پکڑ لی اور بدتمیزی سے کہنے لگا
''یا شیخ! مجھے کوئی حدیث سنا دیجئے!''

انہوں نے کہا ''حدیث سننے کا یہ طریقہ نہیں ہوتا، پھر کسی وقت سن لینا''

اس نے کہا ''نہیں، میں ابھی سنوں گا چاہے صرف ایک حدیث سنا دو''

حضرت محمد بن مسلمہ رحمۃ اللہ علیہ کو غصہ تو بہت آیا لیکن سوچا کہ ایک ایسی حدیث سنا دوں جو اس کے موقع کے لحاظ سے مناسب ہو چنانچہ انہوں نے یہ حدیث سنائی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((اِذَا لَمْ تَسْتَحْيِ فَافْعَلْ مَا شِئْتَ))(۱)

''جب تیرے اندر سے حیا نکل جائے تو جو چاہے کر''

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب أحادیث الأنبیاء، حدیث الغار، (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

شعبہ کہتے ہیں کہ جس وقت یہ حدیث میرے کانوں میں پڑی، اس کا میرے دل پر ایسا اثر ہوا کہ مجھے یوں محسوس ہوا کہ یہ حدیث حضور ﷺ نے میرے ہی بارے میں ارشاد فرمائی ہے۔ اور ایسی چوٹ لگی کہ دل میں اپنی سابقہ زندگی سے توبہ کرنے کا عزم کرلیا اور توبہ کرلی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے انہیں وہ مقام بخشا کہ آج شعبہ بن حجاج کو "امیر المؤمنین فی الحدیث" کہا جاتا ہے۔ معلوم ہوا کہ بعض اوقات ایک جملہ بھی انسان کی زندگی کو بدلنے کے لئے کافی ہوتا ہے۔

مفتی شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی نصیحت

اس لئے میرے والد ماجد قدس اللہ سرہٗ نے اس بات کے ساتھ ساتھ یہ نصیحت بھی فرمائی کہ جب کوئی شخص مولوی اور واعظ بن جاتا ہے تو وہ یہ سوچتا ہے کہ میں تو وعظ کہنے کے لئے ہی پیدا ہوا ہوں۔ وعظ سننے کے لئے تو پیدا نہیں ہوا۔ اس لئے وہ کسی کا وعظ سننے میں کسرِ شان سمجھتا ہے۔ اس لئے تم اپنے دل سے یہ بات نکال دو اور جہاں کہیں نیکی کی بات ہو رہی ہو اور اسے سننے کا موقع بھی ہو تو اسے اس نیت سے سنو کہ شاید اللہ کی رحمت سے کوئی بات میرے دل میں اتر کر اثر انداز ہو جائے اور میری زندگی کی تبدیلی کا سبب بن جائے۔

آج ایسی مثال ملنا مشکل ہے کہ پاکستان کا مفتی اعظم (حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ) ایک معمولی واعظ کا وعظ سن رہا ہے کہ شاید خیر کا کوئی کلمہ اثر کر جائے۔ یہی وہ مقام ہے جو اللہ تعالیٰ اپنے خاص اور مقبول بندوں کو عطا فرماتے ہیں۔

موت سے پہلے عبادت کر لیجئے

غرض یہ کہ حضرت کعب رضی اللہ عنہ اس کی تلاوت اور دعاؤں کو سننے کے بعد جب آگے بڑھے تو فرمایا:

> "شاباش ہے ان لوگوں کو جو اپنے اوپر قیامت کے دن سے پہلے رولیں کیونکہ اگر پہلے نہ رو سکے تو قیامت کے دن رونا پڑے گا جو کوئی کام نہ دے گا" (۱)

مطلب یہ کہ یہ بندہ جو اللہ کے سامنے خشوع وخضوع کا بہترین عمل کر رہا ہے اور وقت آنے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) رقم: ٣٢٢٤، سنن أبي داود، كتاب الأدب، باب في الحياء، رقم: ٤١٦٤، مسند أحمد، رقم: ١٦٤٨٥، مؤطا امام مالك، كتاب النداء للصلاة، باب وضع اليدين احدهما على الأخرى في الصلاة، رقم: ٣٣٩

(۱) كتاب الزهد لابن المبارك، رقم: ٩٦ (١/ ٣٢)

سے پہلے اللہ کے سامنے مناجات کررہا ہے کامیاب شخص ہے۔

قرآن حکیم میں بھی بار بار تاکید کی گئی ہے کہ موت کا وقت آنے سے پہلے عمل صالح کرلو، چنانچہ ارشاد باری ہے:

﴿وَأَنْفِقُوا مِنْ مَّا رَزَقْنَاكُمْ مِنْ قَبْلِ أَنْ يَّأْتِيَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ فَيَقُولَ رَبِّ لَوْلَا أَخَّرْتَنِيْ إِلَى أَجَلٍ قَرِيبٍ فَأَصَّدَّقَ وَأَكُنْ مِنَ الصَّالِحِيْنَ﴾ (۱)

''اور ہمارے دیئے ہوئے مال میں سے خرچ کرو قبل اس کے کہ تم پر موت آجائے اور تم کہو کہ اے اللہ! مجھے تھوڑی سی مہلت اور دے دیجئے کہ دوبارہ دنیا میں جاکر صدقہ خیرات کرکے اور اعمال صالحہ اپنا کر نیکوں میں شمار کیا جاؤں''

﴿وَلَنْ يُّؤَخِّرَ اللّٰهُ نَفْسًا إِذَا جَآءَ أَجَلُهَا وَاللّٰهُ خَبِيْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ﴾ (۲)

''جب کسی کی موت کا وقت آجاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی میعاد میں توسیع نہیں فرماتے''

لہٰذا پہلے ہی اللہ تعالیٰ کے سامنے رورو کر توبہ کرلے اور عبادات میں مشغولیت اختیار کرلے تو یہ قابل تعریف ہے۔

نوافل کی کثرت نے جنتی کا درجہ بڑھا دیا

اس باب کی اگلی حدیث یہ ہے، نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((إِنَّ الدَّرَجَةَ فِي الْجَنَّةِ فَوْقَ الدَّرَجَةِ كَمَا بَيْنَ السَّمَآءِ وَالْأَرْضِ وَإِنَّ الْعَبْدَ لَيَرْفَعُ بَصَرَهُ فَيَلْمَعُ لَهُ بَرْقٌ يَكَادُ وَيَخْطَفُ بَصَرَهُ فَيَقُوْلُ مَا هٰذَا؟ فَيُقَالُ لَهُ هٰذَا نُوْرُ أَخِيْكَ فَيَقُوْلُ أَخِيْ فُلَانٌ كُنَّا نَعْمَلُ فِي الدُّنْيَا جَمِيْعًا وَقَدْ فُضِّلَ عَلَيَّ هٰكَذَا قَالَ فَيُقَالُ لَهُ إِنَّهُ كَانَ أَفْضَلَ مِنْكَ عَمَلًا ثُمَّ يُجْعَلُ فِي قَلْبِهِ الرِّضَا حَتّٰى يَرْضٰى)) (۳)

''جنت میں اللہ تعالیٰ نے مختلف لوگوں کے لئے جو درجات رکھے ہیں، وہ ایسے ہیں کہ ایک درجے سے دوسرے درجے کے درمیان زمین و آسمان کے مابین جتنا فاصلہ ہے۔ جنت میں ایک شخص اپنے درجے کے اندر بیٹھا ہوگا، وہ اپنی نگاہ اوپر کی

(۱) المنافقون: ۱۰ (۲) المنافقون: ۱۱

(۳) کتاب الزھد، رقم: ۱۰۰ (۳۳/۱)، اصل نسخہ میں ''أَفْضَلُ مِنْكَ عَمَلًا'' کی جگہ ''أَفْضَلُ عَمَلًا'' پرنٹ ہوا تھا جو کہ درست نہیں، درست الفاظ وہ ہیں جو یہاں ذکر کئے گئے۔

طرف اٹھائے گا تو اسے ایسا لگے گا جیسے بجلی چمکی اس سے اس کی آنکھیں خیرہ ہو جائیں گی۔ وہ گھبرا کر پوچھے گا کہ یہ کیا چیز ہے؟ تو اسے جواب دیا جائے گا کہ یہ تمہارے فلاں بھائی کا نور ہے (جس بھائی کا درجہ تم سے بلند ہے) تو وہ حیران ہو کر کہے گا کہ ہم تو دنیا میں اکٹھے رہتے تھے اور ہمارا عمل بھی ایک جیسا تھا پھر کیا وجہ ہوئی کہ وہ اتنے بلند درجے پر پہنچ گیا۔ تو اسے جواب دیا جائے گا کہ اس کا عمل تیرے عمل سے افضل تھا اس لئے اللہ تعالیٰ نے اسے یہ مرتبہ عطا فرمایا ہے، پھر اس شخص کے دل میں اسی درجے پر رہنے کے لئے رضامندی ڈال دی جائے گی یہاں تک کہ وہ راضی ہو جائے گا''

اس حدیث میں نبی کریم ﷺ نے یہ بیان فرمایا ہے کہ اپنے عمل کو بڑھانا مقدار اور کیفیت دونوں اعتبار سے مطلوب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ دنیا اسی لئے بنائی ہے کہ انسان اعمال صالحہ میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرے، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَفِیْ ذٰلِكَ فَلْیَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ﴾(۱)

''اور حرص کرنے والوں کو اسی میں حرص کرنی چاہئے''

یعنی یہ جو تم دنیاوی ساز و سامان میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی فکر میں ہو، یہ چیزیں اس لائق نہیں کہ ان میں ایک دوسرے سے مقابلہ کیا جائے بلکہ ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کا مقابلہ تو آخرت کی نعمتوں میں ہونا چاہئے چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَسَارِعُوْا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ﴾(۲)

''اپنے رب کی مغفرت اور اس جنت کی طرف دوڑ لگاؤ جس کا عرض آسمان و زمین کے برابر ہے''

حضرت مسروق رحمۃ اللہ علیہ کی نفلی عبادت

اس باب کی اگلی حدیث ایک تابعی رحمۃ اللہ علیہ کی حالت سے متعلق ہے:

''عَنِ امْرَأَةِ مَسْرُوْقٍ قَالَتْ مَا كَانَ مَسْرُوْقٌ يُوْجَدُ اِلَّا وَسَاقَاهُ قَدِ انْتَفَخَتَا مِنْ طُوْلِ الصَّلَاةِ قَالَتْ وَاللّٰهِ اِنْ كُنْتُ لَاَجْلِسُ خَلْفَهٗ فَاَبْكِیْ رَحْمَةً لَّهٗ''(۳)

''حضرت مسروق رحمۃ اللہ علیہ کی اہلیہ فرماتی ہیں کہ میں نے ساری زندگی مسروق کی

(۱) المطففین: ۲۶　　(۲) آل عمران: ۱۳۳

(۳) کتاب الزہد لابن المبارک، رقم: ۹۵ (۳۱/۱)

پنڈلیوں پر ورم ہی دیکھا۔ اور فرماتی تھیں کہ جب وہ رات کو تہجد کی نماز کے لئے
کھڑے ہوتے تو میں بعض اوقات ان کے پیچھے بیٹھی ہوتی تھی، ان کے قیام کو دیکھ
کر مجھے رونا آجاتا تھا"

حضرت مسروق بن اجدع رحمۃ اللہ علیہ کوفہ کے مشہور فقہاء ومحدثین تابعین میں سے ہیں۔ عربی میں مسروق کا معنی ہے چوری کیا ہوا، چونکہ انہیں بچپن میں کوئی اغوا کر کے لے گیا تھا، اس لئے ان کا لقب مسروق ہوگیا اور وہ اسی نام سے مشہور ہو گئے اور اصلی نام کو سب لوگ بھول گئے۔ ان کی اہلیہ صاحبہ نے ان کی عبادت کا یہ نقشہ کھینچا ہے جو نوافل میں کثرت اہتمام کا تھا۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا کثرت اہتمام نوافل

اس باب کی اگلی حدیث میں ایک مشہور صحابی حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی کثرت اہتمام نوافل سے متعلق ہے جس کے راوی ان کے بیٹے ہیں وہ فرماتے ہیں:

"اِذَا هَدَأَتِ الْعُيُوْنُ قَامَ فَسَمِعْتُ لَهٗ دَوِيًّا كَدَوِيِّ النَّحْلِ حَتّٰى يُصْبِحَ"(۱)

"جب لوگ سونے کے لئے بستروں پر جا کر لیٹ جاتے، میں ان کے بستر کے قریب ہونے کی وجہ سے ان کی آواز سنتا تھا، ایسا لگتا تھا جیسے شہد کی مکھی کی بھنبھناہٹ ہوتی ہے اور یہ آواز ساری رات آتی رہتی تھی یہاں تک کہ صبح ہو جاتی"
(گویا ساری رات اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں کھڑے رہتے)

آج آپ اور ہم ان احادیث اور فقہ سے تو واقف ہیں اور انہیں "أفقہ الصحابۃ" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اور انہیں کے فتاوی پر مذہب حنفی کی بنیاد ہے۔ لیکن ان کی عبادت سے بہت کم لوگ واقف ہیں حالانکہ وہ تو آیت قرآنی ﴿تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ﴾ کے پورے مصداق ہیں۔

ساری عمر عشاء کے وضو سے فجر کی نماز

حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں آپ نے سنا ہوگا کہ وہ تہجد کی نماز باقاعدگی سے پڑھتے تھے۔ ایک مرتبہ کہیں سے گذر رہے تھے کہ ایک بڑھیا نے ان کے بارے میں کہا یہ وہ شخص ہے جو عشاء کے وضو سے فجر کی نماز پڑھتا ہے۔ حالانکہ امام صاحب اس وقت عشاء کے وضو سے فجر کی نماز نہیں پڑھتے تھے لیکن جب اس بڑھیا سے سنا تو غیرت آگئی کہ اللہ کی یہ بندی میرے بارے میں یہ گمان

---

(۱) کتاب الزهد لابن المبارك، رقم: ۹۷ (۱/۳۲)، اصل مرجع میں یہاں "دَوِيًّا كَدَوِيِّ النَّحْلِ" کی جگہ "دَمًا كَدَمِ النَّحْرِ" پرنٹ ہوا ہے جو کہ درست نہیں، درست الفاظ وہ ہیں جو یہاں ذکر کئے گئے۔

رکھتی ہے کہ میں عشاء کے وضو سے فجر کی نماز ادا کرتا ہوں ۔ چنانچہ اسی دن سے یہ عہد کرلیا کہ آئندہ اب میں عشاء کے وضو سے فجر کی نماز پڑھا کروں گا پھر اس کے بعد ساری عمر یہی معمول رہا۔ (۱)

حضرت معاذہ عدویہ رحمۃ اللہ علیہا کی نماز

اور یہ بھی یاد رکھیں! کہ ایسا اہتمام صرف مردوں ہی میں نہیں پایا جاتا تھا بلکہ اس سلسلے میں عورتوں کا بھی کچھ کردار ہے۔ چنانچہ حضرت معاذہ عدویہ رحمہا اللہ جو بڑے درجے کی اولیاء اللہ تابعین خواتین میں سے ہیں ان کا ایک مقولہ مشہور ہے:

"اِنِّیْ أَعْجَبُ مِنْ أَعْیُنٍ تَنَامُ عَلَی الْمَرْجِعِ وَتَعْلَمُ دُوْنَ رِکَابِهَا فِی الْقُبُوْرِ"

''مجھے ان آنکھوں پر تعجب ہے جو رات کو سو جاتی ہیں حالانکہ انہیں معلوم ہے کہ قبر میں جا کر سونا ہی سونا ہے''

حضرت محمد بن سیرین رحمۃ اللہ علیہ کی گریہ وزاری

حضرت محمد بن سیرینؒ جو بڑے درجے کے تابعین میں سے ہیں اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے شاگرد ہیں۔ ان کے بارے میں لکھا ہے یہ بڑے ظریف المزاج اور شگفتہ آدمی تھے۔ ان کے ایک شاگرد کہتے ہیں کہ دن کے وقت تو ہم ان کے ہنسنے کی آواز سنتے تھے لیکن رات کے وقت ان کے رونے کی آواز سنتے تھے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تہجد

حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ رات کے وقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تہجد کی نماز میں اتنی دیر تک کھڑے رہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قدم مبارک تھک گئے اور ان سے خون رسنے لگا۔ لوگوں نے عرض کیا ''یا رسول اللہ! اللہ نے تو آپ کے اگلے پچھلے سب گناہ معاف فرما دیئے ہیں پھر آپ اتنی مشقت کیوں برداشت کرتے ہیں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا'' کیا میں اللہ تعالیٰ کا شکر گزار بندہ نہ بنوں؟'' (۲)

---

(۱) الخیرات الحسان فی مناقب الامام ابی حنیفة النعمان، ص: ۸۳

(۲) صحیح البخاری، کتاب الجمعة، باب قیام النبی اللیل حتی ترم قدماه، رقم: ۱۰۶۲، صحیح مسلم، کتاب صفة القیامة والجنة والنار، باب اکثار الاعمال (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

جب اس نے میرے سارے گناہ معاف کردیئے تو پھر محبت کا تقاضا بھی یہ ہے کہ میں بھی اتنی ہی زیادہ محنت اور عبادت کروں۔

حضرت عبداللہ بن شخیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

"أَتَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهُوَ يُصَلِّيْ وَلِجَوْفِهِ أَزِيْزٌ كَأَزِيْزِ الْمِرْجَلِ"(۱)

"ایک مرتبہ میں حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، آپ ﷺ نماز پڑھ رہے تھے اور آپ ﷺ کے بطن مبارک سے ہانڈی پکنے کی طرح آواز آرہی تھی"

مطلب یہ کہ نماز کی حالت میں اللہ تعالیٰ کے سامنے رونے اور گریہ وزاری کی وجہ سے اس قسم کی آواز نکلتی تھی۔ اس کے بعد صحابہ کرام اور تابعین عظام نے اس طریقے کو اپنانے کی بھرپور کوشش کی اور امت کو عمل کرکے دکھایا۔

آپ ﷺ کی طویل نماز

اس باب کی اگلی حدیث چونکہ طویل ہے اس لئے میں اس کا خلاصہ عرض کردیتا ہوں:

"حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ میں نے ایک مرتبہ رات کو آپ ﷺ کے ساتھ نماز پڑھی پس جب آپ ﷺ نے تکبیر کہی تو یہ کلمات بھی فرمائے:

((ذُوالْمَلَكُوْتِ وَالْجَبَرُوْتِ وَالْكِبْرِيَاءِ وَالْعَظَمَةِ))

اس کے بعد قرآن مجید کی تلاوت شروع کی اور ایک رکعت میں پوری سورۂ بقرہ پڑھی۔ اس کے بعد اتنا ہی طویل رکوع کیا جتنی طویل قرأت کی تھی اور رکوع میں "سبحان ربی العظیم" پڑھتے رہے، پھر رکوع سے سر اٹھایا اور رکوع کے برابر طویل قومہ کیا اور اس میں "لربی الحمد" پڑھتے رہے۔ پھر اتنا ہی طویل سجدہ کیا اور اس

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) والاجتهاد فی العبادة، رقم:٥٠٤٤، سنن الترمذی، كتاب الصلاة، باب ماجاء فی الاجتهاد فی الصلاة، رقم:٣٧٧، سنن النسائی، كتاب قيام الليل وتطوع النهار، باب الاختلاف على عائشة فی احياء الليل، رقم:١٦٢٦، سنن ابن ماجه، كتاب اقامة الصلاة والسنة فيها، باب ماجاء فی طول القيام فی الصلاة، رقم:١٤٠٩، مسند أحمد، رقم:١٧٤٨٨

(١) سنن النسائی، كتاب السهو، باب البكاء فی الصلاة، رقم:١١٩٩، سنن أبی داود، كتاب الصلاة، باب البكاء فی الصلاة، رقم:٧٦٩، مسند أحمد، رقم:١٥٧٢٢ شمائل الترمذی، باب فی بكاء رسول الله صلی الله عليه وسلم، ص:٢٣

میں ''سبحان ربی الاعلی'' پڑھتے رہے۔ پھر جلسہ میں اتنی دیر بیٹھے رہے جتنی دیر میں سجدہ کیا تھا اور اس میں ''رب اغفرلی'' پڑھتے رہے، یہاں تک کہ ایک رکعت اسی طرح پوری فرمائی پھر دوسری رکعت میں سورۂ آل عمران، تیسری میں سورۂ نساء اور چوتھی میں سورۂ مائدہ پڑھی، یعنی چار رکعتوں میں سوا چھ پارے اس طرح تلاوت فرمائے کہ ان میں رکوع، قیام، سجدہ، جلسہ اور قرأت وغیرہ یکساں طویل تھے''(۱)

اس حدیث کو سن کر بعض اوقات یہ خیال ہوتا ہے کہ ایسا کرنا تو ہمارے بس سے باہر ہے، یاد رکھیں! کہ یہ مسلمانوں کو غیرت دلانے کے لئے ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو بھی انسان بنا کر بھیجا تھا اور ہماری طرح انسانی تقاضے آپ ﷺ کے ساتھ بھی وابستہ تھے لیکن سب سے بلند مقام پر فائز ہونے کے باوجود اتنی طویل عبادت فرماتے تھے۔ تو اگر ہم اس مقام تک نہیں پہنچ سکتے تو کچھ نہ کچھ تو کر ہی لیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ اس حدیث میں رات کی نماز کا ادب بیان کر دیا گیا ہے کہ قیام، قرأت، رکوع، سجدے وغیرہ طویل کئے جائیں۔

عبادت میں کون سی صورت بہتر ہے؟

اب یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جس شخص کو تہجد کی نماز کے لئے مثلاً ایک گھنٹہ ملتا ہے تو اب اس میں وہ رکعتیں کثیر پڑھے یا رکعتیں کم پڑھے اور قرأت طویل کرے، ان میں سے کون سی صورت زیادہ بہتر ہے؟

یاد رکھیں! اس پر قول فیصل یہ ہے کہ اپنا معمول تو پورا کرنا ضروری ہے اور اس میں یہ نہ سوچے کہ وقت ابھی زیادہ ہے اس لئے میں زیادہ رکعتیں پڑھ لوں، بلکہ قیام و قرأت وغیرہ طویل کرے۔ تہجد کی نماز میں لمبی لمبی سورتیں پڑھنا زیادہ بہتر ہے لیکن اگر وہ یاد نہ ہوں تو ایک ہی رکعت میں چھوٹی دس سورتیں یا اس سے زائد بھی پڑھی جا سکتی ہیں۔ نیز یہ بھی گنجائش ہے کہ ایک رکعت میں ایک ہی آیت یا سورت کو بار بار پڑھ لیا جائے۔

چنانچہ حدیث میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ حضور ﷺ نے ساری رات ایک آیت پڑھتے ہوئے گزار دی جو یہ تھی:

---

(۱) سنن النسائی، کتاب التطبیق، باب الدعاء بین السجدتین، رقم:۱۱۳۳، سنن أبی داؤد، کتاب الصلاۃ، باب مایقول الرجل فی رکوعه وسجوده، رقم:۷۴۰، مسند أحمد، رقم:۲۲۲۸٦، کتاب الزهد، رقم:۱۰۱(۳۳/۱)

﴿إِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَإِنَّهُمْ عِبَادُكَ وَإِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَإِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ﴾(۱)

''(اے اللہ!) اگر آپ انہیں عذاب دیں تو وہ آپ کے بندے ہیں اور اگر آپ معاف کر دیں تو آپ ہی زبردست حکمت والے ہیں''(۲)

نیز رکوع اور سجدہ کو بھی قیام کے برابر طویل کرے اور رکوع وسجود میں یہ بھی جائز ہے کہ سبحان ربی العظیم اور سبحان ربی الاعلی کی ایک مقدار پڑھنے کے بعد ادعیہ ماثورہ مانگ لے جیسے:

﴿رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ﴾(۳)

اسی طرح آٹھ رکعتیں پڑھنا زیادہ رکعتوں کے پڑھنے سے زیادہ بہتر ہے جب کہ مندرجہ بالا ہدایات کی پیروی کی جائے۔

امامت کی نماز میں تخفیف کا حکم

جب کہ عام نمازوں کے بارے میں حضور ﷺ کا یہ معمول نقل کیا گیا ہے کہ اتنی ہلکی پھلکی نماز پڑھاتے تھے کہ ضعیف ترین شخص کو بھی مشقت کا احساس نہیں ہوتا تھا، اور آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((اِذَا أَمَّ أَحَدُكُمْ لِلنَّاسِ فَلْيُخَفِّفْ))(۴)

''تم میں سے جو کوئی امامت کرائے وہ اپنی نماز کو ہلکا کر دے''

کیونکہ نماز میں ضعیف، بیمار اور بوڑھے وغیرہ ہر قسم کے لوگ ہوتے ہیں، اب اگر وہاں سورۂ بقرہ شروع کر دی جائے تو لوگوں کو کتنی تکلیف ہوگی۔ اسی لئے آپ ﷺ نے یہاں تک فرمادیا:

---

(۱) المائدة: ۱۱۸

(۲) سنن النسائی، کتاب الافتتاح، باب ترديد الآية، رقم: ۱۰۰۰، سنن ابن ماجه، کتاب اقامة الصلاة والسنة فيها، باب ماجاء في القراءة في صلاة الليل، رقم: ۱۳٤۰

(۳) البقرة: ۲۰۱، اس قرآنی دعا کا ترجمہ یہ ہے: ''اے ہمارے پروردگار! ہمیں دنیا میں بھی بھلائی عطا فرما اور آخرت میں بھی بھلائی، اور ہمیں دوزخ کی آگ سے بچالے''

(٤) صحيح البخاری، کتاب الاذان، باب اذا صلى لنفسه فليطول ماشاء، رقم: ٦٦٢، صحيح مسلم، كتاب الصلاة، باب أمر الأئمة بتخفيف الصلاة في تمام، رقم: ٧١٤، سنن الترمذی، کتاب الصلاة، باب ماجاء اذا أم أحدكم الناس فليخفف، رقم: ٢١٩، سنن النسائی، کتاب الامامة، باب ماعلى الامام من التخفيف، رقم: ٨١٤، سنن أبی داؤد، كتاب الصلاة، باب في تخفيف الصلاة، رقم: ٦٧٣، مسند أحمد، رقم: ٧١٦٢

((اِنِّیْ لَأَسْمَعُ بُکَاءَ الصَّبِیِّ وَأَنَا فِی الصَّلَاۃِ فَأُخَفِّفُ مَخَافَةَ أَنْ تُفْتَتَنَ أُمُّهُ)) (۱)

''بعض اوقات نماز پڑھتے ہوئے مجھے کسی بچے کے رونے کی آواز سنائی دیتی ہے تو میں اپنی نماز کو ہلکا کر دیتا ہوں، تاکہ اس کی ماں پریشان نہ ہو جائے''

حاصل یہ ہے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم تنہائی میں نماز کو طویل فرماتے تھے اور امامت میں نماز کے اندر تخفیف فرماتے، جب کہ آج معاملہ بالکل برعکس ہے کہ لوگوں کے سامنے تو لمبی چوڑی نمازیں پڑھی جاتی ہیں اور تنہائی میں جلد از جلد فارغ ہونے کی کوشش کی جاتی ہے۔

تہجد کی عبادت ایک سلطنت ہے

تہجد کی نماز کے بارے میں حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

آزانکہ کہ یافتم خبر از ملک نیم شب
من ملک نیم روز بیک جو نمی خرم

''جب سے مجھے رات کی یہ بادشاہت ملی ہے اس وقت سے میں نیم روز کی سلطنت ایک دمڑی میں خریدنے کے لئے بھی تیار نہیں ہوں''

تہجد کی لذت، سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ کی نظر میں

حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں رات کی نماز میں جو لذت اور کیف عطا فرمایا ہے اگر دنیا کے بادشاہوں کو پتہ لگ جائے کہ یہ مزے اڑا رہے ہیں تو وہ ہمارے پاس تلواریں سونت کر آئیں اور ہم سے یہ مزہ چھین کر خود حاصل کرنے کی کوشش کریں، لیکن انہیں اس مزے کی ہوا بھی نہیں لگی۔

نمازِ تہجد کا عادی بننے کا سہل ترین نسخہ

حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ''جس شخص کو اللہ تعالیٰ تہجد کی نماز کا عادی بنا دیتے ہیں وہ تو اللہ کے فضل سے اس وقت کی برکات حاصل کر لیتے ہیں، لیکن ہم میں سے بہت سے

(۱) سنن الترمذی، کتاب الصلاۃ، باب ماجاء أن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال انی لأسمع بکاء الصبی......، رقم: ۳۴، سنن ابن ماجه، کتاب اقامة الصلاة والسنة فیها، باب الامام یخفف الصلاة اذا حدث أمر، رقم: ۹۷۹

کمزور لوگ وہ بھی ہیں جو اس عمل نماز کے عادی نہیں ہیں اور رات کے وقت اٹھنا انہیں کسی وجہ سے بھاری معلوم ہوتا ہے، اگرچہ دل چاہتا ہے لیکن عادت نہ ہونے کی وجہ سے اٹھ نہیں پاتے، ایسے شخص کو چاہئے کہ وہ دو کام کرے، اللہ تعالیٰ ان کی برکت سے یا تو تہجد کی توفیق عطا فرمادیں گے یا اس کی کچھ نہ کچھ برکت ضرور عطا فرمائیں گے:

(۱) عشاء کی نماز پڑھنے کے بعد سنتوں اور وتر کے درمیان چار رکعت نماز تہجد کی نیت سے پڑھ لیا کرے۔

(۲) طے کرلے کہ رات کے جس حصے میں بھی میری آنکھ کھلے گی تھوڑی دیر کے لئے بستر سے اٹھ جاؤں گا۔

کیونکہ حدیث میں آتا ہے کہ جب رات کا ایک تہائی حصہ گذر جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی خصوصی رحمت دنیا پر نازل ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کا منادی پکار پکار کر کہتا ہے کہ ہے کوئی مغفرت مانگنے والا، میں اس کی مغفرت کردوں، کوئی رزق مانگنے والا ہے کہ میں اسے رزق دے دوں، ہے کوئی مبتلائے آزار کہ میں اس کی مصیبت دور کردوں۔ (۱)

پھر یہ نداء ساری رات ہوتی رہتی ہے۔ بس وہ یہ سوچ کر اٹھے کہ میں اس منادی کو جواب دوں گا اور بستر پر اٹھ کر بیٹھ جائے اور خواہ وضو اور نماز کے بغیر ہی اپنی قضائے حاجات کی دعا مانگ لیا کرے، اور اسی میں یہ دعا بھی مانگ لیا کرے کہ یا اللہ! مجھے صلاۃ اللیل کی توفیق بھی عطا فرمادیجئے، اس کے بعد سو جائے۔

اگر اس عمل کو کوئی شخص باقاعدگی سے کرتا رہے کہ ان شاء اللہ صلاۃ اللیل سے محروم نہیں ہوگا اور کبھی نہ کبھی اس کو توفیق ہو ہی جائے گی۔ اور اگر بالفرض توفیق نہ ہوئی تب بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت سے امید ہے کہ وہ اسے صلاۃ اللیل کی برکات سے محروم نہیں فرمائے گا۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب الدعوات، باب الدعاء نصف اللیل، رقم:۵۸۴۶، صحیح مسلم، کتاب صلاۃ المسافرین وقصرها، باب الترغیب فی الدعاء والذکر فی آخر اللیل، رقم:۱۲۶۱، سنن الترمذی، کتاب الصلاۃ، باب ماجاء فی نزول الرب عزوجل الی السماء، رقم:۴۰۸، سنن أبی داؤد، کتاب الصلاۃ، باب أی اللیل أفضل، رقم:۱۱۲۰، سنن ابن ماجه، کتاب اقامة الصلاۃ والسنة فیها، باب ماجاء فی أی ساعات اللیل أفضل، رقم:۱۳۵۶، مسند أحمد، رقم:۷۱۹۶

نماز کی اہمیت ☆

بعد از خطبہ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ! فَأَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ○ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ○
﴿قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ○ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ○ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ○ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ○﴾ (۱)

بزرگانِ محترم و برادرانِ عزیز! جو آیات میں نے آپ کے سامنے تلاوت کیں، یہ سورۃ مؤمنون کی آیات ہیں۔ ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے ان مؤمنوں کی صفات بیان فرمائی ہیں جن سے فلاح کا وعدہ کیا گیا ہے، اگر یہ صفات کسی کو حاصل ہو جائیں تو اس کو فلاح حاصل ہو گئی یعنی اس کو دنیا میں بھی کامیابی حاصل ہو گئی اور آخرت میں بھی کامیابی حاصل ہو گئی۔

خشوع اور خضوع کا مفہوم

اللہ تعالیٰ نے پہلی صفت یہ بیان فرمائی کہ فلاح پانے والے مؤمن بندے وہ ہیں جو اپنی نماز میں خشوع اختیار کرتے ہیں۔ مؤمن کے تمام کاموں میں سب سے زیادہ اہم کام نماز کی ادائیگی ہے، اسی لئے یہاں پر اللہ تعالیٰ نے مؤمن کی صفات میں سب سے پہلے ''نماز میں خشوع'' کی صفت ذکر فرمائی ہے۔ عام طور پر دو لفظ نماز کے اوصاف کے سلسلے میں بولے جاتے ہیں۔ ایک خضوع اور دوسرا خشوع، ''خضوع'' ضاد سے ہے اور ''خشوع'' شین سے ہے۔ ''خضوع'' کے معنی ہیں: انسان کا اپنے ظاہری اعضاء کو اللہ تعالیٰ کے سامنے جھکا دینا۔ اور ''خشوع'' کے معنی ہیں: انسان کا اپنے دل کو اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ کر دینا۔ نماز میں دونوں چیزیں مطلوب ہیں یعنی نماز میں خضوع بھی ہونا چاہئے اور خشوع بھی ہونا چاہئے۔

''خضوع'' کی حقیقت

''خضوع'' کے لفظی معنی ہیں ''جھک جانا'' یعنی اپنے آپ کو نماز میں اللہ تعالیٰ کے سامنے اس

☆ اصلاحی خطبات (۱۴/۱۹۲ تا ۲۰۲)، بعد از نمازِ عصر، جامع مسجد بیت المکرّم، کراچی

(۱) المؤمنون: ۱ تا ٤

طرح کھڑا کرنا کہ تمام اعضاء اللہ تعالیٰ کے سامنے جھکے ہوئے ہوں، غفلت اور لاپرواہی کا عالم نہ ہو بلکہ اللہ تعالیٰ کے سامنے باادب کھڑا ہو۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ نماز میں کھڑے ہونے کا کونسا طریقہ باادب ہے اور کونسا طریقہ بے ادب ہے؟ اس کا فیصلہ ہم اپنی عقل سے نہیں کر سکتے بلکہ اس کی تفصیل خود نبی کریم ﷺ نے بیان فرمادی ہے۔ لہٰذا نماز پڑھنے کا ہر وہ طریقہ جو نبی کریم ﷺ کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق ہو، وہ باادب ہے اور جو طریقہ آپ کے بتائے ہوئے طریقے کے خلاف ہو، وہ بے ادب ہے۔ اس لئے نماز اس طریقے سے پڑھنی چاہئے جس طریقے سے رسولِ کریم ﷺ نے سکھائی۔ ایک مرتبہ نماز کے بعد آنحضرت ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے فرمایا:

((صَلُّوْا كَمَا رَأَيْتُمُوْنِيْ أُصَلِّيْ))(۱)

''یعنی تم اسی طرح نماز پڑھو جس طرح تم نے مجھے نماز پڑھتے ہوئے دیکھا ہے''

لہٰذا جو طریقہ نماز پڑھنے کا خود نبی کریم ﷺ نے اختیار فرمایا اور جس طریقے کی آپ نے تلقین فرمائی، وہ طریقہ باادب ہے، کوئی دوسرا شخص اپنی عقل سے اس میں کمی اور اضافہ نہیں کر سکتا۔

حضرات خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم اور نماز کی تعلیم

یہی وجہ ہے کہ حضرات صحابہ کرام اس بات کا اہتمام کرتے تھے کہ جو طریقہ حضورِ اقدس ﷺ نے بتادیا، اس کو یاد رکھیں، اس کو محفوظ رکھیں اور اس کو دوسروں تک پہنچائیں اور اپنی نمازوں کو اس کے مطابق بنائیں۔ چنانچہ حضرات خلفاء راشدین حضرت عمر، حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہم جن کی آدھی دنیا سے زیادہ پر حکومت تھی، لیکن جہاں کہیں جاتے، وہاں پر لوگوں کو بتاتے کہ نماز اس طرح پڑھا کرو اور خود نماز پڑھ کر بتاتے کہ آؤ، میں تمہیں بتاؤں کہ حضورِ اقدس ﷺ کس طرح نماز پڑھا کرتے تھے تاکہ تمہارا طریقہ رسول اللہ ﷺ کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق ہو جائے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اپنے شاگردوں سے فرماتے:

''أَلَا أُصَلِّيْ بِكُمْ صَلَاةَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ؟''(۲)

کیا میں تمہیں وہ نماز پڑھ کر نہ دکھاؤں جو رسول اللہ ﷺ پڑھا کرتے تھے۔ لہٰذا نماز میں

---

(۱) صحيح البخاري، كتاب الأذان، باب الأذان للمسافر الخ، رقم: ۵۹۵، سنن الدارمي، كتاب الصلاة، باب من أحق بالإمامة، رقم: ۱۲۲۵

(۲) سنن الترمذي، كتاب الصلاة، باب ما جاء أن النبي لم يرفع الافي أول مرة، رقم: ۲۳۸، سنن النسائي، كتاب التطبيق، باب الرخصة في ترك ذلك، رقم: ۱۰۴۸، سنن أبي داؤد، كتاب الصلاة، باب من لم يذكر الرفع عند الركوع، رقم: ۶۳۹

خضوع بھی مطلوب ہے کہ اس نمازی کے سارے ارکان سنت کے مطابق انجام پائیں، نمازی کے ظاہری اعضا کا سنت کے مطابق بنالینا یہ خشوع کی طرف جانے کی پہلی سیڑھی ہے، اور جب آدمی اپنے اعضاء کو درست کرلے گا اور کھڑے ہونے، رکوع کرنے، سجدہ کرنے اور بیٹھنے میں وہ طریقہ اختیار کرلے گا جو رسول اللہ ﷺ کا طریقہ ہے تو یہ اللہ تعالیٰ کی طرف دل متوجہ کرنے کی پہلی سیڑھی ہے۔

نماز میں خیالات آنے کی ایک وجہ

آج ہمیں اکثر و بیشتر یہ شکوہ رہتا ہے کہ نماز میں خیالات منتشر رہتے ہیں، کبھی کوئی خیال آرہا ہے، کبھی کوئی خیال آرہا ہے اور نماز میں دل نہیں لگتا، اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ ہم نے نماز کا ظاہری طریقہ سنت کے مطابق نہیں بنایا اور نہ ہی اس کا اہتمام کیا، بس جس طرح بچپن میں نماز پڑھنا سیکھ لی تھی، اسی طرح پڑھتے چلے آرہے ہیں، یہ فکر نہیں کہ واقعۃً یہ نماز سنت کے مطابق ہے یا نہیں۔ یہ نماز اتنا اہم فریضہ ہے کہ فقہ کی کتابوں میں اس پر سینکڑوں صفحات لکھے ہوئے ہیں جن میں نماز کے ایک ایک رکن کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے کہ تکبیر تحریمہ کے لئے ہاتھ کیسے اُٹھائیں، قیام کس طرح کریں، رکوع کس طرح کیا جائے، سجدہ کس طرح کیا جائے، قعدہ کس طرح کیا جائے، ان سب کی تفصیلات کتابوں میں موجود ہے، لیکن ان طریقوں کے سیکھنے کی طرف دھیان نہیں، بس جس طرح قیام کرتے چلے آرہے ہیں، اسی طرح قیام کرلیا، جس طرح اب تک رکوع سجدہ کرتے چلے آرہے ہیں، اسی طرح رکوع سجدہ کرلیا، لیکن ان کو ٹھیک ٹھیک سنت کے مطابق انجام دینے کی فکر نہیں۔

حضرت مفتی شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور نماز کا اہتمام

میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنی عمر کے آخری دور میں فرمایا کرتے تھے کہ آج مجھے قرآن و حدیث اور فقہ پڑھتے پڑھاتے ہوئے اور فتاویٰ لکھتے ہوئے ساٹھ سال ہوگئے ہیں اور ان کاموں کے علاوہ کوئی اور مشغلہ نہیں ہے لیکن ساٹھ سال گزرنے کے بعد اب بھی بعض اوقات نماز میں ایسی صورت پیش آجاتی ہے کہ مجھے پتہ نہیں چلتا کہ اب میں کیا کروں؟ پھر نماز کی کتاب اُٹھا کر دیکھنی پڑتی ہے کہ میری نماز درست ہوئی یا نہیں؟ میرا تو یہ حال ہے، لیکن میں لوگوں کو دیکھتا ہوں کہ ساری عمر نماز پڑھتے چلے جارہے ہیں اور کبھی کسی وقت دل میں یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ میری نماز سنت کے مطابق ہوئی یا نہیں؟ حضورِ اقدس ﷺ کے طریقے کے مطابق ہوئی یا نہیں؟ کبھی ذہن میں یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے ذہنوں میں اس بات کی اہمیت ہی نہیں کہ اپنی نمازوں کو سنت کے مطابق بنائیں۔ اس لئے یہ ضروری ہے کہ آدمی سب سے پہلے نماز کا طریقہ درست کرے۔

قیام کا صحیح طریقہ

اب میں مختصراً نماز کا صحیح طریقہ عرض کر دیتا ہوں، ان آیات کی تفسیر انشاء اللہ آئندہ جمعوں میں عرض کروں گا۔ جب آدمی نماز کے لئے کھڑا ہو تو اس میں سنت یہ ہے کہ آدمی کا پورا جسم قبلہ رُخ ہو، لہٰذا جب کھڑے ہوں تو سب سے پہلے قبلہ رُخ ہونے کا اہتمام کرلیں، سینہ بھی قبلہ رُخ ہو، اگر کسی وجہ سے سینہ تھوڑی دیر کے لئے قبلہ سے ہٹ گیا تو نماز تو ہو جائے گی، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے یہ کرم فرمایا ہے کہ ان چھوٹی چھوٹی باتوں کی وجہ سے یہ نہیں کہتے کہ جاؤ ہم تمہاری نماز قبول نہیں کرتے، لہٰذا نماز تو ہو جائے گی لیکن اس نماز میں سنت کا نور حاصل نہ ہوگا، سنت کی برکت حاصل نہ ہوگی، کیونکہ اس طرح کھڑا ہونا سنت کے خلاف ہے۔ اسی طرح پاؤں کی انگلیوں کا رُخ اگر قبلہ کی طرف ہو جائے تو جسم کا ایک ایک حصہ قبلہ رُخ ہو جائے گا، اب بتایئے کہ اگر انسان اس طرح سنت کے مطابق پاؤں رکھے تو اس میں کیا تکلیف ہو جائے گی؟ کوئی پریشانی لاحق ہو جائے گی؟ یا کوئی بیماری لاحق ہو جائے گی؟ کچھ بھی نہیں، صرف توجہ اور دھیان کی بات ہے، کیونکہ توجہ، دھیان اور اہتمام نہیں ہے، اس لئے یہ غلطی ہوتی ہے، اگر ذرا دھیان کرلیں تو سنت کے مطابق قیام ہو جائے گا اور اس کے نتیجے میں وہ نماز خضوع کے دائرے میں آجائے گی اور اس نماز میں سنت کے انوار و برکات حاصل ہو جائیں گے۔

نیت کرنے کا مطلب

یہاں ایک مسئلہ کی وضاحت کردوں۔ وہ یہ کہ نیت نام ہے دل کے ارادہ کرنے کا، بس آگے زبان سے نیت کرنا کوئی ضروری نہیں۔ چنانچہ آج بہت سے لوگ نیت کے خاص الفاظ زبان سے ادا کرنے کو ضروری سمجھتے ہیں مثلاً چار رکعت نماز فرض، وقت ظہر کا، منہ میرا کعبہ شریف کی طرف، پیچھے پیش امام کے، واسطے اللہ تعالیٰ کے اللہ اکبر۔ زبان سے یہ نیت کرنے کو لوگوں نے فرض و واجب سمجھ لیا ہے، گویا اگر کسی نے یہ الفاظ نہ کہے تو اس کی نماز ہی نہیں ہوئی۔ یہاں تک دیکھا گیا کہ امام صاحب رکوع میں ہیں، مگر وہ صاحب اپنی نیت کے تمام الفاظ ادا کرنے میں مصروف ہیں اور اس کے نتیجے میں رکعت بھی چلی جاتی ہے، حالانکہ یہ الفاظ زبان سے ادا کرنا کوئی ضروری اور فرض و واجب نہیں، جب دل میں یہ ارادہ ہے کہ فلاں نماز امام صاحب کے پیچھے پڑھ رہا ہوں، بس یہ ارادہ کافی ہے۔

تکبیر تحریمہ کے وقت ہاتھ اُٹھانے کا طریقہ

اسی طرح جب تکبیر تحریمہ کہتے وقت ہاتھ کانوں تک اُٹھاتے ہیں تو اس کی کوئی پرواہ نہیں ہوتی

کہ ان کو سنت کے مطابق اُٹھائیں، بلکہ جس طرح چاہتے ہیں ہاتھ اُٹھا کر ''اللہ اکبر'' کہہ کر نماز شروع کردیتے ہیں۔ سنت طریقہ یہ ہے کہ ہتھیلی کا رُخ قبلہ کی طرف ہو اور انگوٹھوں کے سرے کانوں کی لو کے برابر آجائیں، یہ صحیح طریقہ ہے۔ اس کے علاوہ جو دوسرے طریقے ہیں، مثلاً بعض لوگ ہتھیلیوں کا رُخ کانوں کی طرف کردیتے ہیں، بعض لوگ آسمان کی طرف کردیتے ہیں، یہ سنت طریقہ نہیں، اگر اس طریقے سے ہاتھ اُٹھا کر نماز شروع کردی تو نماز تو ادا ہوجائے گی لیکن سنت کی برکت اور سنت کا نور حاصل نہ ہوگا صرف دھیان اور توجہ کی بات ہے، اس توجہ کی وجہ سے یہ فائدہ حاصل ہوسکتا ہے۔

ہاتھ باندھنے کا صحیح طریقہ

اسی طرح ہاتھ باندھنے کا معاملہ ہے، کوئی سینے پر باندھ لیتا ہے، کوئی بالکل نیچے کردیتا ہے اور کوئی کلائی پر ہتھیلی رکھ دیتا ہے۔ یہ سب طریقے سنت کے خلاف ہیں۔ سنت طریقہ یہ ہے کہ آدمی اپنے داہنے ہاتھ کی چھوٹی انگلی اور انگوٹھے کا حلقہ بنا کر کلائی کو پکڑ لے اور درمیان کی تین انگلیاں بائیں ہاتھ کی کلائی پر رکھ لے اور ناف کے ذرا نیچے ہاتھ باندھ لے۔ یہ ہے مسنون طریقہ۔ اس طریقے پر عمل کرنے سے سنت کی برکت بھی حاصل ہوگی اور نور بھی حاصل ہوگا۔ اگر اس طریقے کے خلاف ویسے ہی ہاتھ پر ہاتھ رکھ دوگے تو کوئی مفتی یہ نہیں کہے گا کہ نماز نہیں ہوئی، نماز درست ہوجائے گی، لیکن سنت کے طریقے پر عمل نہ ہوگا، بس ذرا سی توجہ اور دھیان کی بات ہے۔

قرأت کا صحیح طریقہ

ہاتھ باندھنے کے بعد ثنا "سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ" پڑھے، پھر سورۃ فاتحہ پڑھے اور سورۃ پڑھے۔ ایک نمازی یہ سب چیزیں نماز میں پڑھ تو لیتا ہے لیکن اُردو لہجہ میں پڑھتا ہے، یعنی اس کا لب ولہجہ اور اس کی ادائیگی سنت کے مطابق نہیں ہوتی اور پڑھنے کا جو صحیح طریقہ ہے وہ حاصل نہیں ہوتا۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ قرآن کریم کو تجوید کے ساتھ اور اس کے ہر حرف کو اس کے صحیح مخرج سے ادا کیا جائے۔ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ تجوید اور قرأت سیکھنا بڑا مشکل کام ہے، حالانکہ اس کا سیکھنا کچھ مشکل نہیں، کیونکہ قرآن کریم میں جو حروف استعمال ہوئے ہیں، وہ کل ۲۹ حروف ہیں اور ان میں سے اکثر حروف ایسے ہیں جو اُردو میں بھی استعمال ہوتے ہیں، ان کو صحیح طور پر ادا کرنا تو بہت آسان ہے، البتہ صرف آٹھ دس حروف ایسے ہیں جن کی مشق کرنی ہوگی، مثلاً یہ کہ ''ث'' کس طرح ادا کیا جائے۔ ''ح'' کس طرح ادا کی جائے اور ''ض'' اور ''ظ'' میں کیا فرق ہے۔ اگر آدمی ان چند حروف کی کسی اچھے قاری سے مشق کرلے کہ جب ''ح'' ادا کرے تو ''ہ'' زبان سے نہ نکلے، کیونکہ ہمارے یہاں ''ح'' اور ''ہ'' کی ادائیگی میں

فرق نہیں کیا جاتا، لیکن عربی زبان میں دونوں کے درمیان بڑا فرق ہے، بعض اوقات ایک کو دوسرے کی جگہ پڑھ لینے سے معنی بدل جاتے ہیں۔ اس لئے ان حروف کی مشق کرنا ضروری ہے، یہ کوئی مشکل کام نہیں، لیکن چونکہ ہمیں اس کی فکر نہیں ہے، اس لئے اس کی طرف توجہ اور التفات نہیں ہے۔

خلاصہ

اپنے محلّے کی مسجد کے امام صاحب یا قاری صاحب کے پاس جا کر چند دن تک مشق کر لیں گے تو انشاء اللہ تمام حروف کی ادائیگی درست ہو جائے گی اور نماز سنت کے مطابق ہو جائے گی۔ آج یہ چند باتیں قیام اور تکبیر تحریمہ سے لے کر سورۃ فاتحہ تک کی عرض کر دیں، باقی باتیں زندگی رہی تو انشاء اللہ آئندہ جمعہ کو عرض کروں گا۔ اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ سب کو اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.

نماز ایک عاجزانہ عبادت ☆

بعد از خطبہ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ!

فَأَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ○ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ○

﴿قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ○ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ○ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ○ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكَاةِ فَاعِلُوْنَ ○ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حَافِظُوْنَ ○ إِلَّا عَلٰى أَزْوَاجِهِمْ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ فَإِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ○ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَأُولٰئِكَ هُمُ الْعَادُوْنَ﴾ (۱)

گذشتہ سے پیوستہ جمعہ کو میں نے اس آیت کی تفسیر میں عرض کیا تھا کہ نماز میں خضوع بھی مطلوب ہے اور خشوع بھی مطلوب ہے۔ خضوع کا تعلق انسان کے ظاہری اعضاء سے ہے اور خشوع کا تعلق انسان کے دل سے ہے۔ خضوع کا مطلب یہ ہے کہ نماز میں اعضاء اس طرح ہوں جس طرح رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہیں۔ اس سلسلے میں میں نے نماز کے مختلف ارکان کی ہیئت آپ حضرات کے سامنے بیان کی تھی۔ تکبیر تحریمہ کے وقت ہاتھ اُٹھانے کا طریقہ، کھڑے ہونے کا طریقہ، رکوع، قومہ، سجدہ، جلسہ کا طریقہ عرض کر دیا تھا۔ اب دو تین باتیں اس سلسلے میں باقی ہیں اس کے بعد ''خشوع'' کا مطلب اور اس کو حاصل کرنے کا طریقہ عرض کرنا ہے۔

رکوع اور سجدہ میں ہاتھوں کی انگلیاں

ایک بات یہ ہے کہ جب آدمی رکوع میں ہو تو ہاتھ کی انگلیاں کھلی ہونی چاہئیں، اور گھٹنوں کو انگلیوں سے پکڑ لینا چاہئے اور سجدہ کی حالت میں مسنون یہ ہے کہ ہاتھوں کی انگلیاں بند ہوں اور ہاتھ اس طرح رکھے جائیں کہ چہرہ ہاتھوں کے درمیان آجائے اور ہتھیلیاں کندھوں کے قریب ہوں، انگوٹھے کانوں کی لو کے سامنے ہوں اور کہنیاں پہلو سے علیحدہ ہوں، ملی ہوئی نہ ہوں۔

☆ اصلاحی خطبات (۱۴/۲۳۹ تا ۲۵۰)، بعد از نمازِ عصر، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی

(۱) المؤمنون: ۱ تا ۷

التحیات میں بیٹھنے کا طریقہ

جب آدمی التحیات میں بیٹھے تو التحیات میں بیٹھتے وقت دایاں پاؤں کھڑا ہو اور اس پاؤں کی انگلیوں کا رُخ قبلے کی طرف ہو، اور بایاں پاؤں بچھا کر آدمی اس کے اوپر بیٹھ جائے۔ اور ہاتھ کی انگلیاں رانوں پر اس طرح رکھی ہوئی ہوں کہ ان کا آخری سرا گھٹنوں پر آرہا ہو۔ انگلیوں کو گھٹنوں سے نیچے لٹکانا اچھا نہیں ہے۔

سلام پھیرنے کا طریقہ

اور جب سلام پھیرے تو سلام پھیرنے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ جب دائیں طرف سلام پھیرے تو پوری گردن دائیں طرف موڑ لی جائے اور اپنے کندھوں کی طرف نظر کی جائے اور بائیں طرف سلام پھیرتے وقت پوری گردن بائیں طرف پھیر دی جائے اور بائیں کندھوں کی طرف نظر کی جائے۔ یہ چند چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں۔ اگر ان باتوں کا خیال کرلیا جائے تو نماز سنت کے مطابق ہو جاتی ہے اور نبی کریم ﷺ کی سنت کی اتباع کا نور حاصل ہو جاتا ہے۔ اس کی برکات حاصل ہوتی ہیں اور اس کے ذریعہ نماز کے اندر خشوع حاصل ہونے میں بھی مدد ملتی ہے۔ اور ان باتوں میں نہ زیادہ وقت لگتا ہے نہ زیادہ محنت صرف ہوتی ہے، نہ پیسہ خرچ ہوتا ہے۔ لیکن اس کے نتیجے میں نماز سنت کے مطابق ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کی توفیق عطا فرمادے۔ آمین۔

خشوع کی حقیقت

دوسری چیز جس کا آج بیان کرنا ہے وہ ہے ''خشوع''، اس کے معنی ہیں دل کا اللہ تعالیٰ کے حضور جھکنا، یعنی انسان کا دل اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو اور اس کو اس بات کا احساس ہو کہ میں اللہ جل شانہ کے سامنے کھڑا ہوں۔ اس کا اعلیٰ ترین درجہ وہ ہے جس کے بارے میں نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((أَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ فَإِنْ لَمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَإِنَّهُ يَرَاكَ)) (۱)

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب الایمان، باب سؤال جبریل النبی الخ، رقم: ٤٨، صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان الإیمان والإسلام والإحسان، رقم: ٩، سنن الترمذی، کتاب الإیمان، باب ما جاء فی وصف جبریل الخ، رقم: ٢٥٣٥، سنن النسائی، کتاب الإیمان وشرائعه، باب نعت الإسلام، رقم: ٤٩٠٤، سنن أبی داؤد، کتاب السنة، باب فی القدر، رقم: ٤٠٧٥

یعنی تم اللہ تعالیٰ کی اس طرح عبادت کرو جیسے تم اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہے ہو، اور اللہ تعالیٰ سامنے نظر آ رہے ہوں اور اگر یہ تصور جمانا ممکن نہ ہو تو پھر کم از کم یہ تصور جماؤ کہ وہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔ یہ خشوع کا اعلیٰ ترین درجہ ہے۔

وجود کے یقین کے لئے نظر آنا ضروری نہیں

سوال یہ پیدا ہوا ہے کہ ہم تو اللہ تعالیٰ کو نہیں دیکھ رہے ہیں، اور نہ ہم یہ بات دیکھ رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں دیکھ رہا ہے، آنکھوں سے یہ بات نظر نہیں آ رہی ہے، لہٰذا ان باتوں کا تصور کیسے باندھیں؟ ــــ اس کا جواب یہ ہے کہ اس دنیا میں ہر چیز آنکھوں سے دیکھ کر معلوم نہیں ہوتی، بہت سی چیزیں ایسی ہیں جن کو انسان آنکھوں سے نہیں دیکھ رہا ہے۔ لیکن دل میں اس کے موجود ہونے کا اتنا یقین ہوتا ہے جیسے کہ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہو۔ مثلاً یہ میری آواز لاؤڈ اسپیکر کے ذریعہ مسجد سے باہر بھی جا رہی ہے۔ اب جو لوگ مسجد سے باہر ہیں وہ مجھے نہیں دیکھ رہے ہیں۔ لیکن میری آواز سن کر ان کو اس بات کا یقین حاصل ہے کہ میں مسجد کے اندر موجود ہوں اور ان کو اتنا ہی یقین حاصل ہے جتنا آنکھ سے دیکھنے سے حاصل ہوتا ہے۔ لہٰذا کسی آدمی کے موجود ہونے کا علم دیکھے بغیر صرف آواز سن کر ہو رہا ہے۔ اگر کوئی شخص کہے کہ تم نے بولنے والے کو آنکھ سے دیکھا نہیں ہے پھر تمہیں اس کے موجود ہونے کا یقین کیوں ہو رہا ہے تو وہ یہ جواب دے گا کہ میں اپنے کانوں سے اس کی آواز سن رہا ہوں، جس سے پتہ چل رہا ہے کہ وہ آدمی موجود ہے۔

ہوائی جہاز کی مثال

آپ صبح شام ہوائی جہاز اُڑتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ اس جہاز میں بیٹھا ہوا کوئی آدمی نظر نہیں آتا، نہ چلانے والا نظر آ رہا ہے، لیکن آپ کو سو فیصد یقین ہے کہ اس جہاز میں آدمی بیٹھے ہوئے ہیں اور کوئی پائلٹ اس جہاز کو چلا رہا ہے حالانکہ اس پائلٹ اور اس کے اندر بیٹھنے والے انسانوں کو آپ نے آنکھوں سے نہیں دیکھا، کیونکہ جہاز بغیر پائلٹ کے نہیں چلتا اور یہ ممکن نہیں ہے کہ جہاز چل رہا ہو اور اس کے اندر پائلٹ موجود نہ ہو، اگر کوئی شخص آپ سے کہے کہ یہ جہاز بغیر پائلٹ کے خود بخود ہوا میں اُڑتا جا رہا ہے تو آپ اس کو بیوقوف اور احمق قرار دیں گے۔ (۱)

---

(۱) یہ بات اپنی جگہ بجا، لیکن سائنس کی حیران کن ترقی کے بعد اب ایسے جہاز دریافت کیے جا چکے ہیں جو بغیر پائلٹ کے اڑائے جا سکتے ہیں۔ البتہ زمین پر بیٹھا ہوا شخص اس جہاز کو کنٹرول کر رہا ہوتا ہے جو کہ پائلٹ کے قائم مقام ہے۔ حضرت کی یہاں مراد عمومی مشاہدے سے ہے۔ (مرتب)

روشنی سورج پر دلالت کرتی ہے

مسجد کے اندر باہر سے روشنی آرہی ہے اور سورج نظر نہیں آرہا ہے، لیکن ہر انسان کو سو فیصد یقین ہے کہ اس روشنی کے پیچھے سورج موجود ہے، حالانکہ سورج آنکھوں سے نظر نہیں آرہا ہے، لہٰذا جس طرح روشنی کو دیکھ کر سورج کا پتہ لگا لیتے ہو اور جس طرح ہوائی جہاز کو دیکھ کر اس کے چلانے والے کا پتہ لگاتے ہو، اسی طرح یہ سارا عالم جو پھیلا ہوا ہے، یہ پہاڑ یہ جنگل، یہ ہوائیں، یہ پانی، یہ سمندر، یہ دریا، یہ مٹی، یہ آب وہوا، یہ سب کچھ کسی بنانے والے پر دلالت کر رہا ہے۔

ہر چیز اللہ تعالیٰ کے وجود پر دلالت کر رہی ہے

لہٰذا جب آدمی نماز کے لئے کھڑا ہوا ہو تو اس وقت اس بات کا تصور کرے کہ میرے سامنے جتنی چیزیں ہیں وہ سب اللہ جل شانہ کی ذات کی طرف اشارہ کر رہی ہیں۔ یہ روشنی جو نظر آرہی ہے اس کے پیچھے سورج ہے، لیکن سورج کے پیچھے کون ہے؟ سورج کس نے پیدا کیا؟ اور اس کے اندر روشنی کس نے رکھی؟ یہ سب اللہ تعالیٰ کی خالقیت اور وجود پر دلالت کر رہی ہے۔ لہٰذا نماز کے اندر آدمی یہ تصور باندھے کہ میں اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑا ہوں، اور اللہ جل جلالہ مجھے دیکھ رہے ہیں اور اللہ جل جلالہ کے میرے سامنے ہونے کا ایسا یقین ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کو آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں، یہ تصور جما کر نماز پڑھ کر دیکھو کہ کیا کیفیت ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو یہ کیفیت عطا فرمادے۔ آمین۔ اس لئے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اس طرح نماز پڑھو کہ گویا کہ تم اللہ کو دیکھ رہے ہو، اگر تم اللہ کو نہیں دیکھ رہے ہو تو وہ اللہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔

الفاظ کی طرف دھیان، پہلی سیڑھی

یہ نماز پڑھنے کا اعلیٰ درجہ ہے۔ اس اعلیٰ درجے تک پہنچنے کے لئے کچھ ابتدائی سیڑھیاں ہیں، ان سیڑھیوں کو اگر آدمی رفتہ رفتہ قطع کرتا جائے تو اللہ تعالیٰ اس اعلیٰ مقام تک پہنچا دیتے ہیں، وہ سیڑھی کیا ہے؟ حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس کی پہلی سیڑھی یہ ہے کہ آپ نماز میں جو الفاظ زبان سے نکالیں ان کی طرف دھیان رہے۔ مثلاً آپ زبان سے "اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ" ادا کریں۔ اس وقت آپ کو پتہ ہونا چاہئے کہ میں "اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ" ادا کر رہا ہوں۔ لیکن آج کل ہماری نماز کے اندر یہ کیفیت ہوتی ہے کہ جس وقت "اللہ اکبر" کہہ کر نیت باندھی تو بس ایک سوئچ آن ہو گیا اور مشین چل پڑی چونکہ نماز پڑھنے کی عادت پڑی ہوئی ہے، اس لئے زبان

سے الفاظ خود بخود نکلنے لگے، اور مشین چل رہی ہے، یہاں تک کہ بعض اوقات یہ بھی یاد نہیں ہوتا کہ میں نے پہلی رکعت میں کونسی سورت پڑھی تھی اور دوسری رکعت میں کونسی سورت پڑھی تھی یہ صورتِ حال اکثر و بیشتر پیش آتی ہے۔

خشوع کی پہلی سیڑھی

اگر خشوع حاصل کرنا ہے تو پہلا کام یہ کرو کہ جب نماز پڑھنا شروع کرو تو زبان سے جو الفاظ ادا کر رہے ہو دھیان اس کی طرف ہو ـــــ انسان کی خاصیت یہ ہے کہ ایک غیر مرئی چیز جو آنکھوں سے نظر نہیں آرہی ہے اس کی طرف دھیان جمانا شروع میں دشوار ہوتا ہے لیکن حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ خشوع حاصل کرنے کی پہلی سیڑھی یہ ہے کہ ان الفاظ کی طرف دھیان جماؤ۔

معنی کی طرف دھیان دوسری سیڑھی

دوسری سیڑھی یہ ہے کہ ان الفاظ کے معنی کی طرف دھیان کرو، جس وقت زبان سے "اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ" ادا کیا تو اس کے معنی کی طرف دھیان کرو کہ تمام تعریفیں اس اللہ کے لئے ہیں جو رب العالمین ہے اور ان الفاظ کے ذریعہ میں اللہ جل شانہ کی تعریف کر رہا ہوں۔ جب "اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ" ادا کرو تو اس وقت دل میں اللہ تعالیٰ کی صفتِ رحمت کا تصور دل میں ہو کہ اللہ تعالیٰ رحمٰن بھی ہیں اور رحیم بھی ہیں۔ جس وقت "مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ" ادا کرو اس وقت یہ دھیان کرو کہ میں اللہ جل شانہ کو قیامت کے دن کا مالک قرار دے رہا ہوں۔ جس وقت "اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ" زبان سے ادا کرو اس وقت اس کے معنی کو ذہن میں لائے کہ اے اللہ! ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں۔ اور جس وقت "اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ" کہا اس وقت یہ معنی ذہن میں مستحضر کرے کہ میں اللہ تعالیٰ سے دعا کر رہا ہوں کہ اے اللہ! مجھے صراطِ مستقیم عطا فرما دے، جس وقت "صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ لا غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ" کہے اس وقت یہ معنی ذہن میں لائے کہ اے اللہ! مجھے ان لوگوں کا راستہ دکھا دے جن پر آپ نے انعام فرمایا، اور ان لوگوں کا راستہ مجھے نہیں چاہئے جن پر آپ کا غضب ہوا۔ اور جو گمراہ ہوئے۔

لہٰذا پہلے الفاظ کی طرف دھیان کرے، پھر معنی کی طرف دھیان کرے۔ بہر حال! اپنی طرف سے نماز کے اندر اس بات کی کوشش کی جائے کہ دھیان ان چیزوں کی طرف رہے۔ جب ان چیزوں کی طرف دھیان رہے گا تو پھر جو اِدھر اُدھر کے خیالات آتے ہیں وہ ان شاء اللہ ختم ہو جائیں گے۔

نماز میں خیالات آنے کی بڑی وجہ

پھر یہ بھی عرض کردوں کہ یہ جو دوسرے خیالات آتے ہیں اس کی بہت بڑی وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ ہم وضو ڈھنگ سے نہیں کرتے، سنت کے مطابق نہیں کرتے، حواس باختہ حالت میں اِدھر اُدھر باتیں کرتے ہوئے وضو کرلیا۔ حالانکہ وضو کے آداب میں سے یہ ہے کہ وضو کے دوران باتیں نہ کی جائیں۔ بلکہ وضو کے دوران وہ دعائیں پڑھی جائیں جو رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہیں اور آدمی اطمینان سے وضو کرکے ایسے وقت میں مسجد میں آئے جبکہ نماز کھڑی ہونے میں کچھ وقت ہو اور مسجد میں آکر آدمی پہلے سنت اور نفل ادا کرلے کیونکہ یہ سنت اور نفل جو نماز سے پہلے رکھی گئی ہیں یہ درحقیقت فرض نماز کی تمہید ہیں تاکہ فرض نماز سے پہلے ہی اس کا دھیان اللہ تعالیٰ کی طرف ہوجائے اور ادھر ادھر کے خیالات آنا بند ہوجائیں۔ ان سب آداب کا لحاظ کرکے جب آدمی نماز پڑھے گا تو پھر دوسرے خیالات نہیں آئیں گے۔

اگر دھیان بھٹک جائے واپس آجاؤ

لیکن انسان کا دماغ چونکہ بھٹکتا رہتا ہے اس لئے ان تدابیر کے اختیار کرنے کے باوجود غیر اختیاری طور پر کوئی خیال آجائے تو اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی گرفت نہیں، جب دوبارہ تنبہ ہوجائے تو پھر دوبارہ ان الفاظ کی طرف دھیان لے آئیں۔ مثلاً جس وقت "اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ" پڑھا اس وقت تک دھیان حاضر تھا، لیکن جب "مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ" پڑھا اس وقت دھیان غیر اختیاری طور پر کہیں اور بھٹک گیا تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ لیکن جب "اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ" کہا اس وقت خیال آیا کہ میں تو کہیں اور بھٹک گیا تھا۔ تو اب دوبارہ دھیان کو واپس لے آؤ۔ اسی طرح جتنی مرتبہ دھیان بھٹکے واپس آجاؤ۔ یہی کام کرتے چلے جاؤ۔

خشوع حاصل کرنے کے لئے مشق اور محنت

یاد رکھئے اس دنیا کے اندر کوئی بھی مقصد بغیر محنت اور مشق کے حاصل نہیں ہوسکتا، جو کام بھی کرنا ہو اس کے لئے مشق کرنی پڑتی ہے۔ اسی طرح خشوع حاصل کرنے کے لئے کچھ محنت اور مشق کرنی پڑتی ہے۔ وہ مشق یہ ہے کہ انسان یہ ارادہ کرلے کہ جب نماز پڑھیں گے تو اپنا دھیان ان الفاظ کی طرف رکھیں گے جو الفاظ زبان سے ادا کر رہے ہیں اور اگر ذہن بھٹکے گا تو دوبارہ ان الفاظ کی طرف واپس آجائیں گے، پھر بھٹکے گا تو پھر واپس آجائیں گے۔ جتنی مرتبہ بھٹکے گا اتنی مرتبہ واپس آئیں گے۔

جب اس پر عمل کرو گے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ آج اگر ذہن دس مرتبہ بھٹکا تھا تو آئندہ کل انشاء اللہ آٹھ مرتبہ بھٹکے گا۔ اگلے دن انشاء اللہ چھ مرتبہ بھٹکے گا۔ اس طرح یہ تناسب انشاء اللہ کم ہوتا چلا جائے گا۔ بس انسان یہ سوچ کر چھوڑے نہیں کہ یہ کام میرے بس سے باہر ہے اور میرا کوشش کرنا فضول ہے بلکہ لگا رہے، کوشش کرتا رہے، ساری عمر کوشش کرتا رہے چھوڑے نہیں۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ایک دن ایسا وقت آئے گا جب تمہارا زیادہ ذہن نماز ہی کی طرف اور الفاظ کی طرف ہوگا۔

تیسری سیڑھی اللہ تعالیٰ کا دھیان

جب یہ بات حاصل ہو جائے تو اس کے بعد تیسری سیڑھی پر قدم رکھنا ہے، وہ تیسری سیڑھی یہ ہے کہ نماز کے اندر اس بات کا دھیان ہو کہ میں اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑا ہوں، اور جب یہ دھیان حاصل ہو جائے گا تو بس مقصد حاصل ہے انشاء اللہ ــــــ یہ ہے خلاصہ خشوع حاصل کرنے کا جس کی طرف قرآن کریم نے اس آیت میں ارشاد فرمایا:

﴿"قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ٥ الَّذِیْنَ هُمْ فِیْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ٥﴾

یعنی وہ مؤمن جو اپنی نماز میں خشوع اختیار کرنے والے ہیں، وہ فلاح یافتہ ہیں۔ ہم نے ان کو دنیا و آخرت میں فلاح دیدی۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے اپنی رحمت سے ہم سب کو اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور ہماری نمازوں میں خشوع پیدا فرما دے، اور اللہ تعالیٰ ہمارے دھیان کو مجتمع فرما دے، اور نبی کریم ﷺ کی سنت کے مطابق نماز پڑھنے کی توفیق عطا فرما دے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰه رَبِّ الْعَالَمِیْنَ

نماز کی حفاظت کیجئے ☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

"أَمَّا بَعْدُ! فَأَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيمِ٥ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ٥
﴿قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ٥هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ٥ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ٥ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ ٥ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ٥ اِلَّا عَلٰى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ٥ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ٥ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ٥ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ٥ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْوٰرِثُوْنَ٥ الَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ ط هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ٥﴾ (۱)

بزرگانِ محترم و برادرانِ عزیز! یہ سورۃ المؤمنون کی ابتدائی آیات ہیں، جن کا بیان کافی عرصہ سے چل رہا ہے، ان آیات میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے مؤمنوں کی صلاح وفلاح کے لئے جو صفات ضروری ہیں، ان صفات کا ذکر فرمایا ہے، الحمد للہ، ان تمام صفات کا بیان تفصیل سے ہو چکا ہے، آج اس سلسلے کا آخری بیان ہے، یہ بیان اس آخری آیت کے بارے میں ہے جو مؤمنوں کی صفات کے بیان میں ہے، وہ آیت یہ ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ٥ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْوٰرِثُوْنَ٥ الَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ ط هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ٥﴾

یعنی یہ وہ لوگ ہیں جو اپنی نمازوں کی پابندی اور حفاظت کرنے والے ہیں، اور یہی لوگ جنت الفردوس کے وارث ہوں گے، اور اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ جنت الفردوس جنت کے اندر اعلیٰ مقام ہے۔

☆ اصلاحی خطبات (۱۵/۲۸۴ تا ۲۹۷)، بعد از نماز عصر، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی

(۱) المؤمنون: ۱ تا ۱۱

تمام صفات ایک نظر میں

یادداشت کو تازہ کرنے کے لئے آخر میں پھر ایک مرتبہ ان اوصاف پر نظر ڈال لیتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے ان آیاتِ کریمہ میں بیان فرمائے ہیں۔ فرمایا کہ وہ مؤمن فلاح یافتہ ہیں جن کی صفات یہ ہیں:

(۱) وہ اپنی نماز میں خشوع اختیار کرنے والے ہیں۔

(۲) وہ مؤمن جو لغو، فضول اور بے فائدہ کاموں سے اعراض کرنے والے ہیں۔

(۳) وہ مؤمن جو زکوٰۃ پر عمل کرنے والے ہیں، اس سلسلے میں میں نے بتایا تھا کہ اس کے دو معنیٰ ہیں، ایک یہ کہ وہ زکوٰۃ ادا کرتے ہیں جو ان کے ذمّے فرض ہے، دوسرے معنیٰ ہیں کہ وہ اپنے اخلاق کو برائیوں سے پاک کرتے ہیں۔

(۴) یہ ہوا کہ وہ اپنے اخلاق کو بری عادتوں سے پاک کرنے والے ہیں۔

(۵) یہ ہے کہ وہ اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں، سوائے اپنی بیویوں اور اپنی زرخیز کنیزوں کے، پہلے زمانے میں کنیزیں ہوتی تھیں، ان سے جنسی خواہش پوری کرنا جائز تھا، ان کا ذکر ہے۔ یعنی وہ لوگ اپنی جنسی خواہش کو قابو میں رکھتے ہیں، اور صرف اپنی بیویوں کے ساتھ یا اللہ تعالیٰ نے جن کنیزوں کے ساتھ یہ تعلق قائم کرنے کو حلال قرار دیا ہے، صرف ان کے ساتھ قائم کرتے ہیں، ایسے لوگوں پر کوئی ملامت نہیں۔ البتہ جو شخص ان کے علاوہ جنسی خواہش کو پورا کرنے کا کوئی راستہ تلاش کرے گا، وہ حد سے گزرنے والا ہے، اور اللہ تعالیٰ کے یہاں مجرم ہے۔

(۶) یہ ہے کہ وہ مؤمن اپنی امانتوں کا پاس کرنے والے ہیں، یعنی جو امانت ان کے پاس رکھوادی گئی ہے اس میں خیانت نہیں کرتے۔

(۷) یہ ہے کہ وہ ''عہد'' کا پاس کرنے والے ہیں، جو عہد کسی سے کرلیا وہ اس کی عہد شکنی نہیں کرتے۔

ان سب صفات کا بیان تفصیل سے الحمد للہ ہو چکا ہے۔

پہلی اور آخری صفت میں یکسانیت

آخر میں اللہ تعالیٰ نے آٹھویں صفت یہ بیان فرمائی:

﴿وَالَّذِیْنَ هُمْ عَلٰی صَلَاتِهِمْ یُحَافِظُوْنَ﴾

وہ مؤمن کامیاب ہیں جو اپنی نمازوں کی حفاظت کرنے والے ہیں۔

قرآن کریم نے یہ آٹھ صفات بیان فرمائی ہیں جو مؤمنوں کی فلاح کے لئے ضروری ہیں۔ ان صفات کو شروع بھی نماز سے کیا گیا، اور نماز ہی پر ختم کیا گیا، چنانچہ سب سے پہلی صفت یہ بیان فرمائی تھی کہ جو لوگ اپنی نمازوں میں خشوع اختیار کرنے والے ہیں، اور آخری صفت یہ بیان فرمائی کہ جو لوگ اپنی نمازوں کی حفاظت کرنے والے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ مؤمن کے لئے فلاح حاصل کرنے کا سب سے اہم راستہ ''نماز'' ہے۔ نماز میں خشوع اختیار کرنے کا مطلب پہلے تفصیل سے عرض کر دیا تھا۔

نماز کی پابندی اور وقت کا خیال

نماز کی حفاظت میں بہت سی چیزیں داخل ہیں، ایک یہ کہ انسان نماز کی پابندی کرے، یہ نہ ہو کہ آدمی گنڈے دار نماز پڑھے، کبھی پڑھے اور کبھی چھوڑ دے، بلکہ پابندی کے ساتھ آدمی نماز کا اہتمام کرے۔ دوسرا مفہوم یہ ہے کہ نماز کے اوقات کا پورا خیال رکھے، اللہ تعالیٰ نے یہ نمازیں اوقات کے ساتھ مشروط رکھی ہیں، چنانچہ ارشاد فرمایا:

﴿إِنَّ الصَّلَاةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ كِتَابًا مَّوْقُوتًا﴾ (۱)

یعنی نماز اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک ایسا فریضہ ہے، جس کا اللہ تعالیٰ نے وقت مقرر کیا ہے کہ فلاں نماز کا وقت اتنے بجے شروع ہوتا ہے، اور اتنے بجے ختم ہوتا ہے، جیسے نمازِ فجر کا وقت صبح صادق سے شروع ہوتا ہے، اور طلوعِ آفتاب پر ختم ہو جاتا ہے، ظہر کا وقت زوالِ آفتاب سے شروع ہوتا ہے، اور ہر چیز کا سایہ دو مثل ہونے پر ختم ہو جاتا ہے، عصر کا وقت دو مثل پر شروع ہوتا ہے، اور غروبِ آفتاب پر ختم ہو جاتا ہے۔ اس طرح ہر نماز کا ایک خاص وقت مقرر ہے۔ لہٰذا صرف نماز کی پابندی نہیں، بلکہ نمازوں کے اوقات کی بھی پابندی ہے کہ وقت پر انسان نماز پڑھے۔

یہ منافق کی نماز ہے

ایک حدیث شریف میں رسولِ کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ یہ منافق کی نماز ہوتی ہے کہ عصر کی نماز کا وقت ہو گیا، اور ایک آدمی بے پرواہ ہو کر بیٹھا رہا، یہاں تک کہ جب سورج کنارے آ لگا (جب سورج کنارے پر آ جائے اور پیلا پڑ جائے اس طرح کہ انسان اس سورج کو کسی تکلیف کے بغیر آنکھ سے دیکھ سکے تو ایسے وقت میں عصر کی نماز مکروہ ہو جاتی ہے) تو اس وقت اُٹھ کر اس نے جلدی سے چار ٹھونگیں ماریں، اور نماز ختم کر دی، یہ منافق کی نماز ہے۔ (۲)

(۱) النساء: ۱۰۳ (۲) حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں

لہٰذا بات صرف یہ نہیں کہ نماز پڑھنی ہے، فریضہ سر سے ٹالنا ہے، بلکہ اس کے اوقات کا بھی لحاظ رکھنا ہے کہ وہ صحیح وقت پر ادا ہو۔ اب فجر کی نماز کا وقت طلوع آفتاب پر ختم ہو جاتا ہے، لہٰذا اس بات کا اہتمام ضروری ہے کہ طلوع آفتاب سے پہلے فجر کی نماز پڑھ لی جائے۔ اگر ایک آدمی بے پرواہ ہو کر پڑا سوتا رہا، اور پھر طلوع آفتاب کے بعد اُٹھ کر نماز پڑھے تو اس شخص نے قضا نماز تو پڑھ لی، لیکن یہ نماز کی حفاظت نہ ہوئی، اس لئے کہ اس میں وقت کا لحاظ نہیں رکھا گیا، جس وقت اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا اس وقت نماز ادا نہیں کی گئی۔

اللہ کی اطاعت کا نام دین ہے

بار بار آپ حضرات سے عرض کرتا رہتا ہوں کہ دین نام ہے اللہ تعالیٰ کے حکم کی اطاعت کا، کسی وقت کے اندر کچھ نہیں رکھا، لیکن جب اللہ تعالیٰ نے ایک حکم دے دیا کہ فلاں نماز کو فلاں وقت سے پہلے پہلے ادا کرو، تو اب اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرتے ہوئے اس وقت سے پہلے ادا کرنا ضروری ہے۔ اگر آفتاب طلوع ہو رہا ہے، اور اس وقت کوئی شخص نماز پڑھنے کی نیت باندھ لے تو ایسا کرنا حرام ہے۔ لہٰذا وقت کے اندر نماز پڑھنا اور اوقات کی پابندی کرنا نماز کی محافظت کے مفہوم میں داخل ہے۔

جماعت سے نماز ادا کیجئے

تیسری بات جو نماز کی محافظت کے مفہوم میں داخل ہے، وہ یہ ہے کہ نماز کو اس کے مکمل طریقے سے ادا کیا جائے، اور مکمل طریقے سے ادا کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اگر نماز ادا کرنے والا مرد ہے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ مسجد میں جا کر با جماعت نماز ادا کرے۔ مرد کے لئے جماعت کے ساتھ نماز ادا کرنا سنتِ مؤکدہ ہے، جو واجب کے قریب ہے، بلکہ بعض علماء کرام نے جماعت سے نماز پڑھنے کو واجب کہا ہے، البتہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک سنتِ مؤکدہ قریب بواجب ہے۔ ایک مرد گھر میں اکیلا نماز پڑھے تو یہ ناقص ادائیگی ہے، فقہاء کرام اس کو اداءِ قاصر کہتے ہیں، اداءِ کامل یہ ہے کہ آدمی مسجد میں جماعت کے ساتھ نماز ادا کرے۔ فضیلت اور ثواب کے لحاظ سے بھی جماعت سے نماز ادا کرنے کا درجہ زیادہ ہے۔

چنانچہ ایک حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تنہا نماز پڑھنے کے مقابلے میں جماعت سے

حاشیہ صفحہ گزشتہ) سنن الترمذی، کتاب الصلاة، باب ماجاء فی تعجیل العصر، رقم: ۱۴۸، سنن أبی داود، کتاب الصلاة، باب فی وقت صلاة العصر، رقم: ۳۵۰، سنن النسائی، کتاب المواقیت، باب التشدید فی تاخیر العصر، رقم: ۵۰۷، مسند أحمد، رقم: ۱۱۵٦۱

نماز پڑھنے پر ستائیس گنا ثواب زیادہ دیا جاتا ہے۔[1]

اب مسجد میں جا کر جماعت سے نماز ادا کرنے میں چند منٹ زیادہ خرچ ہوں گے، اس کی خاطر اتنا بڑا ثواب چھوڑ دینا، اور نماز کی ادائیگی کو ادھورا اور ناقص بنالینا کتنے بڑے گھاٹے کا سودا ہے۔ لہٰذا مردوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ مسجد میں آ کر نماز ادا کریں۔

نماز کے انتظار کا ثواب

اللہ تبارک وتعالیٰ نے مسجد کو اپنا گھر بنایا ہے، اس لئے انسان نماز کے انتظار میں جتنی دیر مسجد میں بیٹھتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو نماز کا ثواب دیتے رہتے ہیں۔ مثلاً آپ حضرات اس وقت یہاں مسجد میں بیٹھے ہیں، اور اس لئے بیٹھے ہیں کہ نماز کا انتظار ہے، جتنی دیر آپ بیٹھے ہیں، چاہے خاموش ہی بیٹھے ہیں، کوئی کام بھی نہیں کر رہے ہیں، نہ نماز پڑھ رہے ہیں، نہ تلاوت کر رہے ہیں، نہ ذکر کر رہے ہیں، بلکہ خالی بیٹھے ہیں، لیکن چونکہ نماز کے انتظار میں بیٹھے ہیں، اس لئے اس پر وہی ثواب ملے گا جو نماز پڑھنے پر ثواب ملتا ہے۔ لہٰذا اگر آدمی پہلے سے مسجد میں پہنچ جائے تو اس کو مسلسل نماز کا ثواب ملتا رہے گا، اس کے نامۂ اعمال میں نیکیوں کا اضافہ ہوتا رہے گا۔ بہر حال! نماز کی حفاظت میں یہ بات داخل ہے کہ نماز کو جماعت کے ساتھ ادا کیا جائے۔

ان کے گھروں کو آگ لگا دوں

حضورِ اقدس ﷺ کے زمانۂ مبارک میں جب آپ مسجدِ نبوی میں امامت فرمارہے ہوتے تھے تو تمام صحابہ کرام حضورِ اقدس ﷺ کے پیچھے جماعت سے نماز ادا کرتے تھے، لیکن کچھ منافق قسم کے لوگ جماعت سے نماز ادا نہیں کرتے تھے، اور جماعت میں حاضر نہیں ہوتے تھے، چونکہ منافق تھے، ان کے دل میں ایمان تو تھا نہیں، صرف زبان سے کہہ دیا تھا کہ ہم مسلمان ہیں، اس لئے وہ لوگ بہانے بناتے، اور جماعت میں حاضر نہ ہوتے، البتہ کسی صحابی سے یہ تصور نہیں ہوتا تھا کہ وہ جماعت کی نماز چھوڑے گا۔ ایک دن رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میرے دل میں یہ خیال آتا ہے کہ کبھی اس طرح

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب الأذان، باب فضل صلاة الجماعة، رقم:٦٠٩، صحیح مسلم، کتاب المساجد ومواضع الصلاة، باب فضل صلاة الجماعة، رقم:١٠٣٤، سنن الترمذی، کتاب الصلاة، باب ماجاء فی فضل الصلاة، رقم:١٩٩، سنن النسائی، کتاب الامامة، باب فضل الجماعة، رقم:٨٢٨، مسند أحمد، رقم:٥٠٨٠، مؤطا مالك، کتاب النداء للصلاة، باب فضل صلاة الجماعة علی صلاة الفذ، رقم:٢٦٤

کروں کہ نماز کی امامت کے لئے مصلی پر کسی اور کو کھڑا کردوں، اور ان سے کہوں کہ نماز شروع کردو، اور پھر میں لوگوں کے گھروں پر جا کر دیکھوں کہ کون کون بیٹھا ہے جو جماعت میں نہیں آیا، اور جن لوگوں کو میں دیکھوں کہ وہ جماعت میں شامل نہیں ہیں، میرا دل چاہتا ہے کہ ان کے گھروں کو آگ لگادوں۔ (۱)

جماعت سے نماز پڑھنے کے فائدے

آپ رسول اللہ ﷺ کے صدمے اور غصے کا اندازہ لگایئے، اس لئے کہ مسجد کے میناروں سے آواز بلند ہو رہی ہے کہ حیّ علی الصلوٰۃ، حیّ علی الفلاح، نماز کی طرف آؤ، فلاح کی طرف آؤ، لیکن یہ شخص گھر میں بیٹھا ہے، اور اس کے کان پر جوں نہیں رینگتی۔ اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو رسولِ کریم ﷺ کے غصے سے محفوظ رکھے، آمین۔ اگر ہم لوگ گھر میں بیٹھے ہیں، اور جماعت میں نہیں آرہے ہیں، اس وقت اس حدیث کا تصور کرلیا کریں کہ حضور ﷺ کا دل چاہتا ہوگا کہ ہمارے گھروں کو آگ لگادیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے مسجد کو اپنا گھر بنایا ہے، اور اس کو اُمتِ مسلمہ کے لئے مرکز بنایا ہے، وہ یہاں جمع ہوکر اللہ تعالیٰ کے سامنے سربسجود ہوں، اور اللہ تعالیٰ کی عبادت کریں، اور پھر اس کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ جب مسلمان ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو ایک دوسرے کے دکھ درد میں بھی شریک ہوتے ہیں، ایک دوسرے کے حالات سے بھی واقفیت ہوتی ہے، پھر مل جل کر کوئی کام بھی کرسکتے ہیں، بے شمار فائدے حاصل ہوتے ہیں، لیکن اصل بات یہ ہے کہ اللہ کے حکم کی تعمیل میں مسجد کے اندر آؤ۔

عیسائیت کی تقلید نہ کریں

یہ جو ہمارے یہاں تصور پھیل گیا ہے کہ جب جمعہ کا دن آئے گا تو جمعہ کی نماز کے لئے مسجد میں آئیں گے، اور سارے ہفتے میں مسجد کے اندر آنے کا خیال نہیں آتا، یہ درحقیقت ہم نے اسلام کو عیسائی مذہب پر قیاس کرلیا ہے۔ عیسائی مذہب والے صرف اتوار کے دن اپنی عبادت گاہ میں جمع ہوتے ہیں، باقی دنوں میں چھٹی، اور اب تو اتوار بھی ختم ہوگیا، یورپ اور امریکہ میں جاکر دیکھو کہ کلیسا

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب الخصومات، باب اخراج أهل المعاصی الخ، رقم: ۲۲۴۲، صحیح مسلم، کتاب المساجد ومواضع الصلاة، رقم: ۱۰۴۰، سنن الترمذی، کتاب الصلاة، رقم: ۲۰۱، سنن النسائی، کتاب الإمامة، رقم: ۸۳۹، سنن أبی داؤد، کتاب الصلاة، رقم: ۴۶۱، مؤطا مالك، کتاب النداء للصلاة، رقم: ۲۶۶، سنن الدارمی، کتاب الصلاة، رقم: ۱۱۸۶

ویران پڑے ہوئے ہیں، اور پادری صاحبان بیٹھے مکھیاں مارتے رہتے ہیں، عبادت کے لئے وہاں کوئی آتا ہی نہیں، بہر حال! ایک عرصہ دراز تک اتوار کے دن آیا کرتے تھے۔ اللہ بچائے، ہم نے یہی سمجھ لیا کہ صرف جمعہ کے دن مسجد میں جانا چاہئے، حالانکہ جس طرح جمعہ کی نماز فرض ہے، اسی طرح پانچ وقت کی نماز بھی فرض ہے، اور جس طرح جمعہ کے دن مسجد میں نماز ادا کرنا ضروری ہے، اسی طرح عام دنوں میں بھی مسجد میں جا کر نماز کی ادائیگی ضروری ہے۔ اس لئے کہ جماعت کے ساتھ نماز ادا کرنا سنتِ مؤکدہ قریب بواجب ہے۔ بہر حال! جماعت سے مسجد میں نماز ادا کرنا نماز کی حفاظت کے مفہوم میں داخل ہے۔

خواتین اوّل وقت میں نماز ادا کریں

خواتین کے لئے حکم یہ ہے کہ نماز کا وقت داخل ہونے کے فوراً بعد جلد از جلد نماز ادا کرلیں، خواتین اس سلسلے میں بڑی کوتاہی کرتی ہیں کہ نماز کو ٹلاتی رہتی ہیں، اور ایسے وقت میں نماز پڑھتی ہیں جب وقت مکروہ ہو جاتا ہے، ان کے لئے افضل یہ ہے کہ اول وقت میں نماز ادا کریں، اور مَردوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ مسجد میں جا کر نماز ادا کریں۔

نماز کی اہمیت دیکھئے

اور اللہ تعالیٰ نے فلاح یافتہ بندوں کی صفات کا بیان شروع بھی نماز سے کیا تھا، اور ختم بھی نماز پر کیا، یہ بتانے کے لئے کہ ایک مؤمن کا سب سے اہم کام نماز ہے۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی جب آدھی سے زیادہ دنیا پر حکومت تھی ـــــ آجکل تو لوگ چھوٹی چھوٹی حکومتیں لیے بیٹھے ہیں، اور اپنے آپ کو بادشاہ اور سربراہ اور نہ جانے کیا کیا سمجھتے ہیں، حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی زیرنگیں ان کے دورِ خلافت میں جتنا رقبہ تھا، آج اس وقت اس رقبے میں تقریباً ۱۵ خود مختار ملک بنے ہوئے ہیں، جبکہ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ تنہا اس کے حکمران تھے ـــــ اس وقت ان کی قلمرو میں ان کے ماتحت جتنے گورنر تھے، ان کے نام خط لکھا جو "مؤطا امام مالک" میں موجود ہے، اس خط میں فرمایا:

"اِنَّ اَهَمَّ اَمْرِكُمْ عِنْدِيْ الصَّلَاةُ، فَمَنْ حَفِظَهَا وَحَافَظَ عَلَيْهَا حَفِظَ دِيْنَهُ، وَمَنْ ضَيَّعَهَا فَهُوَ لِمَا سِوَاهَا اَضْيَعُ"(۱)

"یاد رکھو کہ تمہارے سب کاموں میں میرے نزدیک سب سے اہم کام نماز ہے، جس شخص نے نماز کی حفاظت کی، اور اس پر مداومت کی اس نے اپنے دین کی

(۱) مؤطا الإمام مالك، كتاب وقوت الصلاة، باب وقوت الصلاة، رقم: ۵

حفاظت کی، اور جس شخص نے نماز کو ضائع کیا، وہ اور چیزوں کو اور زیادہ ضائع کرے گا"

جنت الفردوس کے وارث

بہر حال! اس لئے قرآنِ کریم نے ان صفات کے بیان کو شروع بھی نماز سے کیا، اور ختم بھی نماز پر کیا، ان صفات کے بعد فرمایا کہ جن لوگوں میں یہ صفات پائی جائیں گی:

(۱) نماز میں خشوع
(۲) فضول کاموں سے بچنا
(۳) زکوۃ کی ادائیگی
(۴) اخلاق کی درستی
(۵) عفت وعصمت کی حفاظت
(۶) امانتوں اور عہد کی پابندی
(۷) نمازوں کی حفاظت

یہ ہیں وہ لوگ جو جنت الفردوس کے وارث ہوں گے، اور ہمیشہ ہمیشہ اس میں رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے، اپنی رحمت سے ہم سب کو یہ ساری صفات عطا فرمائے، اور یہ ساری صفات عطا فرما کر اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنے فضل وکرم اور اپنی رحمت سے جنت میں داخل ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.

نماز اور انفرادی اصلاح ☆

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ
نَحۡمَدُہٗ وَنُصَلِّیۡ عَلٰی رَسُوۡلِہِ الۡکَرِیۡمِ

نماز کے بارے میں اتنی بات تو ہر مسلمان جانتا ہے کہ وہ دینی فرائض میں ایک اہم ترین فریضہ ہے، ایک عظیم الشان عبادت ہے، اور دین کا ستون ہے، لیکن اسی کے ساتھ نماز کی ایک اہم ترین خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ انسان کی انفرادی اصلاح اور اخلاقی تربیت کے لئے نسخۂ اکسیر کی حیثیت رکھتی ہے، قرآن کریم کا ارشاد ہے:

﴿اُتۡلُ مَاۤ اُوۡحِیَ اِلَیۡکَ مِنَ الۡکِتٰبِ وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنۡھٰی عَنِ الۡفَحۡشَآءِ وَالۡمُنۡکَرِ﴾(۱)

''جو کتاب آپ پر بذریعہ وحی نازل کی گئی ہے آپ اس کو پڑھا کیجئے، اور نماز کو قائم کیجئے، بے شک نماز بے حیائی اور ناشائستہ کاموں سے روکتی ہے''

اس آیت میں بڑے واضح انداز سے نماز کی یہ خاصیت بیان فرمائی گئی ہے کہ وہ انسان کو ہر بدی اور ناشائستگی سے روک کر اخلاقی طور پر اس کی اصلاح کرتی ہے، متعدد مستند احادیث کی رُو سے اس کا مطلب یہ ہے کہ اقامتِ صلاۃ میں بالخاصہ یہ تاثیر ہے کہ جو اس کو ادا کرتا ہے اس سے گناہ اور بُری عادتیں رفتہ رفتہ چھوٹتی جاتی ہیں، ہاں شرط یہ ہے کہ نماز کو محض ایک بوجھ سمجھ کر ٹالا نہ جائے، بلکہ قرآن کے الفاظ میں اقامتِ صلاۃ کی جائے۔

اقامتِ صلاۃ کے لفظی معنی نماز کو سیدھا کرنے کے ہیں، اور مراد یہ ہے کہ اس کے تمام ظاہری و باطنی آداب ٹھیک اسی طرح ادا کرنے کی کوشش کی جائے جس طرح آنحضرت ﷺ نے ادا فرمائے، مثلاً ایک تو نماز کی تمام شرائط، سنتوں اور آداب کا صحیح علم حاصل کرکے ان سب کی حتی الوسع رعایت کی جائے، دوسرے یہ کہ جس قدر خضوع وخشوع پیدا کرنا انسان کے بس میں ہے وہ پیدا کرکے اس طرح

☆ نشری تقریریں، ص:۴۱ تا ۴۳، فرد کی اصلاح، ص:۴۹

(۱) العنکبوت: ۴۵

نماز میں کھڑا ہو کہ گویا اللہ تعالیٰ سے عرض معروض کر رہا ہے، اس طرح نماز قائم کرنے والے کو منجانب اللہ خود بخود نیک کاموں کی توفیق ہوتی ہے، اور بدی سے بچنے کا جذبہ بڑھتا چلا جاتا ہے، اور جو شخص نماز پڑھنے کے باوجود بداخلاقیوں اور بداعمالیوں میں مبتلا رہے تو اس کو یہ سمجھ لینا چاہئے کہ اس کی نماز ہی میں قصور ہے، چنانچہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے:

((مَنْ لَمْ تَنْهَهُ صَلَاتُهُ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ فَلَا صَلَاةَ لَهُ))

''جس شخص کی نماز نے اسے بے حیائی اور بدی سے نہ روکا تو اس کی نماز کچھ نہیں''۔(۱)

واقعہ یہ ہے کہ جب نماز اپنے آداب و شرائط کے ساتھ ادا کی جائے تو وہ نمازی کا اللہ تعالیٰ سے ایک خاص تعلق پیدا کر دیتی ہے، اور جس شخص کو یہ تعلق حاصل ہو گیا اس کے لئے ممکن ہی نہیں ہے کہ وہ رفتہ رفتہ دوسرے گناہوں سے باز نہ رہے۔

آنحضرت ﷺ کو ایک شخص کے بارے میں اطلاع ملی کہ وہ رات کو تہجد پڑھتا ہے اور جب صبح ہوتی ہے تو چوری کرتا ہے، آپ نے فرمایا کہ عنقریب نماز اس کو چوری سے روک دے گی، چنانچہ کچھ ہی عرصہ کے بعد وہ شخص چوری سے تائب ہو گیا۔ (۲)

آج کل ہم میں سے بعض لوگ جو بظاہر پابندِ نماز ہونے کے باوجود طرح طرح کے گناہوں یا بداعمالیوں میں مبتلا رہتے ہیں تو حدیثِ نبوی ﷺ کے مطابق ان کی نماز میں کہیں نہ کہیں نقص ہے، اگر اس نقص کو دور کر لیا جائے تو اللہ تعالیٰ کے اس وعدے کے مطابق نماز یقیناً برائیوں سے روکے گی، اور اس طرح یہ عبادت اس کی اخلاقی اصلاح کا بہترین ذریعہ ثابت ہو گی۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو توفیق عطا فرمائے کہ نماز کو اس کے تمام ظاہری اور باطنی آداب کے ساتھ ادا کریں، اور دنیا و آخرت میں اس کے بہترین ثمرات سے مستفید ہوں۔ آمین

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.

(۱) تفسیر ابن کثیر (۳/ ۵۴۵) سورۃ العنکبوت، مطبوعہ قدیمی کتب خانہ کراچی

(۲) تفسیر ابن کثیر (۳/۵٤٦)

ارکانِ نماز، ایک نظر میں ☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

"أَمَّا بَعْدُ! فَأَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ○ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ○
﴿قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ إِلَّا عَلٰى أَزْوَاجِهِمْ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ فَإِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ○﴾ (۱)

بزرگانِ محترم و برادرانِ عزیز! سورۃ مؤمنون کی ابتدائی چند آیات میں نے آپ کے سامنے تلاوت کیں، جن کی تشریح کا سلسلہ میں نے دو ہفتے پہلے شروع کیا ہے۔ ان آیات میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان مؤمنوں کی صفات بیان فرمائی ہیں جن کے بارے میں قرآن کریم نے فرمایا کہ وہ فلاح یافتہ ہیں اور جن کو دنیا و آخرت میں فلاح نصیب ہوگی۔ ان میں سے سب سے پہلی صفت جس کا ان آیات میں بیان کیا گیا، وہ نماز میں خشوع اختیار کرنا ہے۔ چنانچہ فرمایا کہ وہ مؤمن فلاح یافتہ ہیں جو اپنی نماز میں خشوع اختیار کرنے والے ہیں۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا کہ عام طور پر دو لفظ استعمال ہوتے ہیں، ایک "خشوع" اور دوسرا "خضوع" ـــــ "خشوع" کے معنی ہیں "دل کو اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ کرنا" اور "خضوع" کے معنی ہیں، اعضاء کو سنت کے مطابق اللہ تعالیٰ کے آگے جھکا دینا۔ گزشتہ جمعہ یہ بیان شروع کیا تھا کہ نماز میں اعضاء کس طرح رکھنے چاہئیں جس کے نتیجے میں "خضوع" حاصل ہو، تکبیر تحریمہ کا طریقہ اور ہاتھ باندھنے کا مسنون طریقہ اور قرأت کا صحیح طریقہ عرض کر دیا تھا۔

قیام کا مسنون طریقہ

قیام یعنی نماز میں کھڑے ہونے کا مسنون طریقہ یہ ہے کہ آدمی بالکل سیدھا کھڑا ہو اور نگاہیں

☆ اصلاحی خطبات (۲۰۴/۱۴ تا ۲۲۰) بعد از نمازِ عصر، جامع مسجد بیت المکرّم، کراچی

(۱) المؤمنون: ۱ تا ۷

سجدے کی جگہ پر ہوں، سجدے کی جگہ کی طرف نظر ہونے کی وجہ سے انسان کے جسم کا اوپر والا تھوڑا سا حصہ آگے کی طرف جھکا ہوا ہوگا، اس سے زیادہ جھکنا پسندیدہ نہیں، چنانچہ بعض لوگ نماز میں بہت زیادہ جھک جاتے ہیں اور اس کے نتیجے میں کمر میں خم آجاتا ہے، یہ طریقہ پسندیدہ نہیں بلکہ سنت کے خلاف ہے۔ لہٰذا قیام کے وقت اس طرح سیدھا کھڑا ہونا چاہئے کہ کمر میں خم نہ آئے البتہ سر تھوڑا سا جھکا ہوا ہوتا کہ نظریں سجدے کی جگہ پر ہو جائیں۔ یہ کھڑے ہونے کا مسنون طریقہ ہے۔

بے حرکت کھڑے ہوں

اور جب کھڑا ہو تو آدمی یہ کوشش کرے کہ بے حس وحرکت کھڑا ہو اور جسم میں حرکت نہ ہو۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے:

﴿وَقُومُوا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ﴾ (۱)

یعنی اللہ تعالیٰ کے سامنے نماز میں کھڑے ہوں تو بے حرکت کھڑے ہوں۔ اکثر لوگ اس کا خیال نہیں کرتے، جب کھڑے ہوتے ہیں تو جسم کو آگے پیچھے حرکت دیتے رہتے ہیں، بلاوجہ کبھی اپنے ہاتھوں کو حرکت دیتے ہیں، کبھی پسینہ پونچھتے ہیں، کبھی کپڑے ٹھیک کرتے ہیں، یہ ساری باتیں اس ''قنوت'' کے خلاف ہیں جس کا قرآن کریم نے ہمیں اور آپ کو حکم دیا ہے۔

احکم الحاکمین کے دربار میں کھڑے ہو

جب نماز میں کھڑے ہو تو یہ تصور کرو کہ تم اللہ تعالیٰ کے دربار میں کھڑے ہو، جب آدمی دنیا کے کسی معمولی حکمران کے سامنے بھی کھڑا ہوتا ہے تو ادب کا مظاہرہ کرتا ہے، کوئی بدتمیزی نہیں کرتا، لاپرواہی سے کھڑا نہیں ہوتا، تو جب تم احکم الحاکمین کے سامنے پہنچے ہو تو وہاں پر لاپرواہی کا مظاہرہ کرنا اور ڈھیلا ڈھالا کھڑا ہونا اور اپنے ہاتھ پاؤں کو بلاوجہ حرکت دینا، یہ سب نماز کے آداب کے بالکل خلاف ہے اور سنت کے بھی خلاف ہے۔ فقہاء کرام نے یہاں تک لکھا ہے کہ اگر کوئی شخص ایک رکن میں بلاضرورت ہاتھ کو تین مرتبہ حرکت دے گا تو اس کی نماز فاسد ہو جائے گی۔ اس کی تفصیل میں نے گزشتہ جمعوں میں عرض کر دی تھی۔

رکوع کا مسنون طریقہ

قیام کے بعد رکوع کا مرحلہ آتا ہے جب آدمی رکوع میں جائے تو اس کی کمر سیدھی ہو جائے،

(۱) البقرہ: ۲۳۸

بعض لوگ رکوع میں اپنی کمر کو بالکل سیدھا نہیں کرتے، یہ سنت کے خلاف ہے، بلکہ بعض فقہاء کے نزدیک اس کی وجہ سے نماز فاسد ہو جاتی ہے۔ لہٰذا کمر بالکل سیدھی ہو اور ہاتھ کی انگلیوں کو کھول کر گھٹنے پکڑ لینے چاہئیں، اور گھٹنے بھی سیدھے ہونے چاہئیں اس میں بھی خم نہ ہو، اور ڈھیلے ڈھالے نہ ہوں، بلکہ کسے ہوئے ہوں، یہ رکوع کا سنت طریقہ ہے، اس طریقے میں جتنی کمی آئے گی اتنی ہی سنت سے دوری ہوگی، اور نماز کے انوار و برکات میں کمی آئے گی۔

''قومہ'' کا مسنون طریقہ

رکوع کے بعد جب آدمی "سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ" کہتے ہوئے کھڑا ہوتا ہے، اس کو ''قومہ'' کہا جاتا ہے، اس قومہ کی ایک سنت آج کل متروک ہوگئی ہے، وہ یہ کہ اس قومہ میں بھی آدمی کو کچھ دیر کھڑا ہونا چاہئے، یہ نہیں کہ ابھی پوری طرح کھڑے بھی نہ ہونے پائے تھے کہ سجدے میں چلے گئے۔ ایک حدیث میں ایک صحابی بیان فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا معمول یہ تھا کہ جتنی دیر آپ رکوع میں رہتے، اتنی ہی دیر قومہ میں بھی رہتے، مثلاً اگر رکوع میں پانچ مرتبہ "سُبْحَانَ رَبِّیَ الْعَظِیْمِ" کہا تو جتنا وقت پانچ مرتبہ "سُبْحَانَ رَبِّیَ الْعَظِیْمِ" کہنے میں لگا اور وہ وقت آپ نے رکوع میں گزارا، تقریباً اتنا ہی وقت آپ قومہ میں گزارتے تھے، اس کے بعد سجدہ میں تشریف لے جاتے، آج ہم لوگ رکوع سے اُٹھتے ہوئے ذرا سی دیر میں "سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ" کہتے ہیں اور پھر فوراً سجدے میں چلے جاتے ہیں، یہ طریقہ سنت کے مطابق نہیں۔

''قومہ'' کی دعائیں

اور حدیث شریف میں آتا ہے کہ آپ ﷺ قومہ میں یہ الفاظ پڑھا کرتے تھے:

((رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ، مِلْأَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَمِلْأَ مَا بَيْنَهُمَا وَمِلْأَ مَا شِئْتَ مِنْ شَيْءٍ بَعْدُ)) (۱)

بعض احادیث میں یہ الفاظ آئے ہیں:

(۱) سنن البیهقی الکبری، رقم:۲۴۳٦(۲/۹۴)، مصنف ابن أبی شیبة، رقم:۲۹۰٦(۲/۱٦۵)، مسند الطیالسی، رقم:۱۵۲(۱/۲۳)، اس دعا کا ترجمہ یہ ہے "اے ہمارے رب! سب تعریفیں تیرے لئے ہیں ایسی تعریفیں جو زمین و آسمان کو بھر دینے والی، ان کے درمیان کو بھر دینے والی اور ان کے بعد جو تو چاہے اس چیز کو بھر دینے والی ہیں"

((رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ حَمْدًا كَثِيرًا طَيِّبًا مُبَارَكًا فِيهِ كَمَا يُحِبُّ رَبُّنَا وَيَرْضَى))[۱]

اس سے پتہ چلا آپ ﷺ اتنی دیر قومہ میں کھڑے رہتے جتنی دیر میں یہ الفاظ ادا فرماتے۔ لہٰذا قومہ میں صرف قیام کا اشارہ کر کے سجدہ میں چلے جانا درست نہیں۔ بلکہ اگر کوئی آدمی سیدھا کھڑا بھی نہیں ہوا تھا کہ وہیں سے سجدے میں چلا گیا تو نماز واجب الاعادہ ہو جاتی ہے۔ لہٰذا سیدھا کھڑا ہونا ضروری ہے۔

ایک صاحب کی نماز کا واقعہ

حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ حضورِ اقدس ﷺ مسجدِ نبوی میں تشریف فرما تھے، ایک صاحب آئے اور مسجدِ نبوی میں نماز پڑھنی شروع کر دی، لیکن نماز اس طرح پڑھی کہ رکوع میں گئے تو ذرا سا اشارہ کر کے کھڑے ہو گئے اور قومہ میں ذرا سا اشارہ کر کے سجدہ میں چلے گئے اور سجدہ میں گئے تو ذرا سی دیر میں سجدہ کر کے کھڑے ہو گئے۔ اس طرح انہوں نے جلد جلد ارکان ادا کر کے نماز مکمل کر لی، اور پھر حضورِ اقدس ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر سلام عرض کیا، جواب میں حضورِ اقدس ﷺ نے فرمایا:

((وَعَلَيْكُمُ السَّلَامُ، قُمْ فَصَلِّ فَإِنَّكَ لَمْ تُصَلِّ))

یعنی سلام کا جواب دینے کے بعد فرمایا کہ کھڑے ہو کر نماز پڑھو، اس لئے کہ تم نے نماز نہیں پڑھی۔ وہ صاحب اُٹھ کر گئے اور دوبارہ نماز پڑھی، لیکن دوبارہ بھی اسی طرح نماز پڑھی جس طرح پہلی مرتبہ پڑھی تھی، اس لئے کہ ان کو اسی طرح پڑھنے کی عادت پڑی ہوئی تھی۔ نماز پڑھنے کے بعد پھر حضورِ اقدس ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آ کر سلام کیا، آپ ﷺ نے سلام کا جواب دیا اور فرمایا:

((قُمْ فَصَلِّ فَإِنَّكَ لَمْ تُصَلِّ))

جاؤ نماز پڑھو کیونکہ تم نے نماز نہیں پڑھی۔ تیسری مرتبہ پھر انہوں نے جا کر اسی طرح پڑھی اور واپس آئے تو پھر آپ ﷺ نے ان سے فرمایا کہ

---

(۱) صحيح البخاري، كتاب الأذان، باب فضل اللّٰهم ربنا لك الحمد، رقم: ٧٥٧ سنن النسائي، كتاب التطبيق، باب مايقول المأموم، رقم: ١٠٥٢، اس دعا کا ترجمہ یہ ہے "اے ہمارے رب! تمام تعریفیں تیرے لئے ہیں ایسی تعریفیں جو مقدار میں زیادہ، پاکیزہ اور بابرکت ہیں، یہ تعریفیں ایسے ہیں جیسے ہمارے رب چاہے اور راضی ہو"

((قُمْ فَصَلِّ فَإِنَّكَ لَمْ تُصَلِّ))

جاؤ نماز پڑھو، کیونکہ تم نے نماز نہیں پڑھی۔ جب تیسری مرتبہ آپ ﷺ نے ان سے یہی بات ارشاد فرمائی تو ان صاحب نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ! آپ مجھے بتا دیجئے کہ میں نے کیا غلطی کی ہے، اور مجھے کس طرح نماز پڑھنی چاہئے؟ اس کے بعد حضورِ اقدس ﷺ نے ان کو نماز کا صحیح طریقہ بتایا۔ (۱)

ابتداءً نماز کا طریقہ بیان نہ کرنے کی وجہ

سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضورِ اقدس ﷺ نے ان سے یہ تو فرمادیا کہ جاؤ نماز پڑھو تم نے نماز نہیں پڑھی، پہلی مرتبہ میں ان کو نماز کا صحیح طریقہ کیوں نہیں بتایا؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ درحقیقت ان صاحب کو خود پوچھنا چاہئے تھا کہ یا رسول اللہ ﷺ! میں نماز پڑھ کر آرہا ہوں، آپ فرمارہے ہیں کہ نماز نہیں پڑھی، مجھ سے کیا غلطی ہوئی؟ جب انہوں نے نہیں پوچھا تو حضورِ اقدس ﷺ نے بھی نہیں بتایا، اس کے ذریعہ حضورِ اقدس ﷺ نے یہ اصول بتلادیا کہ جب تک انسان کے دل میں خود طلب پیدا نہ ہو، اس کو تعلیم دینا بعض اوقات بیکار ہو جاتا ہے، اس لئے حضورِ اقدس ﷺ اس انتظار میں تھے کہ ان کے اندر خود طلب پیدا ہو، جب تیسری مرتبہ حضورِ اقدس ﷺ نے ان کو واپس لوٹا دیا، اس وقت انہوں نے کہا:

"يَا رَسُولَ اللّٰهِ! أَرِنِيْ وَعَلِّمْنِيْ"

یا رسول اللہ ﷺ! آپ مجھے سکھائیے کہ کس طرح نماز پڑھنی چاہئے۔ اس وقت پھر آپ ﷺ نے ان کو نماز پڑھنا سکھایا۔

اطمینان سے نماز ادا کرو

بہرحال! ایک طرف حضورِ اقدس ﷺ کو ان کی طلب کا انتظار تھا کہ جب ان کے اندر طلب پیدا ہو تو ان کو بتایا جائے، دوسری طرف یہ بات تھی کہ آپ نے سوچا کہ جب یہ دو تین مرتبہ نماز دہرائیں گے، اور اس کے بعد نماز کا صحیح طریقہ سیکھیں گے تو وہ طریقہ دل میں زیادہ پیوست ہوگا اور اس بتانے کی اہمیت زیادہ ہوگی۔ اس لئے آپ ﷺ نے تین مرتبہ ان کو نماز پڑھنے کا حکم دیا، اس کے بعد حضورِ اقدس ﷺ نے بتایا کہ جب تم نماز پڑھو تو ہر رکن کو اس کے صحیح طریقے پر ادا کرو، جب قرأت

(۱) صحیح البخاری، کتاب الأذان، باب وجوب القراءة...... الخ، رقم: ۷۱۵، صحیح مسلم، کتاب الصلاة، باب وجوب قراءة الفاتحة، رقم: ۶۰۲، سنن الترمذی، کتاب الصلاة، رقم: ۲۷۹

کرو تو اطمینان سے تلاوت کرو، جب کھڑے ہو تو اطمینان کے ساتھ کھڑے ہو، اور جب رکوع میں جاؤ تو اطمینان کے ساتھ رکوع کرو، یہاں تک کہ تمہاری کمر سیدھی ہو جائے، جب رکوع سے کھڑے ہو تو اطمینان کے ساتھ اس طرح سیدھے کھڑے ہو جاؤ کہ کمر میں خم باقی نہ رہے، اس کے بعد جب سجدہ میں جاؤ تو اطمینان کے ساتھ سجدہ کرو اور جب سجدہ سے اُٹھو تو اطمینان کے ساتھ اُٹھو، اس طرح نماز کی پوری تفصیل حضورِ اقدس ﷺ نے ان کو بتلائی، اور تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے وہ تفصیل سنی۔ جن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے نماز کے بارے میں یہ تفصیل سنی تو انہوں نے فرمایا کہ ان صاحب کی وجہ سے ہمیں رسولِ کریم ﷺ کی زبانِ مبارک سے نماز کے شروع سے لے کر آخر تک پورا طریقہ سننا اور سیکھنا نصیب ہو گیا۔

نماز واجب الاعادہ ہوگی

اس حدیث میں حضورِ اقدس ﷺ نے ان صاحب سے فرمایا کہ جاؤ نماز پڑھو کیونکہ تم نے نماز نہیں پڑھی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر رکوع میں یا قومہ میں یا سجدہ میں اس قسم کی کوتاہی رہ جائے تو نماز واجب الاعادہ ہوگی۔ لہٰذا اگر رکوع کے اندر کمر سیدھی نہیں ہوئی، یا قومہ کے اندر کمر سیدھی نہیں ہوئی اور بس اشارہ کر کے آدمی اگلے رکن میں چلا گیا جیسا کہ بہت سے لوگ کرتے ہیں تو اس حدیث کی رُو سے نماز واجب الاعادہ ہے۔ اس لئے اس کا بہت اہتمام کرنا چاہئے اور بہتر یہ ہے کہ قومہ میں بھی اتنا ہی وقت لگائے جتنا وقت رکوع میں لگایا ہے۔

قومہ کا ایک ادب

ایک صحابی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ بعض مرتبہ رسول کریم ﷺ کو ہم نے دیکھا کہ آپ ﷺ رکوع سے قومہ میں کھڑے ہوئے تو اتنی آپ دیر کھڑے رہے کہ ہمیں یہ خیال ہونے لگا کہ کہیں آپ بھول تو نہیں گئے کیونکہ آپ ﷺ نے رکوع لمبا فرمایا تھا اس لئے قومہ بھی لمبا فرمایا اور اس کے بعد آپ سجدے میں تشریف لے گئے۔ یہ قومہ کا ادب ہے۔

سجدہ میں جانے کا طریقہ

قومہ کے بعد آدمی سجدہ کرتا ہے۔ سجدہ میں جانے کا طریقہ یہ ہے کہ آدمی سیدھا سجدے میں جائے، یعنی سجدے میں جاتے وقت کمر کو پہلے سے نہ جھکائے، جب تک گھٹنے زمین پر نہ ٹکیں اس وقت تک اُوپر کا بدن بالکل سیدھا رہے، البتہ جب گھٹنے زمین پر رکھ دے اس کے بعد اُوپر کا بدن آگے کی

طرف جھکاتے ہوئے سجدے میں چلا جائے، یہ طریقہ زیادہ بہتر ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص پہلے سے جھک جائے تو اس سے نماز فاسد نہیں ہوتی۔ لیکن فقہاء کرام نے اس طریقے کو زیادہ پسند فرمایا ہے۔

سجدہ میں جانے کی ترتیب

سجدہ میں جانے کی ترتیب یہ ہے کہ پہلے گھٹنے زمین پر لگنے چاہئیں، اس کے بعد ہتھیلیاں، اس کے بعد ناک اس کے بعد پیشانی زمین پر ٹکنی چاہئے اور اس کو آسانی سے یاد رکھنے کا طریقہ یہ ہے کہ جو عضو زمین سے جتنا قریب ہے وہ اتنا ہی پہلے جائے گا، چنانچہ گھٹنے زمین سے زیادہ قریب ہیں اس لئے پہلے گھٹنے جائیں گے پھر ہاتھ قریب ہیں تو ہاتھ پہلے ٹکیں گے۔ اس کے بعد ناک قریب ہے اس کے بعد آخر میں پیشانی زمین پر ٹکے گی۔ سجدہ میں جانے کی یہ ترتیب ہے، اس ترتیب سے سجدے میں جائے۔

پاؤں کی انگلیاں زمین پر ٹیکنا

اور سجدہ کرتے وقت یہ سب اعضاء بھی سجدے میں جاتے ہیں، لہٰذا سجدہ دو ہاتھ، دو گھٹنے، دو پاؤں، ناک اور پیشانی یہ سب اعضاء سجدے میں جانے چاہئیں اور زمین پر ٹکنے چاہئیں۔ اکثر لوگ سجدے میں پاؤں زمین پر نہیں ٹیکتے، پاؤں کی انگلیاں اُوپر رہتی ہیں، اگر پورے سجدے میں ایک لمحہ کے لئے بھی انگلیاں زمین پر نہ ٹکیں تو سجدہ ہی نہیں ہوگا اور نماز فاسد ہو جائے گی، البتہ اگر ایک لمحہ کے لئے بھی ''سبحان اللہ'' کہنے کے بقدر انگلیاں زمین پر ٹک گئیں تو سجدہ اور نماز ہو جائے گی، لیکن سنت کے خلاف ہوگی۔ کیونکہ سنت یہ ہے کہ پورے سجدے میں دونوں پاؤں کی انگلیاں زمین پر ٹکی ہوئی ہوں، اور ان انگلیوں کا رخ بھی قبلہ کی طرف ہونا چاہئے۔ لہٰذا اگر انگلیاں زمین پر ٹک تو گئیں لیکن ان کا رُخ قبلہ کی طرف نہ ہوا تو بھی سنت کے خلاف ہے۔

سجدہ میں سب سے زیادہ قربِ خداوندی

یہ سجدہ ایسی چیز ہے کہ اس سے زیادہ لذیذ عبادت دنیا میں کوئی اور نہیں، اور سجدہ سے زیادہ اللہ تعالیٰ کے قرب کا کوئی اور ذریعہ نہیں، حدیث شریف میں آتا ہے کہ بندہ اللہ تعالیٰ سے کسی حال میں اتنا قریب نہیں ہوتا جتنا سجدہ کی حالت میں ہوتا ہے۔ (۱)

(۱) صحیح مسلم، کتاب الصلاۃ، باب مایقال فی الرکوع والسجود، رقم:۷٤٤، سنن النسائی، کتاب التطبیق، باب أقرب مایکون العبد من اللہ عز وجل، رقم:۱۱۲۵، سنن أبی داؤد، کتاب الصلاۃ، باب فی الدعاء فی الرکوع والسجود، رقم:۷٤۱، مسند أحمد، رقم:۹۰۸۳

کیونکہ جب انسان اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں سجدہ کر رہا ہوتا ہے اس وقت اس کا پورا جسم پورا وجود اللہ تعالیٰ کے آگے جھکا ہوا ہوتا ہے، لہٰذا تمام اعضاء کو جھکا ہوا ہونا چاہئے اور اسی طریقے پر جھکا ہونا چاہئے جو طریقہ رسول اللہ ﷺ نے تلقین فرمایا اور جس پر آپ نے عمل فرمایا۔

خواتین بالوں کا جوڑا کھول دیں

اس لئے فرمایا گیا کہ عورتوں کے لئے بالوں کا جوڑا باندھ کر نماز پڑھنا کراہت سے خالی نہیں، اگرچہ نماز ہو جائے گی اس لئے کہ علماء کرام نے فرمایا کہ اگر بالوں کا جوڑا بندھا ہوا ہوگا تو بال سجدے میں نہیں جائیں گے کیونکہ اس صورت میں بال اُوپر کی طرف کھڑے ہوں گے، اور سجدے کی پوری کیفیت حاصل نہ ہوگی، اس لئے عورتوں کو چاہئے کہ نماز شروع کرنے سے پہلے اپنے جوڑے کو کھول لیں، تاکہ بال بھی سجدے میں نیچے کی طرف گریں اُوپر کی طرف کھڑے نہ رہیں اور ان کو بھی سجدے کے انوار و برکات حاصل ہو جائیں، کیونکہ سجدے کے علاوہ کسی اور حالت میں اللہ تعالیٰ کا اتنا قرب حاصل نہیں ہوتا۔

نماز مؤمن کی معراج ہے

دیکھئے! اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو معراج کا ایسا عظیم مرتبہ عطا فرمایا جو کائنات میں کسی اور کو عطا نہیں ہوا۔ اس مقام پر پہنچے جہاں جبرئیل امین علیہ السلام بھی نہیں پہنچ سکتے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو اپنا قربِ خاص عطا فرمایا، جس کا ہم اور آپ تصور بھی نہیں کر سکتے، معراج کے موقع پر آپ ﷺ نے زبانِ حال سے یہ عرض کیا کہ یا اللہ! آپ نے مجھے تو قرب کا اتنا بڑا مقام عطا فرما دیا، میرے اُمتیوں کو یہ مقام کیسے حاصل ہو؟ اللہ تبارک وتعالیٰ نے جواب میں نماز کا تحفہ دیدیا، اور فرمایا کہ جاؤ اپنی اُمت سے کہنا کہ پانچ نمازیں پڑھا کرے اور جب آپ کی اُمت نماز پڑھے گی تو اس میں سجدہ بھی کرے گی اور جب سجدہ کرے گی تو ان کو میرا قرب حاصل ہو جائے گا، اسی لئے فرمایا گیا:

((اَلصَّلَاةُ مِعْرَاجُ الْمُؤْمِنِيْنَ)) (۱)

''نماز مؤمنین کی معراج ہے''

کیونکہ ہمارے اور آپ کے بس میں یہ تو نہیں ہے کہ ساتوں آسمانوں کو عبور کر کے ملأ اعلیٰ میں پہنچ جائیں اور سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچیں، لیکن سرکارِ دو عالم ﷺ کے صدقے میں ہر مؤمن کو یہ معراج عطا ہو گئی کہ سجدے میں جاؤ اور اللہ تعالیٰ کے قریب ہو جاؤ۔ لہٰذا یہ سجدہ معمولی چیز نہیں۔ اس لئے اس کو قدر سے کرو۔

(۱) تفسیر حقی (۴۵۳/۸)، روح المعانی (۸۹/۱)

سجدہ کی فضیلت

جس وقت تم اپنے سارے وجود کو اللہ تعالیٰ کے سامنے جھکا رہے ہوتے ہو اس وقت ساری کائنات تمہارے آگے جھکی ہوئی ہوتی ہے۔

سر بر قدم حسن، قدم بر کلاہ و تاج

جس وقت تمہارا قدم حسن پر ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں سجدہ ریز ہوتا ہے تو اس وقت تمہارا پاؤں سارے کلاہ و تاج پر ہوتا ہے۔ ساری کائنات اس کے نیچے ہوتی ہے۔ اقبال کہتے ہیں۔

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات

یہ ایک سجدہ ہزار سجدوں سے نجات دے دیتا ہے، کیونکہ اگر یہ سجدہ انسان نہ کرے تو ہر جگہ سجدہ کرنا پڑتا ہے، کبھی حاکم کے سامنے، کبھی افسر کے سامنے، کبھی امیر کے سامنے۔ لیکن جو شخص اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں سجدہ کر رہا ہے، وہ کسی اور کے آگے سجدہ نہیں کرتا۔ لہٰذا اس سجدے کو قدر اور محبت سے کرو پیار سے کرو۔

سجدہ میں کیفیت

حضرت شاہ فضل رحمٰن صاحب گنج مرادآبادی رحمۃ اللہ علیہ بڑے درجے کے اولیاء اللہ میں سے تھے، ایک مرتبہ حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ ان کی زیارت کے لئے تشریف لے گئے، وہ عجیب شان کے بزرگ تھے، جب واپس آنے لگے تو چپکے سے ان سے کہنے لگے:

''میاں اشرف علی! ایک بات کہتا ہوں وہ یہ کہ جب میں سجدے میں جاتا ہوں تو یوں لگتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پیار کر لیا''

بہر حال! یہ سجدہ محبت سے کرو، پیار سے کرو، کیونکہ یہ سجدہ تمہیں ہزار سجدوں سے نجات دے رہا ہے اور تمہیں اللہ تعالیٰ کا قرب عطا کر رہا ہے جو اور کسی ذریعے سے حاصل نہیں ہو سکتا۔

سجدہ میں کہنیاں کھولنا

لہٰذا جب سجدہ کرو تو اس کو صحیح طریقے سے کرو، سجدہ میں تمہارے اعضاء اسی طرح ہونے چاہئیں جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہوا کرتے تھے، وہ اس طرح کہ کہنیاں پہلو سے جدا ہوں۔ البتہ کہنیاں پہلو سے الگ ہونے کے نتیجے میں برابر والے نمازی کو تکلیف نہ ہو، بعض لوگ اپنی کہنیاں اتنی

زیادہ دور کر دیتے ہیں کہ دائیں بائیں والے نمازیوں کو تکلیف ہوتی ہے، یہ طریقہ بھی سنت کے خلاف ہے، جائز نہیں، اس لئے کہ کسی انسان کو تکلیف پہنچانا کبیرہ گناہ ہے ـــــ اور سجدہ میں کم از کم تین مرتبہ "سُبْحَانَ رَبِّیَ الْاَعْلٰی" کہے، زیادہ کی توفیق ہو تو پانچ مرتبہ، سات مرتبہ، گیارہ مرتبہ کہے، اور محبت، عظمت اور قدر سے یہ تسبیح پڑھے۔

جلسہ کی کیفیت و دعا

جب پہلا سجدہ کر کے آدمی بیٹھتا ہے تو اس کو جلسہ کہتے ہیں۔ جلسہ میں کچھ دیر اطمینان سے بیٹھنا چاہئے، یہ نہ کریں کہ بیٹھتے ہی فوراً دوبارہ سجدے میں چلے گئے۔ ایک صحابی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جلسے میں بھی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم تقریباً اتنی دیر بیٹھا کرتے تھے جتنی دیر سجدے میں، جتنا وقت سجدے میں گزرتا، تقریباً اتنا ہی وقت جلسے میں بھی گزرتا تھا، یہ سنت بھی متروک ہوتی جارہی ہے، اور جلسے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ دعا پڑھنا ثابت ہے:

((اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لِیْ ذَنْبِیْ، اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لِیْ وَاسْتُرْنِیْ وَاجْبُرْنِیْ وَاھْدِنِیْ وَارْزُقْنِیْ))(۱)

لہٰذا اتنا وقت جلسے میں گزرنا چاہئے جس میں یہ دعا پڑھی جاسکے۔ اور پھر دوسرے سجدے میں جائے۔

بہر حال! یہ ایک رکعت کا بیان تکبیر تحریمہ سے لے کر سجدہ تک کا ہو گیا، اللہ تعالیٰ نے توفیق دی تو باقی بیان اگلے جمعہ کو عرض کروں گا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو سنت کے مطابق نماز پڑھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ.

(۱) سنن الترمذی، کتاب الصلاۃ، باب ما یقول بن السجدتین، رقم: ۲۶۲ سنن ابن ماجہ، کتاب اقامۃ الصلاۃ والسنۃ فیھا، رقم: ۸۸۸، اس دعا کا ترجمہ یہ ہے "اے اللہ! میرے گناہوں کو معاف فرما، اے اللہ! میری مغفرت فرما، میرا پردہ فرما، مجھے سلامتی عطا فرما، مجھے ہدایت دے اور مجھے رزق عطا فرما"

نمازیں سنت کے مطابق پڑھئے ☆

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَکَفٰی، وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی

نماز دین کا ستون ہے، اس کو ٹھیک ٹھیک سنت کے مطابق ادا کرنا ہر مسلمان کی ذمہ داری ہے۔ ہم لوگ بے فکری کے ساتھ نماز کے ارکان جس طرح سمجھ میں آتا ہے، ادا کرتے رہتے ہیں، اور اس بات کی فکر نہیں کرتے کہ وہ ارکان مسنون طریقے سے ادا ہوں، اس وجہ سے ہماری نمازیں سنت کے انوار و برکات سے محروم رہتی ہیں، حالانکہ ان ارکان کو ٹھیک ٹھیک ادا کرنے سے نہ وقت زیادہ خرچ ہوتا ہے، نہ محنت زیادہ ہوتی ہے، بس ذرا سی توجہ کی بات ہے۔ اگر ہم تھوڑی سی توجہ دے کر صحیح طریقہ سیکھ لیں اور اس کی عادت ڈال لیں تو جتنے وقت میں ہم آج نماز پڑھتے ہیں، اُتنے ہی وقت میں وہ نماز سنت کے مطابق ادا ہو جائے گی، اور اس کا اجر و ثواب بھی اور انوار و برکات بھی آج سے کہیں زیادہ ہوں گے۔

حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو نماز کا ایک ایک عمل خوب توجہ کے ساتھ سنت کے مطابق انجام دینے کا بڑا اہتمام تھا، اور وہ ایک دوسرے سے سنتیں سیکھتے بھی رہتے تھے۔

اسی ضرورت کے پیشِ نظر احقر نے اپنی ایک مجلس میں نماز کا مسنون طریقہ اور اس سلسلے میں جو غلطیاں رواج پا گئی ہیں، اُن کی تفصیل بیان کی تھی جس سے بفضلہٖ تعالیٰ سامعین کو بہت فائدہ ہوا۔ بعض احباب نے خیال ظاہر کیا کہ یہ باتیں ایک مختصر سے رسالے کی شکل میں آجائیں تو ہر شخص اس سے فائدہ اُٹھا سکے گا۔ چنانچہ اس مختصر سے رسالے میں نماز کا مسنون طریقہ اور اس کو آداب کے ساتھ ادا کرنے کی ترکیب بیان کرنی مقصود ہے، اللہ تعالیٰ اس کو ہم سب کے لئے مفید بنائیں، اور اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائیں۔ آمین

نماز کے مسائل پر بہت سی چھوٹی بڑی کتابیں بحمد اللہ شائع ہو چکی ہیں، یہاں نماز کے تمام مسائل بیان کرنا مقصود نہیں ہے، بلکہ صرف نماز کے ارکان کی ہیئت سنت کے مطابق بنانے کے لئے چند ضروری باتیں بیان کرنی ہیں، اور ان غلطیوں اور کوتاہیوں پر تنبیہ کرنی ہے جو آج کل بہت زیادہ رواج پا گئی ہیں۔

☆ ''نمازیں سنت کے مطابق پڑھئے'' (مختصر رسالہ) مطبوعہ ادارہ اسلامیات، لاہور

ان چند مختصر باتوں پر عمل کرنے سے انشاء اللہ نماز کی کم از کم ظاہری صورت سنت کے مطابق ہو جائے گی، اور ایک مسلمان اپنے پروردگار کے حضور کم از کم یہ عرضداشت پیش کر سکے گا کہ۔

ترے محبوب کی یا رب! شباہت لے کے آیا ہوں
حقیقت اس کو تو کر دے، میں صورت لے کے آیا ہوں

نماز شروع کرنے سے پہلے

یہ باتیں یاد رکھئے، اور ان پر عمل کا اطمینان کر لیجئے:

(۱) آپ کا رُخ قبلے کی طرف ہونا ضروری ہے۔

(۲) آپ کو سیدھا کھڑے ہونا چاہئے اور آپ کی نظر سجدے کی جگہ پر ہونی چاہئے۔ گردن کو جھکا کر ٹھوڑی سینے سے لگالینا بھی مکروہ، اور بلاوجہ سینے کو جھکا کر کھڑا ہونا بھی درست نہیں۔ اِس طرح سیدھے کھڑے ہوں کہ نظر سجدے کی جگہ پر رہے۔

(۳) آپ کے پاؤں کی اُنگلیوں کا رُخ بھی قبلے کی جانب ہو، اور دونوں پاؤں سیدھے قبلہ رُخ ہوں (پاؤں کو دائیں بائیں ترچھا رکھنا خلافِ سنت ہے) دونوں پاؤں قبلہ رُخ ہونے چاہئیں:

غلط طریقہ

صحیح طریقہ

(۴) دونوں پاؤں کے درمیان کم از کم چار اُنگل کا فاصلہ ہونا چاہئے۔

(۵) اگر جماعت سے نماز پڑھ رہے ہیں تو آپ کی صف سیدھی رہے، صف سیدھی کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ہر شخص اپنی دونوں ایڑھیوں کے آخری سرے صف یا اس کے نشان کے آخری کنارے پر رکھ لے، اس طرح:

(۶) جماعت کی صورت میں اس بات کا بھی اطمینان کرلیں کہ دائیں بائیں کھڑے ہونے والوں کے بازوؤں کے ساتھ آپ کے بازو ملے ہوئے ہیں، اور بیچ میں کوئی خلا نہیں ہے۔

(۷) پاجامے کو ٹخنے سے نیچے لٹکانا ہر حالت میں ناجائز ہے، ظاہر ہے کہ نماز میں اس کی شناعت اور بڑھ جاتی ہے، لہٰذا اس کا اطمینان کرلیں کہ پاجامہ ٹخنے سے اُونچا ہے۔

(۸) ہاتھ کی آستینیں پوری طرح ڈھکی ہوئی ہونی چاہئیں، صرف ہاتھ کھلے رہیں، بعض لوگ آستینیں چڑھا کر نماز پڑھتے ہیں۔ یہ طریقہ درست نہیں ہے۔

(۹) ایسے کپڑے پہن کر نماز میں کھڑے ہونا مکروہ ہے جنہیں پہن کر انسان لوگوں کے سامنے نہ جاتا ہو۔

نماز شروع کرتے وقت

(۱) دِل میں نیت کرلیں کہ میں فلاں نماز پڑھ رہا ہوں، زبان سے نیت کے الفاظ کہنا ضروری نہیں۔

(۲) ہاتھ کانوں تک اس طرح اُٹھائیں کہ ہتھیلیوں کا رُخ قبلے کی طرف ہو، اور انگوٹھوں کے سرے کان کی لو سے یا تو بالکل مل جائیں، یا اُس کے برابر آجائیں، اور باقی اُنگلیاں اُوپر کی طرف سیدھی ہوں۔ بعض لوگ ہتھیلیوں کا رُخ قبلے کی طرف کرنے کے بجائے کانوں کی طرف کرلیتے ہیں۔ بعض لوگ کانوں کو ہاتھوں سے بالکل ڈھک لیتے ہیں۔ بعض لوگ ہاتھ پوری طرح کانوں تک اُٹھائے بغیر ہلکا سا اشارہ کردیتے ہیں۔ بعض لوگ کان کی لو کو ہاتھوں سے پکڑ لیتے ہیں۔ یہ سب طریقے غلط اور خلافِ سنت ہیں۔ ان کو چھوڑنا چاہئے۔

(۳) مذکورہ بالا طریقے پر ہاتھ اُٹھاتے وقت اَللّٰهُ أَكْبَرُ کہیں، پھر دائیں ہاتھ کے انگوٹھے اور چھوٹی اُنگلی سے بائیں پہنچے کے گرد حلقہ بنا کر اسے پکڑلیں اور باقی تین اُنگلیوں کو بائیں ہاتھ کی پشت پر اس طرح پھیلادیں کہ تینوں اُنگلیوں کا رُخ کہنی کی طرف ہو۔

(۴) دونوں ہاتھوں کو ناف سے ذرا سا نیچے رکھ کر مذکورہ بالا طریقے سے باندھ لیں۔

کھڑے ہونے کی حالت میں

(۱) اگر اکیلے نماز پڑھ رہے ہوں، یا امامت کر رہے ہوں تو پہلے سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ الخ، پھر سورۂ فاتحہ، پھر کوئی اور سورت پڑھیں اور اگر کسی امام کے پیچھے ہوں تو صرف سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ پڑھ کر خاموش ہوجائیں، اور امام کی قرأت کو دھیان لگا کر سنیں۔ اگر امام زور سے نہ پڑھ رہا ہو تو زبان ہلائے بغیر دل ہی دل میں سورۂ فاتحہ کا دھیان کیے رکھیں۔

(۲) جب خود قراءت کررہے ہوں تو سورۂ فاتحہ پڑھتے وقت بہتر یہ ہے کہ ہر آیت پر رُک کر سانس توڑ دیں، پھر دوسری آیت پڑھیں، کئی کئی آیتیں ایک سانس میں نہ پڑھیں۔ مثلاً اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ پر سانس توڑ دیں، پھر اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ پر، پھر مَالِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ پر، اس طرح پوری سورۂ فاتحہ پڑھیں، لیکن اس کے بعد کی قراءت میں ایک سانس میں ایک سے زیادہ آیتیں بھی پڑھ لیں تو کوئی حرج نہیں۔

(۳) بغیر کسی ضرورت کے جسم کے کسی حصے کو حرکت نہ دیں، جتنے سکون کے ساتھ کھڑے ہوں، اُتنا ہی بہتر ہے۔ اگر کھجلی وغیرہ کی ضرورت ہو تو صرف ایک ہاتھ استعمال کریں، اور وہ بھی صرف سخت ضرورت کے وقت اور کم سے کم۔

(۴) جسم کا سارا زور ایک پاؤں پر دے کر دوسرے پاؤں کو اس طرح ڈھیلا چھوڑ دینا کہ اس میں خم آجائے نماز کے ادب کے خلاف ہے۔ اس سے پرہیز کریں۔ یا تو دونوں پاؤں پر برابر زور دیں، یا ایک پاؤں پر زور دیں تو اس طرح کہ دوسرے پاؤں میں خم پیدا نہ ہو۔

(۵) جمائی آنے لگے تو اس کو روکنے کی پوری کوشش کریں۔

(۶) کھڑے ہونے کی حالت میں نظریں سجدے کی جگہ پر رکھیں، اِدھر اُدھر یا سامنے دیکھنے سے پرہیز کریں۔

رکوع میں

رکوع میں جاتے وقت اِن باتوں کا خاص خیال رکھیں:

(۱) اپنے اُوپر کے دھڑ کو اس حد تک جھکائیں کہ گردن اور پشت تقریباً ایک سطح پر آجائے، نہ اس سے زیادہ جھکیں نہ اس سے کم۔

(۲) رکوع کی حالت میں گردن کو اتنا نہ جھکائیں کہ ٹھوڑی سینے سے ملنے لگے، اور نہ اتنا اُوپر رکھیں کہ گردن کمر سے بلند ہوجائے، بلکہ گردن اور کمر ایک سطح پر ہونی چاہئیں۔

(۳) رکوع میں پاؤں سیدھے رکھیں، ان میں خم نہ ہونا چاہئے۔

(۴) دونوں ہاتھ گھٹنوں پر اس طرح رکھیں کہ دونوں ہاتھوں کی اُنگلیاں کھلی ہوئی ہوں یعنی ہر دو اُنگلیوں کے درمیان فاصلہ ہو۔ اور اس طرح دائیں ہاتھ سے دائیں گھٹنے کو اور بائیں ہاتھ سے بائیں گھٹنے کو پکڑ لیں۔

(۵) رکوع کی حالت میں کلائیاں اور بازو سیدھے تنے ہوئے رہنے چاہئیں، ان میں خم نہیں آنا چاہئے۔

(۶) کم از کم اتنی دیر رکوع میں رُکیں کہ اطمینان سے تین مرتبہ سُبْحَانَ رَبِّیَ الْعَظِیْم کہا جاسکے۔
(۷) رکوع کی حالت میں نظریں پاؤں کی طرف ہونی چاہئیں۔
(۸) دونوں پاؤں پر زور برابر رہنا چاہئے، اور دونوں پاؤں کے ٹخنے ایک دوسرے کے بالمقابل رہنے چاہئیں۔

رکوع سے کھڑے ہوتے وقت

(۱) رکوع سے کھڑے ہوتے وقت اتنے سیدھے ہوجائیں کہ جسم میں کوئی خم باقی نہ رہے۔
(۲) اِس حالت میں بھی نظر سجدے کی جگہ پر رہنی چاہئے۔
(۳) جو لوگ کھڑے ہوتے وقت کھڑے ہونے کے بجائے کھڑے ہونے کا صرف اشارہ کرتے ہیں، اور جسم کے جھکاؤ کی حالت ہی میں سجدے کے لئے چلے جاتے ہیں، ان کے ذمے نماز کا لوٹانا واجب ہوجاتا ہے۔ لہٰذا اس سے سختی کے ساتھ پرہیز کریں۔ جب تک سیدھے ہونے کا اطمینان نہ ہوجائے، سجدے میں نہ جائیں۔

سجدے میں جاتے وقت

سجدے میں جاتے وقت اس طریقے کا خیال رکھیں کہ:
(۱) سب سے پہلے گھٹنوں کو خم دے کر انہیں زمین کی طرف اس طرح لے جائیں کہ سینہ آگے کو نہ جھکے۔ جب گھٹنے زمین پر ٹک جائیں، اُس کے بعد سینے کو جھکائیں۔
(۲) جب تک گھٹنے زمین پر نہ ٹکیں، اس وقت تک اُوپر کے دھڑ کو جھکانے سے حتی الامکان پرہیز کریں۔
آج کل سجدے میں جانے کے اس مخصوص ادب سے بے پرواہی بہت عام ہوگئی ہے، اکثر لوگ شروع ہی سے سینہ آگے کو جھکا کر سجدے میں جاتے ہیں، لیکن صحیح طریقہ وہی ہے جو نمبر ۱ اور نمبر ۲ میں بیان کیا گیا، بغیر کسی عذر کے اس کو نہ چھوڑنا چاہئے۔
(۳) گھٹنوں کے بعد پہلے ہاتھ زمین پر رکھیں، پھر ناک، پھر پیشانی۔

سجدے میں

(۱) سجدے میں سر کو دونوں ہاتھوں کے درمیان اس طرح رکھیں کہ دونوں انگوٹھوں کے سرے کانوں کی لو کے سامنے ہوجائیں۔

(۲) سجدے میں دونوں ہاتھوں کی اُنگلیاں بند ہونی چاہئیں، یعنی اُنگلیاں بالکل ملی ملی ہوں، اور ان کے درمیان فاصلہ نہ ہو۔

(۳) اُنگلیوں کا رُخ قبلے کی طرف ہونا چاہئے۔

(۴) کہنیاں زمین سے اُٹھی ہونی چاہئیں، کہنیوں کو زمین پر ٹیکنا درست نہیں۔

(۵) دونوں بازو پہلوؤں سے الگ ہٹے ہوئے ہونے چاہئیں، انہیں پہلوؤں سے بالکل ملا کر نہ رکھیں۔

(۶) کہنیوں کو دائیں بائیں اتنی دور تک بھی نہ پھیلائیں جس سے برابر کے نماز پڑھنے والوں کو تکلیف ہو۔

(۷) رانیں پیٹ سے ملی ہوئی نہیں ہونی چاہئیں، پیٹ اور رانیں الگ الگ رکھی جائیں۔

(۸) پورے سجدے کے دوران ناک زمین پر ٹکی رہے، زمین سے نہ اُٹھے۔

(۹) دونوں پاؤں اس طرح کھڑے رکھے جائیں کہ ایڑھیاں اُوپر ہوں، اور تمام اُنگلیاں اچھی طرح مڑکر قبلہ رُخ ہوگئی ہوں۔ جو لوگ اپنے پاؤں کی بناوٹ کی وجہ سے تمام اُنگلیاں موڑنے پر قادر نہ ہوں، وہ جتنی موڑ سکیں، اُتنی موڑنے کا اہتمام کریں، بلاوجہ اُنگلیوں کو سیدھا زمین پر ٹیکنا درست نہیں۔

(۱۰) اِس بات کا خیال رکھیں کہ سجدے کے دوران پاؤں زمین سے اُٹھنے نہ پائیں، بعض لوگ اس طرح سجدہ کرتے ہیں کہ پاؤں کی کوئی اُنگلی ایک لمحہ کے لئے بھی زمین پر نہیں ٹکتی، اس طرح سجدہ ادا نہیں ہوتا، اور نتیجتاً نماز بھی نہیں ہوتی۔ اس سے اہتمام کے ساتھ پرہیز کریں۔

(۱۱) سجدے کی حالت میں کم از کم اتنی دیر گزاریں کہ تین مرتبہ سُبْحَانَ رَبِّیَ الْأَعْلٰی اطمینان کے ساتھ کہہ سکیں۔ پیشانی ٹیکتے ہی فوراً اُٹھالینا منع ہے۔

دونوں سجدوں کے درمیان

(۱) ایک سجدے سے اُٹھ کر اطمینان سے دوزانو سیدھے بیٹھ جائیں، پھر دوسرا سجدہ کریں۔ ذرا سا سر اُٹھا کر سیدے ہوئے بغیر دوسرا سجدہ کرلینا گناہ ہے اور اس طرح کرنے سے نماز کا لوٹانا واجب ہوجاتا ہے۔

(۲) بایاں پاؤں بچھا کر اُس پر بیٹھیں، اور دایاں پاؤں اس طرح کھڑا کرلیں کہ اس کی اُنگلیاں مڑکر قبلہ رُخ ہوجائیں۔ بعض لوگ دونوں پاؤں کھڑے کرکے ان کی ایڑھیوں پر بیٹھ جاتے ہیں۔ یہ طریقہ صحیح نہیں۔

(۳) بیٹھنے کے وقت دونوں ہاتھ رانوں پر رکھے ہونے چاہئیں، مگر اُنگلیاں گھٹنوں کی طرف لٹکی ہوئی نہ ہوں، بلکہ اُنگلیوں کے آخری سرے گھٹنے کے ابتدائی کنارے تک پہنچ جائیں۔

(۴) بیٹھنے کے وقت نظریں اپنی گود کی طرف ہونی چاہئیں۔

(۵) اتنی دیر بیٹھیں کہ اس میں کم از کم ایک مرتبہ سُبْحَانَ اللّٰہ کہا جاسکے، اور اگر اتنی دیر بیٹھیں کہ اس میں اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لِیْ وَارْحَمْنِیْ وَاسْتُرْنِیْ وَاجْبُرْنِیْ وَاھْدِنِیْ وَارْزُقْنِیْ پڑھا جاسکے تو بہتر ہے لیکن فرض نمازوں میں یہ پڑھنے کی ضرورت نہیں، نفلوں میں پڑھ لینا بہتر ہے۔

دوسرا سجدہ اور اس سے اُٹھنا

(۱) دوسرے سجدے میں بھی اس طرح جائیں کہ پہلے دونوں ہاتھ زمین پر رکھیں، پھر ناک، پھر پیشانی۔

(۲) سجدے کی ہیئت وہی ہونی چاہئے جو پہلے سجدے میں بیان کی گئی۔

(۳) سجدے سے اُٹھتے وقت پہلے پیشانی زمین سے اُٹھائیں، پھر ناک، پھر ہاتھ، پھر گھٹنے۔

(۴) اُٹھتے وقت زمین کا سہارا نہ لینا بہتر ہے، لیکن اگر جسم بھاری ہو یا بیماری یا بڑھاپے کی وجہ سے مشکل ہو تو سہارا لینا بھی جائز ہے۔

(۵) اُٹھنے کے بعد ہر رکعت کے شروع میں سورۃ فاتحہ سے پہلے بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ پڑھیں۔

قعدے میں

(۱) قعدے میں بیٹھنے کا طریقہ وہی ہوگا جو سجدوں کے بیچ میں بیٹھنے کا ذکر کیا گیا۔

(۲) التحیات پڑھتے وقت جب "أَشْهَدُ أَنْ لَّا" پر پہنچیں تو شہادت کی انگلی اُٹھا کر اشارہ کریں، اور "إِلَّا اللّٰهُ" پر گرادیں۔

(۳) اشارے کا طریقہ یہ ہے کہ بیچ کی اُنگلی اور انگوٹھے کو ملا کر حلقہ بنائیں، چھنگلی اور اس کے برابر والی اُنگلی کو بند کرلیں، اور شہادت کی اُنگلی کو اس طرح اُٹھائیں کہ اُنگلی قبلے کی طرف جھکی ہوئی ہو۔ بالکل سیدھی آسمان کی طرف نہ اُٹھانی چاہئے۔

(۴) "إِلَّا اللّٰهُ" کہتے وقت شہادت کی اُنگلی تو نیچے کرلیں، لیکن باقی اُنگلیوں کی جو ہیئت اشارے کے وقت بنائی تھی، اس کو آخر تک برقرار رکھیں۔

سلام پھیرتے وقت

(۱) دونوں طرف سلام پھیرتے وقت گردن کو اتنا موڑیں کہ پیچھے بیٹھے آدمی کو آپ کے رخسار نظر آ جائیں۔

(۲) سلام پھیرتے وقت نظریں کندھے کی طرف ہونی چاہئیں۔

(۳) جب دائیں طرف گردن پھیر کر "اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَةُ اللهِ" کہیں تو یہ نیت کریں کہ دائیں طرف جو انسان اور فرشتے ہیں، ان کو سلام کر رہے ہیں، اور بائیں طرف سلام پھیرتے وقت بائیں طرف موجود انسانوں اور فرشتوں کو سلام کرنے کی نیت کریں۔

دُعا کا طریقہ

(۱) دُعا کا طریقہ یہ ہے کہ دونوں ہاتھ اتنے اُٹھائے جائیں کہ وہ سینے کے سامنے آ جائیں، دونوں ہاتھوں کے درمیان معمولی فاصلہ ہو، نہ ہاتھوں کو بالکل ملائیں، اور نہ دونوں کے درمیان زیادہ فاصلہ رکھیں۔

(۲) دُعا کرتے وقت ہاتھوں کے اندرونی حصے کو چہرے کے سامنے رکھیں۔

خواتین کی نماز

اُوپر نماز کا جو طریقہ بیان کیا گیا ہے، وہ مردوں کے لئے ہے۔ عورتوں کی نماز مندرجہ ذیل معاملات میں مردوں سے مختلف ہے، لہٰذا خواتین کو ان مسائل کا خیال رکھنا چاہئے:

(۱) خواتین کو نماز شروع کرنے سے پہلے اس بات کا اطمینان کر لینا چاہئے کہ اُن کے چہرے، ہاتھوں اور پاؤں کے سوا تمام جسم کپڑے سے ڈھکا ہوا ہے۔ بعض خواتین اس طرح نماز پڑھتی ہیں کہ ان کے بال کھلے رہتے ہیں۔ بعض خواتین کی کلائیاں کھلی رہتی ہیں۔ بعض خواتین کے کان کھلے رہتے ہیں۔ بعض خواتین اتنا چھوٹا دوپٹہ استعمال کرتی ہیں کہ اس کے نیچے بال لٹکے نظر آتے ہیں۔ یہ سب طریقے ناجائز ہیں اور اگر نماز کے دوران چہرے، ہاتھ اور پاؤں کے سوا جسم کا کوئی عضو بھی چوتھائی کے برابر اتنی دیر کھلا رہ گیا جس میں تین مرتبہ سُبْحَانَ رَبِّيَ الْعَظِيْمِ کہا جا سکے تو نماز ہی نہیں ہوگی اور اس سے کم کھلا رہ گیا تو نماز ہو جائے گی مگر گناہ ہوگا۔

(۲) خواتین کے لئے کمرے میں نماز پڑھنا برآمدے سے افضل ہے، اور برآمدے میں پڑھنا صحن سے افضل ہے۔

(۳) عورتوں کو نماز شروع کرتے وقت ہاتھ کانوں تک نہیں، بلکہ کندھوں تک اُٹھانے چاہئیں اور وہ بھی دوپٹے کے اندر ہی سے اُٹھانے چاہئیں، دوپٹے سے باہر نہ نکالے جائیں۔(بہشتی زیور)

(۴) عورتیں ہاتھ سینے پر اس طرح باندھیں کہ دائیں ہاتھ کی ہتھیلی بائیں ہاتھ کی پشت پر رکھیں۔ انہیں مردوں کی طرح ناف پر ہاتھ نہ باندھنے چاہئیں۔

(۵) رکوع میں عورتوں کے لئے مردوں کی طرح کمر کو بالکل سیدھا کرنا ضروری نہیں، عورتوں کو مردوں کے مقابلے میں کم جھکنا چاہئے۔(طحطاوی علی المراقی، ص:۱۴۱)

(۶) رکوع کی حالت میں مردوں کو اُنگلیاں گھٹنوں پر کھول کر رکھنی چاہئیں لیکن عورتوں کے لئے حکم یہ ہے کہ وہ اُنگلیاں ملا کر رکھیں، یعنی اُنگلیوں کے درمیان فاصلہ نہ ہو۔(درمختار)

(۷) عورتوں کو رکوع میں اپنے پاؤں بالکل سیدھے نہ رکھنے چاہئیں، بلکہ گھٹنوں کو آگے کی طرف ذرا سا خم دے کر کھڑا ہونا چاہئے۔(درمختار)

(۸) مردوں کو حکم یہ ہے کہ رکوع میں ان کے بازو پہلوؤں سے جدا اور تنے ہوئے ہوں، لیکن عورتوں کو اس طرح کھڑا ہونا چاہئے کہ ان کے بازو پہلوؤں سے ملے ہوئے ہوں۔(ایضاً)

(۹) عورتوں کو دونوں پاؤں ملا کر کھڑا ہونا چاہئے، خاص طور دونوں ٹخنے تقریباً مل جانے چاہئیں۔ پاؤں کے درمیان فاصلہ نہ ہونا چاہئے۔(بہشتی زیور)

(۱۰) سجدے میں جاتے وقت مردوں کے لئے یہ طریقہ بیان کیا گیا ہے کہ جب تک گھٹنے زمین پر نہ ٹکیں، اُس وقت تک وہ سینہ نہ جھکائیں، لیکن عورتوں کے لئے یہ طریقہ نہیں ہے، وہ شروع ہی سے سینہ جھکا کر سجدے میں جاسکتی ہیں۔

(۱۱) عورتوں کو سجدہ اس طرح کرنا چاہئے کہ ان کا پیٹ رانوں سے بالکل مل جائے اور بازو بھی پہلوؤں سے ملے ہوئے ہوں۔ نیز عورت پاؤں کو کھڑا کرنے کے بجائے انہیں دائیں طرف نکال کر بچھادے۔

(۱۲) مردوں کے لئے سجدے میں کہنیاں زمین پر رکھنا منع ہے، لیکن عورتوں کو کہنیوں سمیت پوری باہیں زمین پر رکھ دینی چاہئیں۔(درمختار)

(۱۳) سجدوں کے درمیان اور التحیات پڑھنے کے لئے جب بیٹھنا ہو تو بائیں کولہے پر بیٹھیں، اور دونوں پاؤں دائیں طرف نکال دیں، اور دائیں پنڈلی پر رکھیں۔(طحطاوی)

(۱۴) مردوں کے لئے حکم یہ ہے کہ وہ رکوع میں اُنگلیاں کھول کر رکھنے کا اہتمام کریں، اور سجدے میں بند رکھنے کا، اور نماز کے باقی افعال میں انہیں اپنی حالت پر چھوڑ دیں، نہ بند کرنے کا اہتمام کریں، نہ کھولنے کا۔ لیکن عورت کے لئے ہر حالت میں حکم یہ ہے کہ وہ اُنگلیوں کو بند

رکھے، یعنی ان کے درمیان فاصلہ نہ چھوڑے، رکوع میں بھی، سجدے میں بھی، دو سجدوں کے درمیان بھی، اور قعدوں میں بھی۔

(۱۵) عورتوں کا جماعت کرنا مکروہ ہے۔ اُن کے لئے اکیلے نماز پڑھنا ہی بہتر ہے، البتہ اگر گھر کے محرم افراد گھر میں جماعت کر رہے ہوں تو ان کے ساتھ جماعت میں شامل ہو جانے میں کچھ حرج نہیں لیکن ایسے میں مردوں کے بالکل پیچھے کھڑا ہونا ضروری ہے۔ برابر میں ہرگز کھڑی نہ ہوں۔

مسجد کے چند ضروری آداب

(۱) مسجد میں داخل ہوتے وقت یہ دُعا پڑھیں:

"بِسْمِ اللّٰهِ وَالصَّلٰوةُ عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، اَللّٰهُمَّ افْتَحْ لِيْ أَبْوَابَ رَحْمَتِكَ"(۱)

(۲) مسجد میں داخل ہوتے وقت یہ نیت کرلیں کہ جتنی دیر مسجد میں رہوں گا اعتکاف میں رہوں گا، اس طرح انشاء اللہ اعتکاف کا ثواب بھی ملے گا۔

(۳) داخل ہونے کے بعد اگلی صف میں بیٹھنا افضل ہے، لیکن اگر جگہ بھر گئی ہو تو جہاں جگہ ملے وہیں بیٹھ جائیں۔ لوگوں کی گردنیں پھلانگ کر آگے بڑھنا جائز نہیں۔

(۴) جو لوگ مسجد میں پہلے سے بیٹھے ذکر یا تلاوت میں مشغول ہوں، اُن کو سلام نہیں کرنا چاہئے، البتہ اگر اُن میں سے کوئی از خود متوجہ ہو، اور ذکر وغیرہ میں مشغول نہ ہو، تو اس کو سلام کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

(۵) مسجد میں سنتیں یا نفلیں پڑھنی ہوں تو اس کے لئے ایسی جگہ کا انتخاب کریں جہاں سامنے سے لوگوں کے گزرنے کا احتمال نہ ہو۔ بعض لوگ پچھلی صفوں میں نماز شروع کر دیتے ہیں، حالانکہ ان کے سامنے اگلی صفوں میں جگہ خالی ہوتی ہے۔ چنانچہ اُن کی وجہ سے دور تک لوگوں کے لئے گزرنا مشکل ہو جاتا ہے، اور انہیں لمبا چکر کاٹ کر جانا پڑتا ہے۔ ایسا کرنا گناہ ہے،

---

(۱) صحیح مسلم، کتاب صلاة المسافرین وقصرها، باب ما یقول اذا دخل المسجد، رقم: ۱۱٦۵، سنن النسائی، کتاب المساجد، باب القول عند دخول المسجد وعند الخروج منه، رقم: ۷۲۱، سنن النسائی، کتاب الصلاة، باب ما یقوله الرجل عند دخوله المسجد، رقم: ۳۹۳، دعا کا ترجمہ یہ ہے: ''اللہ کے نام ساتھ، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر رحمت نازل ہو، اے اللہ! میرے لئے اپنی رحمت کے دروازے کھول دے''

اور اگر کوئی شخص ایسی حالت میں نمازی کے سامنے سے گزر گیا تو اس گزرنے کا گناہ بھی نماز پڑھنے والے پر ہوگا۔

(۶) مسجد میں داخل ہونے کے بعد اگر نماز میں کچھ دیر ہو تو بیٹھنے سے پہلے دو رکعتیں تحیۃ المسجد کی نیت سے پڑھ لیں، اس کا بہت ثواب ہے۔ اگر وقت نہ ہو تو سنتوں ہی میں تحیۃ المسجد کی نیت کرلیں، اور اگر سنتیں پڑھنے کا بھی وقت نہیں ہے اور جماعت کھڑی ہے تو فرض میں بھی یہ نیت کی جاسکتی ہے۔

(۷) جب تک مسجد میں بیٹھیں، ذکر کرتے رہیں، خاص طور پر اس کلمے کا ورد کرتے رہیں:

"سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ أَكْبَرُ"

(۸) مسجد میں بیٹھنے کے دوران بلاضرورت باتیں نہ کریں، نہ کوئی ایسا کام کریں جس سے نماز پڑھنے والوں یا ذکر کرنے والوں کی عبادت میں خلل آئے۔

(۹) نماز کھڑی ہو تو اگلی صفوں کو پہلے پُر کریں، اگر اگلی صفوں میں جگہ خالی ہو تو پچھلی صف میں کھڑا ہونا جائز نہیں ہے۔

(۱۰) جمعہ کا خطبہ دینے کے لئے جب امام منبر پر آجائے تو اُس وقت سے نماز ختم ہونے تک بولنا یا نماز پڑھنا یا کسی کو سلام کرنا یا سلام کا جواب دینا جائز نہیں ہے۔ اِس دوران اگر کوئی شخص بولنے لگے تو اُسے چپ رہنے کی تاکید کرنا بھی جائز نہیں۔

(۱۱) خطبہ کے دوران اس طرح بیٹھنا چاہئے جیسے التحیات میں بیٹھتے ہیں۔ بعض لوگ پہلے خطبہ میں ہاتھ باندھ کر بیٹھتے ہیں، اور دوسرے خطبے میں ہاتھ زانو پر رکھ لیتے ہیں۔ یہ طریقہ بے اصل ہے، دونوں خطبوں میں ہاتھ زانو پر رکھ کر بیٹھنا چاہئے۔

(۱۲) ہر ایسے کام سے پرہیز کریں جس سے مسجد میں گندگی ہو، بدبو پھیلے یا کسی دوسرے کو تکلیف پہنچے۔

(۱۳) کسی دوسرے شخص کو کوئی غلط کام کرتے دیکھیں تو چپکے سے نرمی کے ساتھ سمجھا دیں، اُس کو برسرِ عام رُسوا کرنے، ڈانٹ ڈپٹ یا لڑائی جھگڑے سے مکمل پرہیز کریں۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.

نماز میں آنے والے خیالات سے بچنے کا طریقہ ☆

"أَمَّا بَعْدُ! فَأَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ○ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ○
﴿قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ إِلَّا عَلٰى أَزْوَاجِهِمْ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ فَإِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ﴾ (۱)

بزرگانِ محترم و برادرانِ عزیز! یہ سورۃ مؤمنون کی ابتدائی چند آیات ہیں۔ جن کی تفسیر کا سلسلہ میں نے چند ہفتے پہلے شروع کیا تھا۔ ان آیات میں باری تعالیٰ نے مؤمنین کی وہ صفات بیان فرمائی ہیں، جو ان کے لئے فلاح کا سبب ہیں اور ''فلاح'' ایسا جامع لفظ ہے جس میں دین اور دنیا دونوں کی کامیابی آجاتی ہے۔ فلاح یافتہ مؤمنوں کا پہلا وصف یہ بیان فرمایا:

﴿الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ○﴾

یعنی وہ مؤمن فلاح یافتہ ہیں جو اپنی نمازوں میں خشوع اختیار کرتے ہیں۔ اس کی کچھ تفصیل پچھلے بیانات میں عرض کر چکا ہوں۔

خشوع کے تین درجے

گذشتہ جمعہ کو عرض کیا تھا کہ ''خشوع'' حاصل کرنے کے تین درجے اور تین سیڑھیاں ہیں، پہلی سیڑھی یہ ہے کہ جو الفاظ زبان سے ادا کر رہے ہو ان الفاظ کی طرف توجہ ہو، دوسری سیڑھی یہ ہے کہ ان الفاظ کے معانی کی طرف توجہ ہو، تیسری سیڑھی یہ ہے کہ انسان نماز اس دھیان کے ساتھ پڑھے جیسے وہ اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہا ہے یا کم از کم یہ تصور باندھے کہ اللہ تعالیٰ مجھے دیکھ رہے ہیں ــــــ ان آیات میں یہ جو فرمایا کہ وہ مؤمن فلاح یافتہ ہیں جو اپنی نماز میں خشوع اختیار کرنے والے ہیں، اس سے اس بات کی تنبیہ کی گئی ہے کہ صرف نماز پڑھنے پر اکتفا نہ کرو بلکہ نماز پڑھنے کے اندر خشوع پیدا کرنے کی بھی کوشش کرو۔

☆ اصلاحی خطبات (۱۴/۲۲۲ تا ۲۳۶)، بعد از نمازِ عصر، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی

(۱) المؤمنون: ۱ تا ۶

خیالات آنے کی شکایت

اکثر لوگ بکثرت یہ شکایت کرتے ہیں کہ جب میں نماز پڑھتا ہوں تو مجھے خیالات بکثرت آتے ہیں۔ بھائی! ان خیالات کی وجہ سے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ بلکہ اس صورتِ حال کا مداوا کرنے کی طرف توجہ کرنی چاہئے، پریشان ہونے سے کوئی کام نہیں بنتا۔ اصل بات یہ ہے کہ جو تکلیف اور نقص ہے اس کو دور کرنے کے راستے اختیار کیے جائیں۔ اس تکلیف اور نقص کو دور کرنے کے راستے کیا ہیں؟

نماز کے مقدمات

پہلا راستہ یہ ہے کہ اللہ جل شانہ نے نماز سے پہلے کئی مقدمات قائم کیے ہیں۔ یعنی نماز تو اصل مقصود ہے، لیکن اس نماز سے پہلے ایسے مقدمات اور کچھ ایسی تمہیدات رکھی ہیں جن کے واسطے سے انسان اصل نماز تک پہنچتا ہے۔ وہ سب مقدمات اور تمہیدی کام ہیں، اگر ان کو انسان ٹھیک ٹھیک انجام دیدے تو اس کی وجہ سے خیالات میں کمی آئے گی۔

نماز کا پہلا مقدمہ ''طہارت''

نماز کے مقدمات میں سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے ''طہارت'' رکھی ہے کیونکہ ہر نماز کے لئے طہارت اور پاکی حاصل کرنا ضروری ہے، ایک حدیث میں حضورِ اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((مِفْتَاحُ الصَّلَاةِ الطُّهُوْرُ)) (۱)

''نماز کی کنجی طہارت ہے''

دوسری حدیث میں حضورِ اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((لَا تُقْبَلُ الصَّلَاةُ بِغَيْرِ طُهُوْرٍ)) (۲)

''کوئی نماز طہارت کے بغیر اللہ تعالیٰ کے یہاں قبول نہیں''

---

(۱) سنن الترمذی، کتاب الطهارة عن رسول الله، باب ما جاء أن مفتاح الصلاة الطهور، رقم: ۳، سنن أبی داؤد، کتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، رقم: ۵٦، سنن ابن ماجه، کتاب الطهارة وسننها، باب مفتاح الصلاة الطهور، رقم: ۲۷۱، مسند أحمد، رقم: ۹۵۷

(۲) صحیح مسلم، کتاب الطهارة، باب وجوب الطهارة للصلاة، رقم: ۳۲۹، سنن الترمذی، کتاب الطهارة عن رسول الله، باب ما جاء لا تقبل صلاة بغير طهور، رقم: ۱، سنن النسائی، کتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، رقم: ۱۳۹، سنن ابن ماجه، کتاب الطهارة وسننها، باب لا يقبل الله صلاة بغير طهور، رقم: ۲٦۹

طہارت کی ابتداء استنجاء سے

طہارت کا سلسلہ ''استنجاء'' سے شروع ہوتا ہے اور استنجاء کرنے کو واجب قرار دیا گیا ہے اور اس کے بارے میں یہ کہا گیا کہ انسان استنجاء کے وقت طہارت حاصل کرنے کا اچھی طرح اطمینان حاصل کرے اور اگر پیشاب کے بعد قطرے آنے کا خطرہ ہو تو اس وقت تک انسان فارغ نہ ہو جب تک قطرہ آنے کا خطرہ ہو، فقہ کی اصطلاح میں اس کو ''استبراء'' کہا جاتا ہے کیونکہ اگر پاکی صحیح نہیں ہوئی اور کپڑوں پر یا جسم پر نجاست کے اثرات باقی رہ گئے تو اس کے نتیجے میں انسان کے خیالات مشوش ہوتے ہیں۔

ناپاکی خیالات کا سبب ہے

اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کے کچھ خواص بنائے ہیں۔ ناپاکی کا ایک خاصہ یہ ہے کہ وہ انسان کے دل میں ناپاک اور گندے خیالات اور شیطانی وساوس پیدا کرتا ہے، لہٰذا نماز کا سب سے پہلا تمہیدی کام یہ ہے کہ ناپاکی دور کرنے کا اہتمام کیا جائے۔

نماز کا دوسرا مقدمہ ''وضو''

اس کے بعد دوسرا تمہیدی کام ''وضو'' رکھا ہے، یہ وضو بھی بڑی عجیب وغریب چیز ہے، حدیث شریف میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جب انسان وضو کرتا ہے اور وضو میں اپنا چہرہ دھوتا ہے تو اس کے نتیجے میں آنکھوں سے کیے ہوئے تمام صغیرہ گناہ اللہ تعالیٰ دھو دیتے ہیں، اسی طرح جس وقت انسان ہاتھ دھوتا ہے تو اللہ تعالیٰ ہاتھوں سے کیے ہوئے صغیرہ گناہ دھو دیتے ہیں اور جس وقت وہ پاؤں دھوتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے پاؤں سے کیے ہوئے گناہ معاف فرما دیتے ہیں ـــــ اور جو چار اعضاء وضوء میں دھوئے جاتے ہیں عام طور پر یہی چار اعضاء انسان کو گناہ کی طرف لے جاتے ہیں، انہی اعضاء کے ذریعہ گناہ سرزد ہوتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے یہ انتظام فرمایا کہ جب بندہ نماز کے لئے میرے دربار میں حاضر ہو تو اس سے پہلے وہ گناہوں سے پاک ہو چکا ہو، اس کے ہاتھ، اس کا چہرہ، اس کا پاؤں گناہوں سے پاک ہو گیا ہو۔ البتہ گناہ سے مراد صغیرہ گناہ ہیں۔ کبیرہ گناہ بغیر توبہ کے معاف نہیں ہوتے۔

وضو سے گناہ دھل جاتے ہیں

حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں مشہور ہے کہ جب کوئی وضو کر رہا ہوتا تھا تو اس کے وضو کے بہتے ہوئے پانی میں آپ کو گناہوں کی شکلیں نظر آتی تھیں کہ فلاں گناہ دھل کر جا رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ

نے آپ کو یہ کشف عطا فرمایا تھا ـــــ بہر حال! اللہ تعالیٰ نے نماز سے پہلے وضو اس لئے رکھا ہے کہ اس سے نہ صرف یہ کہ ظاہری صفائی حاصل ہو، بلکہ باطنی صفائی اور گناہوں کی صفائی بھی حاصل ہو جائے۔

کون سے وضو سے گناہ دھل جاتے ہیں؟

لیکن وضو سے یہ فائدہ اس وقت حاصل ہوتا ہے جب آدمی سنت کے مطابق وضو کرے اور اس طرح وضو کرے جس طرح رسول اللہ ﷺ نے بیان فرمایا۔ حضور اقدس ﷺ کی عادتِ شریفہ یہ تھی کہ جب وضو فرماتے تو قبلہ کی طرف منہ کر کے وضو فرماتے۔

یہ وضو کے آداب میں سے ہے، اسی طرح وضو شروع کرتے وقت ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' پڑھا کرتے تھے اور وضو کے دوران باتیں نہیں کرتے تھے وضو کی طرف دھیان فرماتے۔

وضو کی طرف دھیان

وضو کی طرف دھیان ہونے میں سب سے اعلیٰ بات یہ ہے کہ جب آدمی اپنا چہرہ دھوئے تو اس طرف دھیان کرے کہ میرے چہرے کے گناہ دھل رہے ہیں۔ جب آدمی ہاتھ دھوئے تو یہ دھیان کرے کہ حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ وضو میں ہاتھ دھوتے وقت ہاتھ کے گناہ معاف ہوتے ہیں تو اس وقت میرے ہاتھ کے گناہ دھل رہے ہیں۔ اسی طرح پانی استعمال کرنے میں اسراف نہ کرے، فضول پانی نہ بہائے۔ جتنے پانی کی ضرورت ہے، بس اتنے پانی سے وضو کرے۔ حدیث شریف میں حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((إِيَّاكَ وَالسَّرَفَ وَإِنْ كُنْتَ عَلَى نَهْرٍ جَارٍ))(۱)

''پانی کو فضول بہانے سے بچو، چاہے تم کسی بہتے دریا پر کیوں نہ کھڑے ہو''

اگر پانی کا دریا بہہ رہا ہے، تم اس دریا سے جتنے پانی سے بھی وضو کرو گے تو اس کے نتیجے میں دریا کے پانی میں کوئی کمی نہیں آئے گی، اس کے باوجود فرمایا کہ اس موقع پر اسراف سے بچو اور فضول پانی مت بہاؤ۔

وضو کے دوران کی دعائیں

اور وضو کے دوران دعائیں کرے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب وضو

---

(۱) سنن ابن ماجه، كتاب الطهارة وسننها، باب ما جاء في القصد في الوضوء وكراهة التعدي فيه، رقم: ۴۱۹، مسند أحمد، رقم: ۶۸۶۸

فرماتے تو آپ ﷺ کثرت سے:

((أَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَأَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ)) (۱)

پڑھا کرتے تھے، اور دوسری یہ دعا پڑھتے:

((أَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِیْ ذَنْبِیْ وَوَسِّعْ لِیْ فِیْ دَارِیْ وَبَارِكْ لِیْ فِیْ رِزْقِیْ)) (۲)

اور وضو کے بعد آپ ﷺ یہ پڑھتے:

((أَللّٰهُمَّ اجْعَلْنِیْ مِنَ التَّوَّابِیْنَ وَاجْعَلْنِیْ مِنَ الْمُتَطَهِّرِیْنَ)) (۳)

اگر آدمی ان آداب کے ساتھ وضو کرے تو ایسے وضو کا خاصہ یہ ہے کہ وہ طرح طرح کے خیالات جو آپ کے دل و دماغ میں بسے ہوئے ہیں، ان سے پاک کر کے اللہ تعالیٰ کی طرف دماغ کو متوجہ کر دیتا ہے۔

وضو میں بات چیت کرنا

لیکن ہماری غلطی سب سے پہلے وضو سے شروع ہوتی ہے، جب ہم وضو کرنے بیٹھے تو دنیا کے سارے خرافات وضو کے دوران چلتے رہتے ہیں۔ بات چیت ہو رہی ہے، گپ شپ ہو رہی ہے، حواس باختہ حالت میں وضو کر رہے ہیں، بس جلد جلد اپنا فرض ساقط کیا، اور فارغ ہو گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس وضو کے فوائد و ثمرات حاصل نہیں ہوتے۔ اس کے بجائے اگر دھیان کے ساتھ اور آداب کے ساتھ وضو کرے اور وضو کے دوران دعائیں پڑھتا رہے تو اس سے نماز کی پہلی تمہید اور پہلا مقدمہ درست ہو جائے گا۔

نماز کا تیسرا مقدمہ ''تحیۃ الوضو والمسجد''

نماز کا تیسرا مقدمہ یہ ہے کہ جب وضو کر کے مسجد میں آؤ تو مسجد میں جماعت سے کچھ دیر پہلے پہنچ جاؤ اور تحیۃ المسجد اور تحیۃ الوضوء کی نیت سے دو رکعت ادا کرو، یہ دو رکعت واجب یا سنتِ مؤکدہ

(۱) سنن الترمذی، کتاب الطهارة عن رسول الله، باب فيما يقال بعد الوضوء، رقم: ۵۰۔ سنن النسائی، کتاب الطهارة، رقم: ۱۴۸۔ سنن ابن ماجه، کتاب الطهارة وسننها، باب ما يقال بعد الوضوء، رقم: ۴۶۳

(۲) سنن الترمذی، کتاب الدعوات عن رسول الله، باب ما جاء فی عقد التسبيح باليد، رقم: ۳۴۲۲، مسند أحمد، أول مسند المدنيين أجمعين، رقم: ۱۶۰۰۴

(۳) سنن الترمذی، کتاب الطهارة عن رسول الله، باب فيما يقال بعد الوضوء، رقم: ۵۰

نہیں ہیں، لیکن بڑی فضیلت والی ہیں۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ حضورِ اقدس ﷺ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ اے بلال! جب میں معراج پر گیا، اور وہاں اللہ تعالیٰ نے مجھے جنت کی سیر کرائی تو میں نے تمہارے قدموں کی چاپ اپنے سے آگے سنی، جیسے کوئی بادشاہ سے آگے کوئی باڈی گارڈ چلا کرتا ہے۔ یہ بتاؤ کہ تمہارا کونسا عمل ہے جو تم خاص طور پر کرتے ہو، جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے تمہیں یہ مقام بخشا کہ جنت میں تمہیں میرا باڈی گارڈ بنا دیا۔

حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ یا رسول اللہ ﷺ! اور کوئی عمل تو مجھے یاد نہیں آرہا ہے البتہ ایک بات ہے وہ یہ ہے کہ جب سے اسلام لایا ہوں اس وقت سے میں نے یہ تہیہ کیا تھا کہ جب بھی وضو کروں گا تو دو رکعت اس وضو سے ضرور ادا کروں گا۔ چنانچہ جب سے اسلام لایا ہوں جب بھی وضو کرتا ہوں تو دو رکعت نفل تحیۃ الوضوء ضرور ادا کرتا ہوں، چاہے نماز کا وقت ہو یا نہ ہو۔

یہ سن کر جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''یہی وہ عمل ہے جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے تمہیں یہ مقام عطا فرمایا''(۱)

تحیۃ المسجد کس وقت پڑھے؟

بہر حال! ہر وضو کے بعد دو رکعت نفل پڑھنے میں دو منٹ خرچ ہوتے ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کی وجہ سے اتنی بڑی فضیلت عطا فرمائی، اور مسجد میں داخل ہونے کے بعد بیٹھنے سے پہلے دو رکعت تحیۃ المسجد پڑھنا افضل ہے، البتہ اگر آدمی بھول کر بیٹھ گیا اور بعد میں یاد آیا تو اس وقت پڑھ لے، اس میں بھی کوئی حرج نہیں، لیکن افضل یہ ہے کہ بیٹھنے سے پہلے پڑھے۔ یہ نماز کی تیسری تمہید ہے۔

نماز کا چوتھا مقدمہ: قبلیہ سنتیں

نماز کا چوتھا مقدمہ یہ ہے کہ ہر فرض نماز سے پہلے کچھ رکعتیں سنتِ مؤکدہ یا غیر مؤکدہ رکھی گئی ہیں۔ مثلاً فجر سے پہلے دو رکعتیں، ظہر سے پہلے چار رکعتیں سنتِ مؤکدہ ہیں اور عصر سے پہلے اور عشاء سے پہلے چار رکعت سنتِ غیر مؤکدہ رکھی گئی ہیں۔ مغرب کی نماز کو چونکہ جلدی پڑھنے کا حکم ہے اس لئے مغرب سے پہلے دو رکعت پڑھنے کی اتنی فضیلت نہیں ہے۔ لیکن بعض روایات میں اس وقت بھی دو

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب الجمعة، باب فضل الطهور بالليل والنهار وفضل الصلاة بعد الوضوء، رقم: ۱۰۸۱، صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابة، باب من فضائل بلال، رقم: ٤٤٩٧، سنن الترمذی، کتاب المناقب عن رسول الله، باب فی مناقب عمر بن الخطاب، رقم: ۳٦۲۲، مسند أحمد، رقم: ۸۰٥۲

رکعتیں ثابت ہیں۔ لہٰذا فرض نماز سے پہلے جو نمازیں پڑھی جارہی ہیں وہ تیسری تمہید ہیں۔

چاروں مقدمات کے جاننے پر خشوع کا حصول

ان چاروں مقدمات سے گزرنے کے بعد جب فرض نماز میں شامل ہوگا تو اس کو وہ شکایت پیش نہیں آئے گی جو عام طور پر لوگوں کو پیش آتی ہے کہ جب ہم نماز کے لئے کھڑے ہوتے ہیں تو ہمارا دل کہیں ہوتا ہے اور دماغ کہیں ہوتا ہے اور حواس باختہ حالت میں نماز ادا ہوتی ہے ــــ اذان اور فرض نماز کے درمیان جو پندرہ منٹ یا زیادہ کا وقفہ رکھا جاتا ہے یہ وقفہ اس لئے رکھا جاتا ہے تاکہ اس وقفہ کے دوران انسان یہ تمہیدات پوری کرے، یعنی اطمینان سے وضو کرے، پھر تحیۃ الوضو اور تحیۃ المسجد اطمینان سے ادا کرے اور پھر سنتیں ادا کرے۔ ان سب تمہیدات کے بعد جب فرض نماز کے لئے کھڑا ہوگا تو انشاء اللہ تعالیٰ خشوع، یکسوئی اور اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ حاصل ہوگی۔ ان تمہیدات میں چند منٹ صرف ہوتے ہیں۔ لیکن ان کی وجہ سے ہماری نمازیں درست ہو جائیں گی اور اس کے نتیجے میں صلاح فلاح حاصل ہو جائے گی۔

خیالات کی پرواہ مت کرو

اس کے بعد یہ بھی عرض کردوں کہ ان تمہیدات کو انجام دینے کے بعد پھر بھی فرض نماز میں خیالات آتے ہیں تو اس صورت میں بالکل گھبرانا نہیں چاہئے۔ اگر وہ خیالات غیر اختیاری طور پر آرہے ہیں تو اللہ تعالیٰ کے یہاں معاف ہیں۔ بعض لوگ ان خیالات کی وجہ سے اس نماز کی ناقدری کرنا شروع کر دیتے ہیں، چنانچہ بہت سے لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہماری نماز کیا ہے؟ ہم تو ٹکریں مارتے ہیں، بہت سے لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہماری نماز بالکل بیکار ہے۔ اس لئے کہ اس میں تو خیالات بہت آتے ہیں اور خشوع بالکل نہیں ہوتا۔

ان سجدوں کی قدر کرو

یاد رکھئے! یہ سب ناقدری کی باتیں ہیں اور اللہ تعالیٰ کو یہ باتیں پسند نہیں۔ ارے یہ تو دیکھو کہ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے نماز پڑھنے کی توفیق تو ہوئی، بارگاہِ الٰہی میں سجدہ ریز ہونے کی توفیق تو ملی، پہلے اس توفیق اور نعمت پر شکر ادا کرو کہ ان کے دربار میں آکر نماز ادا کرلی، نہ جانے کتنے لوگ ہیں جو اس نعمت سے محروم ہیں، اگر ہم بھی محروم ہوگئے ہوتے تو کتنی بڑی محرومی کی بات ہوتی۔ اللہ تعالیٰ نے حاضری کی جو توفیق عطا فرمادی یہ کوئی معمولی نعمت نہیں۔

قبول ہو کہ نہ ہو پھر بھی ایک نعمت ہے
وہ سجدہ جس کو ترے آستاں سے نسبت ہے

تیرے آستانے پر سر ٹیکنے کا ایک ظاہری موقع جو مل گیا یہ بھی بہت بڑی نعمت ہے، لہٰذا اس پر شکر ادا کرو ــــ البتہ اپنی طرف سے جو کوتاہی ہوئی ہے اور خشوع حاصل نہیں ہوا، خیالات آتے رہے، اس پر استغفار کرو۔

نماز کے بعد کے کلمات

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ انسان ہر فرض نماز کے بعد دو کام کرلے۔ ایک یہ کہ ''الحمدللہ'' کہے اور دوسرے ''استغفراللہ'' کہے۔

الحمدللہ کے ذریعہ اس بات پر شکر کہ یا اللہ! آپ نے اپنے دربار میں حاضری کی اور نماز پڑھنے کی توفیق عطا فرمادی۔ اور ''استغفراللہ'' اس بات پر کہ یا اللہ! آپ نے توفیق عطا فرمادی تھی، لیکن میں اس نماز کا حق ادا نہیں کرسکا اور جیسی نماز پڑھنی چاہئے تھی ویسی نماز نہ پڑھ سکا میں اس پر استغفار کرتا ہوں ــــ حدیث میں آتا ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ہر نماز کے سلام پھیرنے کے بعد تین مرتبہ ''استغفراللہ، استغفراللہ، استغفراللہ'' پڑھا کرتے تھے۔ (۱)

حالانکہ نماز پڑھی ہے، کوئی گناہ نہیں کیا۔ لیکن اس بات پر استغفار کیا کرتے تھے کہ یا اللہ! جیسی نماز آپ کی شایانِ شان پڑھنی چاہئے تھی ویسی نماز ہم نہیں پڑھ سکے۔ اس وجہ سے استغفار کر رہے ہیں۔

خلاصہ

بہرحال! اس نماز کی ناقدری بھی نہ کرو اور خود پسندی اور عجب میں بھی مبتلا نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ نے جو توفیق دی ہے اس پر شکر ادا کرو، اور جو کوتاہی ہوئی ہے اس پر استغفار کرو اور اپنی طاقت کی حد تک اس نماز کو بہتر سے بہتر بنانے کی فکر جاری رکھو، اور ساری عمر ایسا کرتے رہو تو اُمید ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے قبول فرمالیں گے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.

---

(۱) صحيح مسلم ، كتاب المساجد ومواضع الصلاة، باب استحباب الذكر بعد الصلاة وبيان صفته، رقم: ۹۳۱، سنن الترمذی، كتاب الصلاة، باب ما يقول اذا سلم من الصلاة، رقم: ۲۷۶، سنن ابن ماجه، كتاب اقامة الصلاة والسنة فيها، باب مايقال بعد التسليم ،رقم: ۹۱۸، سنن الدارمی، كتاب الصلاة، باب القول بعد السلام، رقم: ۱۳۱٤

نماز میں آنکھیں بند کرنا☆

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ. وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ. وَعَلٰی آلِهِ وَاَصْحَابِهِ اَجْمَعِيْنَ.
اَمَّا بَعْدُ!

حضرت والا نے ارشاد فرمایا:
''مبتدی کو اجازت ہے کہ خواہ آنکھ کھول کر نماز پڑھے یا بند کر کے نماز پڑھے، اکثر صفراوی یا سوداوی قیود سے متوحش ہوتے ہیں، بالخصوص جبکہ اس کے ساتھ ضعف بھی منضم ہو جائے اور ضعف مقتضی تکثیر قیود کو نہیں بلکہ مقتضی تقلیل قیود کو ہے، قیود سے جو اصل مقصود ہے ''تأثر'' خود وہی کام ضعف دیتا ہے''(۱)

آنکھیں کھول کر نماز پڑھنا سنت ہے

نماز کے بارے میں اصل مسئلہ یہ ہے کہ نماز آنکھیں کھول کر پڑھنی چاہئے۔ نماز پڑھنے کا مسنون طریقہ بھی یہی ہے کہ جب آدمی نماز پڑھے تو آنکھیں بند نہ کرے بلکہ کھلی رکھے۔ اگرچہ فقہاء نے یہ بھی فرما دیا ہے کہ اگر کسی شخص کو آنکھیں بند کیے بغیر خشوع حاصل نہ ہوتا ہو تو اس صورت میں آنکھیں بند کر لینا بھی جائز ہے، لیکن افضل ہر حالت میں یہی ہے کہ آنکھیں کھلی رکھے۔ اسی لئے بعض بزرگوں نے یہ فرمایا کہ چونکہ حضورِ اقدس ﷺ نماز میں آنکھیں بند نہیں فرماتے تھے بلکہ آنکھیں کھول کر نماز پڑھا کرتے تھے، اس لئے اتباعِ سنت کی برکت آنکھیں کھول کر نماز پڑھنے میں ہے، چاہے نماز میں دل لگے یا نہ لگے، اس درجے کا خشوع حاصل ہو یا حاصل نہ ہو، خیالات آئیں یا نہ آئیں، اتباعِ سنت کا ثواب اسی میں ہے کہ آدمی آنکھیں کھول کر نماز پڑھے، اگرچہ آنکھیں بند کر کے بھی نماز پڑھنا جائز ہے مگر افضل نہیں۔

بزرگوں نے فرمایا کہ اصل بات تو اتباعِ سنت کی ہے، جو نور اتباعِ سنت میں ہے، وہ نور

☆ اصلاحی مجالس (۳/۴/۷ تا ۷۵) بعد از نمازِ ظہر، رمضان المبارک، جامع مسجد دار العلوم، کراچی
(۱) انفاس عیسیٰ، ص:۶۳

دوسرے کاموں میں نہیں ہوسکتا۔ لہٰذا چاہے نماز میں دل لگے یا نہ لگے، خشوع پیدا ہو یا نہ ہو، اتباعِ سنت چونکہ آنکھیں کھول کر نماز پڑھنے میں ہے، اس لئے ہم تو آنکھیں کھول کر نماز پڑھیں گے۔

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ اور اتباعِ سنت

حتیٰ کہ شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحب قدس اللہ سرہ وتر کے بعد کی دو رکعتیں بیٹھ کر پڑھا کرتے تھے، کھڑے ہو کر نہیں پڑھتے تھے، حالانکہ فقہاء کرام نے صاف صاف لکھا ہے کہ اگر نوافل کھڑے ہو کر پڑھیں تو پورا ثواب ہے، اگر بیٹھ کر پڑھیں تو آدھا ثواب ہے، اور وتر کے بعد کی دو رکعتوں کے بارے میں فقہاء یہی لکھتے ہیں کہ بیٹھ کر پڑھنے میں آدھا ثواب ہے۔ لیکن حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ بیٹھ کر پڑھا کرتے تھے، کسی نے ان سے پوچھا کہ حضرت! آپ یہ جو دو رکعتیں بیٹھ کر پڑھتے ہیں، اس کی کیا وجہ ہے، کھڑے ہو کر کیوں نہیں پڑھتے؟

جواب میں حضرت نے فرمایا کہ روایات میں کثرت سے یہ آیا ہے کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم وتر کے بعد کی دو رکعتیں بیٹھ کر پڑھا کرتے تھے، اس لئے میں بھی بیٹھ کر پڑھ لیتا ہوں۔

کسی نے پھر پوچھا کہ حضرت! ثواب کے بارے میں کیا حکم ہے؟ اس لئے کہ فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر بیٹھ کر نماز پڑھیں تو آدھا ثواب ملتا ہے اور کھڑے ہو کر نماز پڑھیں تو پورا ثواب ملتا ہے۔

حضرت نے فرمایا کہ ثواب تو آدھا ہی ملتا ہے، اس لئے کہ قاعدہ یہی ہے، حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی قاعدہ بیان فرمایا ہے، اور فقہاء نے بھی یہی قاعدہ بیان فرمایا ہے۔

پھر سوال کیا کہ حضرت! جب بیٹھ کر پڑھنے سے آدھا ثواب ملتا ہے تو آپ پورا ثواب لینے کے لئے کھڑے ہو کر کیوں نہیں پڑھتے؟ جواب میں ایک جملہ ارشاد فرمایا کہ:

''بھائی بات یہ ہے کہ اتباعِ سنت کے کام میں جی زیادہ لگے، پڑے ثواب کم ہو''

یعنی اگر ثواب کم ملے تو اس میں کچھ حرج نہیں، لیکن حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ کام جس طرح کیا ہے، اس طرح کرنے میں طبیعت زیادہ لگتی ہے اور وتر کے بعد کی نفلوں کا حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے بیٹھ کر پڑھنا ثابت ہے، اس واسطے بیٹھ کر پڑھنے میں طبیعت زیادہ لگتی ہے، ٹھیک ہے ثواب کم ملتا ہے تو کم ملے۔

بہرحال! ہمارے بزرگوں کا یہ مزاج ہے کہ جس کام میں اتباعِ سنت ہو اس کو پکڑ لو، اور آنکھوں کو کھلا رکھ کر نماز پڑھنا سنت ہے، چاہے اس درجے کا خشوع حاصل نہ ہو، لیکن پھر بھی اتباعِ سنت کا جو نور اس میں ہے وہ آنکھیں بند کرنے میں نہیں ہے، یہ تو عام اصول ہے۔

مبتدی کو آنکھیں بند کرنے کی اجازت

لیکن حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اس ملفوظ میں فرماتے ہیں کہ ایک شخص نیا نیا دین کی طرف آیا اور اس نے نماز پڑھنی شروع کی، اب اگر تم اس پر بہت زیادہ قیدیں اور شرطیں لگادو گے اور اس سے کہو گے کہ دیکھ بھائی! آنکھ بند کر کے نماز نہ پڑھنا، آنکھیں کھول کر نماز پڑھنا، چونکہ وہ شخص مبتدی ہے، اس لئے اگر تم اس پر زیادہ قیدیں شرطیں لگادو گے تو وہ بھاگ جائے گا اور اس کی طبیعت میں دین سے توحش پیدا ہو جائے گا۔ لہٰذا مبتدی پر زیادہ قیدیں شرطیں نہیں لگانی چاہئیں، اور اس کو اس بات کی پابندی نہیں کرنا چاہئے کہ وہ آنکھیں کھول کر ہی نماز پڑھے۔ اس لئے حضرت والا نے فرمایا:

''مبتدی کو اجازت ہے، خواہ آنکھ کھولے ہوئے نماز پڑھے یا بند کر کے''

زیادہ قیود وحشت کا باعث ہوتی ہیں

پھر آگے اس کی وجہ بیان فرمائی:

''اکثر صفراوی یا سوداوی قیود سے متوحش ہوتے ہیں''

یعنی جس شخص کا مزاج سوداوی یا صفراوی ہے، اگر اس کے اُوپر زیادہ پابندی عائد کی جائے کہ یہ کام اس طرح کرو اس طرح نہ کرو، اور یہ کام اس طرح نہ کرو، اس طرح کرو تو اس پابندی کے نتیجے میں اس کی طبیعت میں وحشت پیدا ہو جاتی ہے، اور جو کام وہ پہلے اچھا خاصا کر رہا تھا، اس کو بھی چھوڑ بیٹھتا ہے، اس لئے مبتدی پر زیادہ قیود نہیں لگانی چاہئیں، خاص طور پر اگر اس شخص کی طبیعت میں ضعف اور کمزوری بھی ہو، جیسے آج کل لوگوں کے اندر سو فیصد ضعف موجود ہے، تو ایسی صورت میں قیود انسان کے لئے پریشان کن بن جاتی ہیں اور طبیعت میں دل جمعی باقی نہیں رہتی۔ اس لئے جو انسان ضعیف اور کمزور ہو، اس پر سے قیود کم کرنی چاہئیں نہ یہ کہ قیود اور زیادہ بڑھا دی جائیں، کیونکہ قید لگانے سے جو فائدہ اس کو حاصل ہوتا، مثلاً یہ قید اس پر لگادی جائے کہ تم آنکھیں کھول کر ہی نماز پڑھا کرو، تو اس صورت میں آنکھیں کھول کر نماز پڑھنے سے اتباعِ سنت کا جو فائدہ اس کو حاصل ہوتا، وہی فائدہ اس کو جسمانی کمزوری کے باوجود عبادت کرنے میں حاصل ہو جائے گا، اور وہ جسمانی کمزوری اس فائدے کی تلافی کر دیتی ہے، اس لئے مبتدی پر زیادہ قیود لگانے کی فکر نہیں کرنی چاہئے، اس کو ذرا عبادت کی طرف گھیر گھار کر لے آؤ، جب عبادت کا عادی بن جائے، اس وقت قیود لگا دینا۔

دراصل ابتدائی حالات میں کسی قسم کی رعایت دینا اس عمل کی طرف لانے کیلئے ہی ہوتا ہے، ان آداب و شرائط کی نفی کر دینا یا ان کی اہمیت ختم کر دینا مقصود نہیں ہوتا، تربیت کرنے والے اسے خوب سمجھتے ہیں

ایک خان صاحب کو راستے پر لانے کا واقعہ

چنانچہ حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ ہے کہ وہ ایک مرتبہ کسی گاؤں میں گزر رہے تھے، وہاں دیکھا کہ ایک مسجد ویران پڑی ہے۔ لوگوں سے پوچھا کہ یہ مسجد ویران پڑی ہے، تم لوگ اس کو آباد کیوں نہیں کرتے؟ لوگوں نے کہا کہ یہاں ایک خان صاحب رہتے ہیں، وہ اس علاقے کے سردار ہیں، ان کو دین سے کوئی تعلق نہیں، نہ نماز سے کوئی تعلق، نہ روزے سے کوئی تعلق، ہر وقت شراب و کباب کا مشغلہ رہتا ہے اور نشہ میں دھت پڑے رہتے ہیں، بازاری عورتوں کا آنا جانا ہے، نماز کی طرف دھیان نہیں، ان کی وجہ سے پوری بستی خراب ہوگئی ہے، اگر خان صاحب نماز کے لئے مسجد میں آجائیں تو ساری بستی نماز پڑھنا شروع کردے گی۔

مولانا صاحب نے فرمایا کہ مجھے ان کا پتہ بتاؤ اور ان سے میری ملاقات کراؤ۔ لوگوں نے خان صاحب کا مکان بتادیا کہ فلاں مکان ہے۔ چنانچہ مولانا صاحب ان کے گھر دعوت دینے پہنچے اور ملاقات ہوئی تو مولانا صاحب نے فرمایا کہ بھائی خان صاحب! آپ ماشاء اللہ مسلمان ہیں، یہاں آپ کے محلّے کی مسجد ویران پڑی ہے، اگر آپ مسجد میں نماز کے لئے چلے جایا کریں تو لوگ بھی آپ کو دیکھ کر مسجد میں آجایا کریں گے اور مسجد آباد ہوجائے گی، اور آپ کے نامہ اعمال میں بڑا خزانہ جمع ہوجائے گا۔ مولانا صاحب نے بات جو اس انداز سے کہی کہ خان صاحب کی طبیعت پر کچھ اثر ہوا، لیکن خان صاحب کہنے لگے کہ میں نماز پڑھنے کو تیار ہوں، البتہ مجھ سے وضو نہیں ہوسکتا، وضو کرنا میرے بس کا کام نہیں۔ دوسرے یہ کہ مجھ سے شراب نہیں چھوٹتی۔ تیسرے یہ کہ یہ عورتوں کے آنے جانے کا مشغلہ یہ مجھ سے نہیں چھوٹتا۔ اب ایسی حالت میں میں کیا نماز پڑھوں!! اس لئے میں نماز کے لئے نہیں جاتا۔ مولانا صاحب پہلے تو بڑے سٹپٹائے، کہ ان کو کیا جواب دوں، پھر کہنے لگے اچھا یہ بتاؤ کہ تم نماز پڑھنے کو تیار ہو؟ خان صاحب نے کہا کہ ہاں! میں نماز پڑھنے کو تیار ہوں، لیکن مجھ سے وضو نہیں ہوسکتا۔ مولانا صاحب نے فرمایا کہ اچھا بغیر وضو کے نماز پڑھ لیا کرو، اور دوسرے مشغلے بھی اس کے ساتھ چلتے رہیں تب بھی کوئی بات نہیں۔ خان صاحب نے تعجب سے پوچھا کہ بغیر وضو کے نماز!! مولانا صاحب نے فرمایا کہ ہاں! بغیر وضو کے نماز پڑھ لیا کرو، لیکن نماز کے لئے مسجد میں چلے جایا کرو۔ خان صاحب نے کہا کہ اگر اتنا آسان معاملہ ہے تو ٹھیک ہے، میں چلا جایا کروں گا۔ مولانا صاحب نے فرمایا کہ وعدہ کرو کہ نماز کے لئے مسجد جاؤ گے۔ خان صاحب نے وعدہ کرلیا کہ میں وعدہ کرتا ہوں کہ جاؤں گا۔

مولانا صاحب نے یہاں تو خان صاحب سے وعدہ لے لیا اور بلا وضو نماز پڑھنے کی اجازت

بھی دیدی، لیکن ان کے گھر سے باہر نکل کر سیدھے اسی مسجد میں پہنچے اور جا کر دو رکعتیں پڑھیں، اور پھر نماز کے بعد سجدے میں جا کر خوب روئے اور گڑگڑائے اور اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ یا اللہ! میرے بس میں اتنا ہی تھا کہ میں اس سے یہ کہہ دیتا، آگے آپ کا کام ہے۔

جب نماز کا وقت آیا تو خان صاحب کو یاد آیا کہ میں نے وعدہ کرلیا ہے، اس لئے مجھے نماز کے لئے مسجد میں جانا چاہئے، چنانچہ جانے کا ارادہ کرلیا، اور جب گھر سے نکلنے لگے تو دل میں خیال آیا کہ آج تو پہلی بار نماز کے لئے جارہا ہے، اگرچہ مولوی صاحب نے تو اجازت دیدی کہ بغیر وضو کے پڑھ لینا، لیکن تم پہلی مرتبہ اتنے عرصے کے بعد جارہے ہو، کم از کم آج تو وضو کرہی لو، اور صرف وضو ہی نہیں بلکہ آج پہلے دن غسل کر کے جاؤ، پھر بعد میں چاہو تو بغیر وضو کے پڑھتے رہنا۔ چنانچہ غسل کیا، اچھے پاک صاف کپڑے پہنے، خوشبو لگائی اور گھر سے نکل کر مسجد پہنچے، اور جب نماز پڑھی تو بس دل کی کایا ہی پلٹ گئی، اور جب واپس آئے تو شراب و کباب کے جو مشغلے تھے، اللہ تعالیٰ نے اس کی نفرت دل میں ڈال دی، اس کے بعد خان صاحب ایسے پکے نمازی بنے کہ باوضو پنج وقتہ نماز پڑھنے لگے۔

بے وضو نماز کی اجازت دینے کا اعتراض

اب زاہد خشک اس پر اعتراض کرے گا کہ مولانا صاحب نے خان صاحب کو بغیر وضو کے نماز پڑھنے کی اجازت دیدی، حالانکہ بعض اوقات بے وضو کے نماز پڑھنا کفر تک پہنچا دیتا ہے۔ لیکن اعتراض کرنے والوں نے یہ نہیں دیکھا کہ ان مولانا صاحب نے ایک طرف تو خان صاحب کو بلا وضو کے نماز پڑھنے کی اجازت دی، تو دوسری طرف انہوں نے مسجد میں آکر سجدہ میں گر کر اور گڑگڑا کر اللہ تعالیٰ سے دعائیں مانگیں کہ یا اللہ! یہاں تک تو میں لے آیا، آگے آپ کے قبضۂ قدرت میں ہے۔

بات دراصل یہ تھی کہ بعض اوقات مبتدی پر سے قیدیں اور شرطیں ہٹا دینا اس کو صحیح راستے پر لانے کے لئے مفید ہوتا ہے، البتہ یہ ہر ایک کے بس کا کام نہیں کہ تم بھی بغیر وضو کے نماز پڑھنے کا فتویٰ دیدو، بلکہ وہ اللہ کے بندے جس کے قول اور فعل میں اللہ تعالیٰ تاثیر پیدا فرما دیتے ہیں، جن کو اللہ تعالیٰ فہم اور بصیرت بھی عطا فرماتے ہیں اور درد اور فکر بھی عطا فرماتے ہیں، انہی کو ایسی بات زبان سے نکالنے کا حق ہوتا ہے، جیسے حافظ شیرازی کا مشہور شعر ہے۔

بمئے سجادہ رنگین کن گرد پیر مغاں گوید
کہ سالک بے خبر نبود زراہ و رسم منزلہا

یعنی لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ مصلّے کو شراب سے رنگ دو، کیسے ہوسکتا ہے؟ لیکن یہ شعر درحقیقت اسی قسم کے مواقع کے بارے میں کہا گیا ہے۔

بہر حال! مبتدی جو ابھی اس راستے پر آیا ہے، اس پر زیادہ قیدیں شرطیں لگانے کی ضرورت نہیں۔ اسی طرح اگر کوئی شخص اپنی نماز میں خشوع وخضوع پیدا کرنے کی طرف متوجہ ہوا ہے اور خیالات کو منتشر ہونے سے بچانے کے لئے اور یکسوئی پیدا کرنے کے لئے کسی وقت آنکھیں بند کر کے نماز پڑھنے کو اس کا دل چاہے تو وہ آنکھیں بند کر کے نماز پڑھ لے، اس کی اجازت ہے۔ انشاء اللہ ایسا شخص جب یکسوئی کا عادی ہو جائے گا تو آنکھیں کھلی رکھ کر بھی یکسوئی کے ساتھ نماز کی ادائیگی کرنے لگے گا، البتہ سنت اور افضل ہر حالت میں اسی کیفیت کو سمجھتا رہے جو آنحضرت ﷺ سے منقول ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں دین کا فہم عطا فرمائے اور سنت پر عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.

صلوٰۃ الحاجۃ، پریشانیوں کا علاج☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

أما بعد!

عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ اَبِیْ اَوْفٰی رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ ((مَنْ كَانَتْ لَهٗ اِلَی اللّٰهِ حَاجَةٌ اَوْ اِلٰی اَحَدٍ مِّنْ بَنِیْ آدَمَ فَلْیَتَوَضَّأْ وَلْیُحْسِنِ الْوُضُوْءَ ثُمَّ لِیُصَلِّ رَكْعَتَیْنِ ثُمَّ لِیُثْنِ عَلَی اللّٰهِ تَبَارَكَ وَ تَعَالٰی وَلْیُصَلِّ عَلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ، ثُمَّ لِیَقُلْ: لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ الْحَلِیْمُ الْكَرِیْمُ، سُبْحَانَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَرْشِ الْعَظِیْمِ، اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ، اَسْأَلُكَ مُوْجِبَاتِ رَحْمَتِكَ وَعَزَائِمَ مَغْفِرَتِكَ وَالْغَنِیْمَةَ مِنْ كُلِّ بِرٍّ وَالسَّلَامَةَ مِنْ كُلِّ اِثْمٍ لَا تَدَعْ لَنَا ذَنْبًا اِلَّا غَفَرْتَهٗ، وَلَا هَمًّا اِلَّا فَرَّجْتَهٗ وَلَا حَاجَةً هِیَ لَكَ رِضًی اِلَّا قَضَیْتَهَا یَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِیْنَ)) (۱)

یہ حدیث حضرت عبداللہ بن ابی اوفی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فقہاء صحابہ میں سے ہیں۔ وہ روایت کرتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جس شخص کو اللہ تعالیٰ سے کوئی ضرورت پیش آئے یا کسی آدمی سے کوئی کام پیش آجائے تو اس کو چاہئے کہ وہ اچھی طرح سنت کے مطابق تمام آداب کے ساتھ وضو کرے، پھر دو رکعتیں پڑھے اور پھر اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء بیان کرے اور پھر حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجے اور پھر دعا کے یہ کلمات کہے۔ (کلمات اُوپر حدیث میں موجود ہیں)

اس حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس نماز کا طریقہ بیان فرمایا ہے جس کو عرفِ عام میں ''صلوٰۃ الحاجۃ'' کہا جاتا ہے۔ یعنی ''نمازِ حاجت'' جب بھی کسی شخص کو کوئی ضرورت پیش آئے یا کوئی پریشانی لاحق ہو جائے یا کوئی کام کرنا چاہتا ہو لیکن وہ کام ہوتا نظر نہ آرہا ہو یا اس کام کے ہونے میں

☆ اصلاحی خطبات (۱۰/۲۶۔۵۷) بعد از نمازِ عصر، جامع مسجد بیت المکرّم، کراچی،

(۱) سنن الترمذی، کتاب الصلاة، باب ما جاء فی صلاة الحاجة، رقم: ٤٤١، سنن ابن ماجه، کتاب اقامة الصلاة والسنة فیها، باب ما جاء فی صلاة الحاجة، رقم: ١٣٧٤

رکاوٹیں ہوں تو اس صورت میں نبی کریم ﷺ نے ایک مسلمان کو یہ تلقین فرمائی کہ وہ ''نمازِ حاجت'' پڑھے، اور نمازِ حاجت پڑھنے کے بعد ''دعائے حاجت'' پڑھے، اور پھر اپنا جو مقصد ہے وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی زبان اور اپنے الفاظ میں پیش کرے۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے یہ اُمید ہے کہ اگر اس کام میں خیر ہوگی تو انشاء اللہ وہ کام ضرور انجام پا جائے گا۔ لہٰذا حضورِ اقدس ﷺ کی سنت یہ ہے کہ ضرورت کے وقت نمازِ حاجت پڑھی جائے اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کیا جائے۔

ایک مسلمان اور کافر میں فرق

اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ انسان کو جب کوئی ضرورت پیش آتی ہے تو وہ ظاہری اسباب اور دنیاوی اسباب تو اختیار کرتا ہے اور شرعاً ان اسباب کو اختیار کرنے کی اجازت بھی ہے، لیکن ایک مسلمان اور ایک کافر کے درمیان یہی فرق ہے کہ جب ایک کافر دنیا کے ظاہری اسباب اختیار کرتا ہے تو وہ انہی اسباب پر بھروسہ کرتا ہے کہ جو اسباب میں اختیار کر رہا ہوں، انہی اسباب کے ذریعہ میرا کام بن جائے گا۔

ملازمت کے لئے کوشش

مثلاً فرض کریں کہ ایک شخص بے روزگار ہے اور اس بات کے لئے کوشش کر رہا ہے کہ مجھے اچھی ملازمت مل جائے، اب ملازمت حاصل کرنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ وہ جگہیں تلاش کرے، اور جہاں کہیں ملازمت ملنے کا امکان ہو وہاں درخواست دے، اور اگر کوئی جاننے والا ہے تو اس سے اپنے حق میں سفارش کروائے وغیرہ۔ یہ سب ظاہری اسباب ہیں۔ اب ایک کافر سارا بھروسہ انہی ظاہری اسباب پر کرتا ہے اور اس کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ درخواست ٹھیک طریقے سے لکھ دوں، سفارش اچھی کرادوں اور تمام ظاہری اسباب اختیار کرلوں اور بس۔ اس کی پوری نگاہ اور پورا بھروسہ انہی اسباب پر ہے۔ یہ کام کافر کا ہے۔

اور مسلمان کا کام یہ ہے کہ اسباب تو وہ بھی اختیار کرتا ہے، درخواست وہ بھی دیتا ہے، اور اگر سفارش کی ضرورت ہے تو جائز طریقے سے وہ سفارش بھی کراتا ہے، لیکن اس کی نگاہ ان اسباب پر نہیں ہوتی، وہ جانتا ہے کہ نہ یہ درخواست کچھ کرسکتی ہے اور نہ یہ سفارش کچھ کرسکتی ہے، کسی مخلوق کی قدرت اور اختیار میں کوئی چیز نہیں، ان اسباب کے اندر تاثیر پیدا کرنے والی ذات اللہ جل جلالہ کی ذات ہے، وہ مسلمان تمام اسباب اختیار کرنے کے بعد اسی ذات سے مانگتا ہے کہ یا اللہ! ان اسباب کو اختیار کرنا آپ کا حکم تھا، میں نے یہ اسباب اختیار کرلیے، لیکن ان اسباب میں تاثیر پیدا کرنے والے آپ ہیں،

میں آپ ہی سے مانگتا ہوں کہ آپ میری یہ مراد پوری فرما دیجئے۔

بیمار آدمی کی تدابیر

مثلاً ایک شخص بیمار ہوگیا، اب ظاہری اسباب یہ ہیں کہ وہ ڈاکٹر کے پاس جائے اور جو دوا وہ تجویز کرے وہ دوا استعمال کرے، جو تدبیر وہ بتائے وہ تدبیر اختیار کرے، یہ سب ظاہری اسباب ہیں۔ لیکن ایک کافر شخص جس کا اللہ تعالیٰ پر ایمان نہیں ہے، وہ سارا بھروسہ ان دواؤں اور تدبیروں پر کرے گا، ڈاکٹر پر کرے گا، البتہ ایک مؤمن بندے کو حضور اقدس ﷺ نے یہ تلقین فرمائی کہ تم دوا اور تدبیر ضرور کرو، لیکن تمہارا بھروسہ ان دواؤں اور تدبیروں پر نہ ہونا چاہئے بلکہ تمہارا بھروسہ اللہ جل شانہ کی ذات پر ہونا چاہئے، اللہ تعالیٰ کی ذات شفا دینے والی ہے۔ اگر وہ ذات ان دواؤں اور تدبیروں میں تاثیر نہ ڈالیں تو پھر ان دواؤں اور تدبیروں میں کچھ نہیں رکھا ہے۔ ایک ہی دوا، ایک ہی بیماری میں ایک انسان کو فائدہ پہنچا رہی ہے، لیکن وہی دوا اسی بیماری میں دوسرے انسان کو نقصان پہنچا رہی ہے۔ اس لئے کہ درحقیقت دوا میں تاثیر پیدا کرنے والے اللہ تعالیٰ ہیں، اگر اللہ تعالیٰ چاہیں تو مٹی کی ایک چٹکی میں تاثیر عطا فرما دیں، اگر وہ تاثیر عطا نہ فرمائیں تو بڑی سے بڑی دوا اور مہنگی سے مہنگی دوا میں تاثیر عطا نہ فرمائیں۔

لہٰذا حضور اقدس ﷺ کی تعلیم یہ ہے کہ اسباب ضرور اختیار کرو لیکن تمہارا بھروسہ ان اسباب پر نہ ہونا چاہئے، بلکہ بھروسہ اللہ جل شانہ کی ذات پر ہونا چاہئے، اور ان اسباب کو اختیار کرنے کے بعد یہ دعا کرو کہ یا اللہ! جو کچھ میرے بس میں تھا اور جو ظاہری تدابیر اختیار کرنا میرے اختیار میں تھا وہ میں نے کرلیا، لیکن یا اللہ! ان تدابیر میں تاثیر پیدا کرنے والے آپ ہیں، ان تدابیر کو کامیاب بنانے والے آپ ہیں، آپ ہی ان میں تاثیر عطا فرمایئے اور آپ ہی ان کو کامیاب بنایئے۔

تدبیر کے ساتھ دعا

حضور اقدس ﷺ سے دعا کا ایک عجیب اور خوبصورت جملہ منقول ہے کہ جب بھی آپ کسی کام کی کوئی تدبیر فرماتے، چاہے دعا کی ہی تدبیر فرماتے تو اس تدبیر کے بعد یہ جملہ ارشاد فرماتے:

((اَللّٰھُمَّ ھٰذَا الْجُھْدُ وَعَلَیْکَ التُّکْلَانُ)) (۱)

یا اللہ! میری طاقت میں جو کچھ تھا وہ میں نے اختیار کرلیا، لیکن بھروسہ آپ کی ذات پر ہے، آپ ہی اپنی رحمت سے اس مقصد کو پورا فرما دیجئے۔

---

(۱) سنن الترمذی، کتاب الدعوات عن رسول اللہ، باب منہ، رقم: ۳۳۴۱

زاویۂ نگاہ بدل دو

یہ وہ بات ہے جو ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس طرح فرمایا کرتے تھے کہ دین درحقیقت زاویۂ نگاہ کی تبدیلی کا نام ہے، بس ذرا سا زاویۂ نگاہ بدل لو تو دین ہوگیا، اور اگر زاویۂ نگاہ نہ بدلو تو وہی دنیا ہے، مثلاً ہر مذہب یہ کہتا ہے کہ جب بیماری آئے تو علاج کرو، اسلام کی تعلیم بھی یہی ہے کہ بیمار ہونے پر علاج کرو، لیکن بس زاویۂ نگاہ کی تبدیلی کا فرق ہے، وہ یہ کہ علاج ضرور کرو لیکن بھروسہ اس علاج پر مت کرو بلکہ بھروسہ اللہ جل جلالہ کی ذات پر کرو۔

''ھوالشافی'' نسخہ پر لکھنا

اسی وجہ سے اس زمانہ میں مسلمان اطباء کا یہ طریقہ تھا کہ جب وہ کسی مریض کا نسخہ لکھتے تو سب سے پہلے نسخہ کے اُوپر ''ھوالشافی'' لکھا کرتے تھے یعنی شفاء دینے والا اللہ ہے۔ یہ ''ھوالشافی'' لکھنا ایک اسلامی طریقۂ کار تھا۔ اس زمانے میں انسان کے ہر ہر نقل و حرکت اور ہر ہر قول و فعل میں اسلامی ذہنیت، اسلامی عقیدہ اور اسلامی تعلیمات منعکس ہوتی تھیں۔ ایک طبیب ہے جو علاج کر رہا ہے لیکن نسخہ لکھنے سے پہلے اس نے ''ھوالشافی'' لکھ دیا، یہ لکھ کر اس نے اس بات کا اعلان کردیا کہ میں اس بیماری کا نسخہ تو لکھ رہا ہوں لیکن یہ نسخہ اس وقت تک کارآمد نہیں ہوگا جب تک وہ شفا دینے والا شفا نہیں دے گا۔ ایک مؤمن ڈاکٹر اور طبیب پہلے ہی قدم پر اس کا اعتراف کرلیتا تھا، اور جب ''ھوالشافی'' کا اعتراف کر کے نسخہ لکھتا تو اس کا نسخہ لکھنا بھی اللہ تعالیٰ کی عبادت اور بندگی کا ایک حصہ بن جاتا تھا۔

مغربی تہذیب کی لعنت کا اثر

لیکن جب سے ہمارے اُوپر مغربی تہذیب کی لعنت مسلط ہوئی ہے، اس وقت سے اس نے ہمارے اسلامی شعائر کا ملیامیٹ کرڈالا۔ اب آج کل کے ڈاکٹر کو نسخہ لکھتے وقت نہ ''بسم اللہ'' لکھنے کی ضرورت ہے اور نہ ''ھوالشافی'' لکھنے کی ضرورت ہے، بس اس نے تو مریض کا معائنہ کیا اور نسخہ لکھنا شروع کردیا، اس کو اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ وجہ اس کی یہ ہے کہ یہ سائنس ہمارے پاس ایسے کافروں کے واسطے سے پہنچی ہے جن کے دماغ میں اللہ تعالیٰ کے شافی ہونے کا کوئی تصور موجود نہیں۔ ان کا سارا بھروسہ اور اعتماد انہی اسباب اور انہی تدابیر پر ہے، اس لئے وہ صرف تدابیر اختیار کرتے ہیں۔

اسلامی شعائر کی حفاظت

اللہ تعالیٰ نے سائنس کو حاصل کرنے پر کوئی پابندی نہیں لگائی، سائنس کسی قوم کی میراث نہیں ہوا کرتی، علم کسی قوم اور مذہب کی میراث نہیں ہوتی، مسلمان بھی سائنس ضرور حاصل کرے، لیکن اپنے اسلامی شعائر کو تو محفوظ رکھے اور اپنے دین وایمان کی تو حفاظت کرے، اپنے عقیدہ کی کوئی جھلک تو اس کے اندر داخل کرے۔ یہ تو نہیں ہے کہ جو شخص ڈاکٹر بن گیا اس کے لئے ''ھوالشافی'' لکھنا حرام ہوگیا، اب اس کے لئے اللہ تعالیٰ کے ''شافی'' ہونے کے عقیدے کا اعلان کرنا ناجائز ہوگیا، اور وہ ڈاکٹر یہ سوچنے لگے کہ اگر میں نے نسخہ کے اُوپر ''ھوالشافی'' لکھ دیا تو لوگ یہ سمجھیں گے کہ یہ ''بیک ورڈ'' آدمی ہے، بہت پسماندہ ہے، اور یہ لکھنا تو ڈاکٹری کے اصول کے خلاف ہے۔ ارے بھائی! اگر تم ڈاکٹر ہو تو ایک مسلمان ڈاکٹر ہو، اللہ جل جلالہ پر ایمان رکھنے والے ہو، لہٰذا تم اس بات کا پہلے ہی اعلان کردو کہ جو کچھ تدبیر ہم کر رہے ہیں یہ ساری تدبیر اللہ جل جلالہ کی تاثیر کے بغیر بیکار ہے، اس کا کوئی فائدہ نہیں۔

تدبیر کے خلاف کام کا نام ''اتفاق''

بڑے بڑے ڈاکٹر، اطباء اور معالجین روزانہ اللہ جل جلالہ کی تاثیر اور فیصلوں کا مشاہدہ کرتے ہیں کہ ہم تدبیر کچھ کر رہے تھے مگر اچانک کیا سے کیا ہوگیا، اور اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ یہ ہماری ظاہری سائنس سب بیکار ہوگئی۔ لیکن اس اچانک اور ان کی ظاہری سائنس کے خلاف پیش آنے والے واقعہ کو ''اتفاق'' کا نام دے دیتے ہیں کہ اتفاقاً ایسا ہوگیا۔

کوئی کام ''اتفاقی'' نہیں

میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس اللہ سرہ فرمایا کرتے تھے کہ آج کل کی دنیا جس کو ''اتفاق'' کا نام دیتی ہے کہ اتفاقاً یہ کام اس طرح ہوگیا، یہ سب غلط ہے۔ اس لئے کہ اس کائنات میں کوئی کام اتفاقاً نہیں ہوتا بلکہ اس کائنات کا ہر کام اللہ تعالیٰ کی حکمت، مشیت اور نظم کے ماتحت ہوتا ہے۔ جب کسی کام کی علت اور سبب ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کام کن اسباب کی وجہ سے ہوا تو بس ہم کہہ دیتے ہیں کہ اتفاقاً یہ کام اس طرح ہوگیا۔ ارے جو اس کائنات کا مالک اور خالق ہے وہی اس پورے نظام کو چلا رہا ہے اور ہر کام پورے مستحکم نظام کے تحت ہو رہا ہے، کوئی ذرّہ اس کی مشیت کے بغیر ہل نہیں سکتا، اس لئے سیدھی سی بات یہ ہے کہ اس دوا میں بذاتِ خود کوئی تاثیر نہیں تھی،

جب اللہ تعالیٰ نے اس دوا میں تاثیر پیدا فرمائی تھی تو فائدہ ہوگیا تھا اور جب اللہ تعالیٰ نے تاثیر پیدا نہیں فرمائی، تو اس دوا سے فائدہ نہیں ہوا۔ بس یہ سیدھی سی بات ہے ''اتفاق'' کا کیا مطلب؟

ہر وقت مسبّب الاسباب پر نظر ہو

بس انسان یہی زاویۂ نگاہ بدل لے کہ تدبیروں اور اسباب پر بھروسہ نہ ہو، بلکہ مسبب الاسباب پر بھروسہ ہو کہ وہ سب کرنے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے نہ صرف تدبیر اختیار کرنے کی اجازت دی بلکہ تدبیر اختیار کرنے کا حکم دیا کہ تدبیر اختیار کرو اور ان اسباب کو اختیار کرو، اس لئے کہ ہم نے ہی یہ اسباب تمہارے لئے پیدا کیے ہیں۔ لیکن تمہارا امتحان یہ ہے کہ آیا تمہاری نگاہ ان اسباب کی حد تک محدود رہ جاتی ہے یا ان اسباب کے پیدا کرنے والے پر بھی جاتی ہے۔ نبی کریم ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دِلوں میں یہ عقیدہ اس طرح پیوست فرما دیا تھا کہ ان کی نگاہ ہمیشہ مسبب الاسباب پر رہتی تھی۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اسباب کو صرف اس وجہ سے اختیار کرتے تھے کہ ہمیں اسباب اختیار کرنے کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم ہے۔ اور جب اللہ تعالیٰ کی ذات پر مکمل یقین اور بھروسہ حاصل ہو جاتا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ اپنی مشیت کے عجیب وغریب کرشمے بندے کو دکھاتے ہیں۔

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کا زہر پینا

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ شام کے ایک قلعے کا محاصرہ کیا ہوا تھا۔ قلعہ کے لوگ محاصرہ سے تنگ آگئے تھے، وہ چاہتے تھے کہ صلح ہو جائے۔ لہٰذا ان لوگوں نے قلعے کے سردار کو حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے پاس صلح کی بات چیت کے لئے بھیجا۔ چنانچہ ان کا سردار حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی خدمت میں آیا، حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے دیکھا کہ اس کے ہاتھ میں چھوٹی سی شیشی ہے، حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے اس سے پوچھا کہ یہ شیشی میں کیا ہے اور کیوں لے کر آئے ہو؟ اس نے جواب دیا کہ اس شیشی میں زہر بھرا ہوا ہے اور یہ سوچ کر آیا ہوں کہ اگر آپ سے صلح کی بات چیت کامیاب ہوگئی تو ٹھیک، اور اگر بات چیت ناکام ہوگئی اور صلح نہ ہوسکی تو ناکامی کا منہ لے کر اپنی قوم کے پاس واپس نہیں جاؤں گا بلکہ یہ زہر پی کر خودکشی کرلوں گا۔

تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اصل کام تو لوگوں کو دین کی دعوت دینا ہوتا تھا، اس لئے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے سوچا کہ اس کو اس وقت دین کی دعوت دینے کا اچھا موقع ہے۔ چنانچہ انہوں نے اس سردار سے پوچھا: کیا تمہیں اس زہر پر اتنا بھروسہ ہے کہ جیسے ہی تم یہ زہر پیو گے تو فوراً موت واقع ہو جائے گی؟ اس سردار نے جواب دیا کہ ہاں مجھے اس پر بھروسہ ہے، اس لئے کہ یہ ایسا سخت زہر ہے

کہ اس کے بارے میں معالجین کا کہنا یہ ہے کہ آج تک کوئی شخص اس زہر کا ذائقہ نہیں بتا سکا، کیونکہ جیسے ہی کوئی شخص یہ زہر کھاتا ہے تو فوراً اس کی موت واقع ہو جاتی ہے، اس کو اتنی مہلت نہیں ملتی کہ وہ اس کا ذائقہ بتا سکے۔ اس وجہ سے مجھے یقین ہے کہ اگر میں اس کو پی لوں گا تو فوراً مر جاؤں گا۔

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے اس سردار سے کہا کہ یہ زہر کی شیشی جس پر تمہیں اتنا یقین ہے، یہ ذرا مجھے دو۔ اس نے وہ شیشی آپ کو دے دی۔ آپ نے وہ شیشی اپنے ہاتھ میں لی اور پھر فرمایا کہ اس کائنات کی کسی چیز میں کوئی تاثیر نہیں، جب تک اللہ تعالیٰ اس کے اندر اثر نہ پیدا فرما دیں، میں اللہ کا نام لیتا ہوں اور یہ دعا پڑھتا ہوں:

((بِسْمِ اللّٰهِ الَّذِیْ لَا یَضُرُّ مَعَ اسْمِهٖ شَیْءٌ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِی السَّمَآءِ وَهُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ))

”اس اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ جس کے نام کے ساتھ کوئی چیز نقصان نہیں پہنچا سکتی، نہ آسمان میں اور نہ زمین میں، وہی سننے اور جاننے والا ہے“

میں اس زہر کو پیتا ہوں، آپ دیکھنا کہ مجھے موت آتی ہے یا نہیں۔ اس سردار نے کہا کہ جناب! یہ آپ اپنے اُوپر ظلم کر رہے ہیں، یہ زہر تو اتنا سخت ہے کہ اگر انسان تھوڑا سا بھی منہ میں ڈال لے تو ختم ہو جاتا ہے اور آپ نے پوری شیشی پینے کا ارادہ کر لیا۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے فرمایا: انشاء اللہ مجھے کچھ نہیں ہوگا۔ چنانچہ دعا پڑھ کر وہ زہر کی پوری شیشی پی گئے۔ اللہ تعالیٰ کو اپنی قدرت کا کرشمہ دکھانا تھا۔ اس سردار نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ پوری شیشی پی گئے لیکن ان پر موت کے کوئی آثار ظاہر نہیں ہوئے، وہ سردار یہ کرشمہ دیکھ کر مسلمان ہو گیا۔ (۱)

ہر کام میں مشیتِ خداوندی کارفرما ہے

بہرحال، حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دلوں میں یہ عقیدہ جما ہوا تھا کہ جو کچھ اس کائنات میں ہو رہا ہے وہ اللہ جل شانہ کی مشیت سے ہو رہا ہے، ان کی مشیت کے بغیر کوئی ذرّہ حرکت نہیں کر سکتا۔ یہ عقیدہ ان کے دلوں میں اس طرح پیوست ہو چکا تھا کہ اس کے بعد یہ تمام اسباب بے حقیقت نظر آ رہے تھے۔ اور جب آدمی اس ایمان و یقین کے ساتھ کام کرتا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ اس کو اپنی قدرت کے کرشمے بھی دکھاتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی سنت یہ ہے کہ تم اسباب پر جتنا بھروسہ کرو گے، اتنا ہی ہم تمہیں اسباب کے ساتھ باندھ دیں گے، اور جتنا تم اس کی ذات پر بھروسہ کرو گے تو اتنا ہی اللہ تعالیٰ تم

(۱) دلائل النبوة، ص: ۱۵۹، الإصابة (۱/٤۱٤)، تاریخ الطبری (۲/٥٦٧)، حیاة الصحابة (۳/۷۳۰)

کو اسباب سے بے نیاز کر کے تمہیں اپنی قدرت کے کرشمے دکھائیں گے۔ چنانچہ حضورِ اقدس ﷺ اور حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے حالات میں قدم قدم پر یہ چیز نظر آتی ہے۔

حضورِ اقدس ﷺ کی سیرتِ طیبہ کا ایک واقعہ

ایک مرتبہ حضورِ اقدس ﷺ ایک غزوہ سے واپس تشریف لا رہے تھے، راستے میں ایک منزل پر قیام فرمایا اور وہاں ایک درخت کے نیچے آپ تن تنہا سو گئے، آپ کے قریب کوئی محافظ اور کوئی نگہبان نہیں تھا، کسی کافر نے آپ کو تنہا دیکھا تو تلوار سونت کر آ گیا اور بالکل آپ کے سر پر آ کر کھڑا ہو گیا، جب آپ کی آنکھ کھلی تو آپ نے دیکھا کہ اس کافر کے ہاتھ میں تلوار ہے اور آپ نہتے ہیں اور وہ کافر یہ کہہ رہا ہے کہ اے محمد (ﷺ) اب تمہیں میرے ہاتھ سے کون بچائے گا؟ اس شخص کو یہ خیال تھا کہ جب حضورِ اقدس ﷺ یہ دیکھیں گے کہ اس کے ہاتھ میں تلوار ہے اور میں نہتا ہوں اور اچانک یہ شخص میرے سر پر آ کھڑا ہوا ہے تو آپ گھبرا جائیں گے اور پریشان ہو جائیں گے، لیکن آپ کے چہرہ مبارک پر دور دور تک پریشانی کے کوئی آثار نمودار نہیں ہوئے۔ آپ نے اطمینان سے جواب دیا کہ مجھے اللہ تعالیٰ بچائیں گے۔ جب اس شخص نے دیکھا کہ آپ کے اُوپر پریشانی اور گھبراہٹ کے کوئی آثار ظاہر نہیں ہوئے تو اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس پر ایسا رعب مسلط فرما دیا کہ اس کے ہاتھوں میں لرزہ آ گیا اور اس لرزہ کی وجہ سے تلوار ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑی۔ اب سرکارِ دو عالم ﷺ نے وہ تلوار ہاتھ میں اُٹھالی اور فرمایا کہ اب بتاؤ تمہیں کون بچائے گا؟(۱)

اس واقعہ کے ذریعہ اس شخص کو یہ دعوت دینی تھی کہ درحقیقت تم اس تلوار پر بھروسہ کر رہے تھے اور میں اس تلوار کے پیدا کرنے والے پر بھروسہ کر رہا تھا اور اس تلوار میں تاثیر دینے والے پر بھروسہ کر رہا تھا۔ یہی اُسوہ حضورِ اقدس ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے سامنے پیش فرمایا، اور اس کے نتیجے میں ایک ایک صحابی کا یہ حال تھا کہ وہ اسباب بھی اختیار کرتے تھے مگر ساتھ میں بھروسہ وہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر کرتے تھے۔

پہلے اسباب پھر توکل

ایک صحابی حضورِ اقدس ﷺ کی خدمت میں آئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میں جنگل میں

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب الجهاد والسير، باب من علق سيفه بالشجر فی السفر عند القائلة، رقم: ۲۶۹۴، صحيح مسلم، كتاب صلاة المسافرين وقصرها، باب صلاة الخوف، رقم: ۱۳۹۱، مسند أحمد، رقم: ۱۳۸۱۶

اُونٹنی لے کر جاتا ہوں اور وہاں نماز کا وقت آ جاتا ہے، تو جب نماز کا وقت آ جائے اور اس وقت جنگل میں نماز کی نیت باندھنے کا ارادہ کروں تو اس وقت اپنی اُونٹنی کا پاؤں کسی درخت کے ساتھ باندھ کر نماز پڑھوں یا اس اُونٹنی کو نماز کے وقت کھلا چھوڑ دوں اور اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کروں؟ جواب میں حضورِ اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((اِعْقِلْ سَاقَهَا وَتَوَكَّلْ))

''اس اُونٹنی کی پنڈلی رسّی سے باندھ دو، لیکن باندھنے کے بعد پھر بھروسہ اسی رسّی پر مت کرو بلکہ بھروسہ اللہ تعالیٰ پر کرو''

اس لئے کہ وہ رسّی ٹوٹ بھی سکتی ہے، وہ رسّی دھوکہ بھی دے سکتی ہے۔[1]

اسی حدیث کے مضمون کو مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ ایک مصرعہ کے اندر بیان فرماتے ہیں کہ ع

بہ توکل پایۂ اشتر بند

یعنی توکل پر اُونٹنی کا پاؤں باندھو۔ لہٰذا توکل اور اسباب کا اختیار کرنا یہ دونوں چیزیں ایک مؤمن کے ساتھ اس کی زندگی میں ساتھ ساتھ چلتی ہیں، پہلے اسباب اختیار کرے اور پھر اللہ تعالیٰ سے کہہ دے:

((اَللّٰهُمَّ هٰذَا الْجُهْدُ وَعَلَيْكَ التُّكْلَانُ))

''یا اللہ جو تدبیر اور جو کوشش میرے اختیار میں تھی وہ میں نے اختیار کر لی، اب آگے بھروسہ آپ کی ذات پر ہے''[2]

اسباب کی یقینی موجودگی میں بھی توکل کیجئے

حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی ایک لطیف بات یاد آ گئی، وہ فرماتے ہیں کہ لوگ یوں سمجھتے ہیں کہ توکل صرف اسی صورت میں ہوتا ہے جب ظاہری اسباب کے ذریعہ کسی کام کے ہونے یا نہ ہونے دونوں کا احتمال موجود ہو، ہوسکتا ہے کہ یہ کام ہو جائے اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ کام نہ ہو، اس وقت تو توکل کرنا چاہئے اور اللہ تعالیٰ سے مانگنا چاہئے، لیکن جہاں پر کسی کام کے ہو جانے کی یقینی صورت موجود ہو، وہاں پر اللہ تعالیٰ سے مانگنے اور اللہ تعالیٰ پر توکل کرنے کی زیادہ ضرورت نہیں، وہ نہ توکل کا موقع ہے اور نہ ہی دعا کا موقع ہے۔

مثلاً ہم دسترخوان پر کھانا کھانے کے لئے بیٹھے ہیں، کھانا سامنے چنا ہوا، ہے، بھوک لگی ہوئی

(۱) سنن الترمذی، کتاب صفة القیامة والرقائق والورع عن رسول اللّٰه، باب منه، رقم: ۲٤٤۱

(۲) سنن الترمذی، کتاب الدعوات عن رسول اللّٰه، باب منه، رقم: ۳۳٤۱

ہے، یہ بات بالکل یقینی ہے کہ ہم یہ اُٹھا کر کھالیں گے، اب ایسے موقع پر کوئی شخص بھی نہ توکل کرتا ہے اور نہ ہی اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہے کہ یا اللہ! یہ کھانا مجھے کھلا دیجئے۔ اور نہ ہی کوئی شخص توکل اور دعا کرنے کی ضرورت محسوس کرتا ہے۔

توکل کا اصل موقع یہی ہے

لیکن حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ توکل کا اصل موقع تو یہی ہے اور اللہ تعالیٰ سے مانگنے کا اصل موقع یہی ہے۔ اس لئے کہ اگر اس وقت وہ اللہ تعالیٰ سے مانگے گا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ مجھے اس ظاہری سبب پر بھروسہ نہیں ہے جو میرے سامنے رکھا ہے، بلکہ مجھے آپ کے رزق دینے پر، آپ کی تخلیق پر، آپ کی قدرت اور رحمت پر بھروسہ ہے۔ اس لئے جب کھانا سامنے دستر خوان پر آجائے تو اس وقت بھی اللہ تعالیٰ سے مانگو کہ یا اللہ! یہ کھانا عافیت کے ساتھ کھلا دیجئے۔ کیونکہ اگرچہ غالب گمان یہ ہے کہ کھانا سامنے رکھا ہے، صرف ہاتھ بڑھا کر کھانے کی دیر ہے، لیکن یہ مت بھولو کہ یہ کھانا بھی اللہ تعالیٰ کی مشیت کے بغیر نہیں ہوگا۔ کتنے واقعات ایسے پیش آچکے ہیں کہ کھانا دستر خوان پر رکھا تھا، صرف ہاتھ بڑھانے کی دیر تھی لیکن کوئی ایسا عارض پیش آگیا یا کوئی ایسی پریشانی کھڑی ہوگئی یا کوئی ایسا حادثہ پیش آگیا کہ آدمی وہ کھانا نہیں کھاسکا، وہ کھانا رکھا کا رکھا رہ گیا۔ لہٰذا اگر کھانا سامنے موجود ہو تو اس وقت بھی اللہ تعالیٰ سے مانگو کہ یا اللہ! یہ کھانا مجھے کھلا دیجئے۔

خلاصہ یہ ہے کہ جس جگہ پر تمہیں یقینی طور پر معلوم ہو کہ یہ کام ہو جائے گا، اس وقت بھی اللہ تعالیٰ سے مانگو کہ یا اللہ! مجھے تو بظاہر نظر آرہا ہے کہ یہ کام ہو جائے گا، لیکن مجھے پتہ نہیں کہ حقیقت میں یہ کام ہو جائے گا یا نہیں، کیونکہ حقیقت میں تو آپ کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ اے اللہ! اس کام کو ٹھیک ٹھیک انجام تک پہنچا دیجئے۔

دونوں صورتوں میں اللہ سے مانگے

جو حدیث میں نے شروع میں بیان کی تھی، اس میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے دو لفظ ارشاد فرمائے، وہ یہ کہ تمہیں یا تو اللہ تعالیٰ سے کوئی ضرورت پیش آئے یا کسی آدمی سے کوئی ضرورت پیش آئے۔ یہ دو لفظ اس لئے ارشاد فرمائے کہ بعض کام ایسے ہوتے ہیں جس میں کسی آدمی کی مدد یا اس کی مداخلت کا کوئی راستہ ہی نہیں ہوتا بلکہ وہ براہِ راست اللہ تعالیٰ کی عطا ہوتی ہے۔ مثلاً کسی شخص کو اولاد کی خواہش ہے، اب ظاہری اسباب میں بھی کسی انسان سے اولاد نہیں مانگی جاسکتی بلکہ اللہ تعالیٰ ہی سے مانگی جاسکتی ہے۔ بہر حال، وہ خواہش اور ضرورت خواہ ایسی ہو جو براہِ راست اللہ تعالیٰ دینے والے

ہیں یا ایسی ضرورت ہو جو آدمی کے واسطے سے اللہ تعالیٰ عطا فرماتے ہیں، جیسے ملازمت اور روزی وغیرہ، دونوں صورتوں میں حقیقت میں تمہارا مانگنا اللہ تعالیٰ سے ہونا چاہئے۔

اطمینان سے وضو کریں

بہرحال، اب اگر تمہارے پاس وقت میں گنجائش ہے اور وہ کام بہت جلدی اور ایمرجنسی کا کام نہیں ہے تو اس کام کے لئے پہلے صلوٰۃ الحاجۃ پڑھو۔ اور صلوٰۃ الحاجۃ پڑھنے کا طریقہ اس حدیث میں حضورِ اقدس ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا کہ سب سے پہلے وضو کرو اور اچھی طرح وضو کرو۔ یعنی وہ وضو محض فرض ٹالنے کے انداز میں نہ کرو بلکہ یہ سمجھ کر کرو کہ یہ وضو درحقیقت ایک عظیم الشان عبادت کی تمہید ہے، اس وضو کے کچھ آداب اور کچھ سنتیں ہیں جو نبی کریم ﷺ نے تلقین فرمائی ہیں، ان سب کا اہتمام کر کے وضو کرو۔ ہم لوگ دن رات بے خیالی میں جلدی جلدی وضو کر کے فارغ ہو جاتے ہیں، بیشک اس طرح وضو کرنے سے وضو ہو تو جاتا ہے لیکن اس وضو کے انوار و برکات حاصل نہیں ہوتیں۔

وضو سے گناہ دُھل جاتے ہیں

ایک حدیث میں حضورِ اقدس ﷺ ارشاد فرماتے ہیں کہ جس وقت بندہ وضو کرتا ہے اور وضو کے دوران اپنا چہرہ دھوتا ہے تو چہرے سے جتنے گناہ کیے ہیں وہ سب چہرہ کے پانی کے ساتھ دُھل جاتے ہیں، اور جب دایاں ہاتھ دھوتا ہے تو دائیں ہاتھ کے جتنے گناہ ہوتے ہیں وہ سب دُھل جاتے ہیں، اور جب بایاں ہاتھ دھوتا ہے تو بائیں ہاتھ کے تمام گناہ دُھل جاتے ہیں۔ اس طرح جو جو عضو وہ دھوتا ہے اس عضو کے گناہِ صغیرہ معاف ہوتے چلے جاتے ہیں۔ (۱)

میرے حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ جب وضو کیا کرو تو ذرا یہ تصور کیا کرو کہ میں اپنا چہرہ دھو رہا ہوں تو حضورِ اقدس ﷺ کی بشارت کے مطابق میرے چہرے کے گناہ دُھل رہے ہیں، اب ہاتھ دھو رہا ہوں تو ہاتھ کے گناہ دُھل رہے ہیں، اسی تصور کے ساتھ مسح کرو اور اسی تصور کے ساتھ پاؤں دھوؤ۔ وہ وضو جو اس تصور کے ساتھ کیا جائے اور وہ وضو جو اس تصور کے بغیر کیا جائے، دونوں کے درمیان زمین و آسمان کا فرق نظر آئے گا اور اس وضو کا لطف محسوس ہوگا۔

---

(۱) صحيح مسلم، كتاب الطهارة، باب خروج الخطايا مع ماء الوضوء، رقم: ٣٦٠، سنن الترمذي، كتاب الطهارة عن رسول الله، رقم: ٢، مسند أحمد، رقم: ٧٦٧٧، مؤطا مالك، كتاب الطهارة، رقم: ٥٦

وضو کے دوران کی دعائیں

بہر حال، ذرا دھیان کے ساتھ وضو کرو اور وضو کے جو آداب اور سنتیں ہیں، ان کو ٹھیک ٹھیک بجالاؤ۔ مثلاً قبلہ رُو ہو کر بیٹھو، اور ہر ہر عضو کو تین تین مرتبہ اطمینان سے دھوؤ، اور وضو کی جو مسنون دعائیں ہیں وہ وضو کے دوران پڑھو۔ مثلاً یہ دعا پڑھو:

((اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لِیْ ذَنْبِیْ وَوَسِّعْ لِیْ فِیْ دَارِیْ وَبَارِكْ لِیْ فِیْ رِزْقِیْ))(۱)

اور کلمہ شہادت پڑھے:

((أَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَأَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ)) (۲)

اور وضو کے بعد یہ دعا پڑھے:

((اَللّٰھُمَّ اجْعَلْنِیْ مِنَ التَّوَّابِیْنَ وَاجْعَلْنِیْ مِنَ الْمُتَطَھِّرِیْنَ))(۳)

بس اچھی طرح وضو کرنے کا یہی مطلب ہے۔

''صلوٰۃ الحاجۃ'' کے لئے خاص طریقہ مقرر نہیں

پھر دو رکعت ''صلوٰۃ الحاجۃ'' کی نیت سے پڑھو، اور اس صلوٰۃ الحاجۃ کے طریقے میں کوئی فرق نہیں ہے، جس طرح عام نماز پڑھی جاتی ہے اسی طرح سے یہ دو رکعتیں پڑھی جائیں گی۔ بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ''صلوٰۃ الحاجۃ'' پڑھنے کا کوئی خاص طریقہ ہے، لوگوں نے اپنی طرف سے اس کے خاص خاص طریقے گھڑ رکھے ہیں۔ بعض لوگوں نے اس کے لئے خاص خاص سورتیں بھی متعین کر رکھی ہیں کہ پہلی رکعت میں فلاں سورۃ پڑھے اور دوسری رکعت میں فلاں سورۃ پڑھے وغیرہ وغیرہ۔ لیکن حضور اقدس ﷺ نے ''صلوٰۃ الحاجۃ'' کا جو طریقہ بیان فرمایا ہے اس میں نماز پڑھنے کا کوئی الگ طریقہ بیان نہیں فرمایا اور نہ کسی سورۃ کی تعیین فرمائی۔

البتہ بعض بزرگوں کے تجربات ہیں کہ اگر ''صلوٰۃ الحاجۃ'' میں فلاں فلاں سورتیں پڑھ لی

(۱) سنن الترمذی، کتاب الدعوات عن رسول اللّٰہ، باب ما جاء فی عقد التسبیح بالید، رقم: ۳٤۲۲، مسند أحمد، أول مسند المدنیین أجمعین، رقم: ۱٦۰۰٤

(۲) سنن الترمذی، کتاب الطھارۃ عن رسول اللّٰہ، باب فیما یقال بعد الوضوء، رقم: ۵۰، سنن النسائی، کتاب الطھارۃ، رقم: ۱٤۸، سنن ابن ماجہ، کتاب الطھارۃ وسننھا، باب ما یقال بعد الوضوء، رقم: ٤٦۳

(۳) سنن الترمذی، کتاب الطھارۃ عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، باب فیما یقال بعد الوضوء، رقم: ۵۰، والنسائی، کتاب الطھارۃ، رقم: ۱٤۸، وابن ماجہ، کتاب الطھارۃ وسننھا، رقم: ٤٦۳

جائیں تو بعض اوقات اس سے زیادہ فائدہ ہوتا ہے، تو اس کو سنت سمجھ کر انسان اختیار نہ کرے، اس لئے کہ اگر سنت سمجھ کر اختیار کرے گا تو وہ بدعت ہو جائے گا۔ چنانچہ میرے حضرت ڈاکٹر عبدالحیٔ صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ جب صلوٰۃ الحاجۃ پڑھنی ہو تو پہلی رکعت میں سورۃ الم نشرح اور دوسری رکعت میں سورۃ ''اذا جاء نصر اللہ'' پڑھ لیا کرو۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ان سورتوں کے پڑھنے سے زیادہ فائدہ ہوتا ہے۔ لہٰذا اگر کوئی شخص سنت سمجھے بغیر ان سورتوں کو پڑھے تو بھی ٹھیک ہے اور اگر ان کے علاوہ کوئی دوسری سورت پڑھ لے تو اس میں سنت کی خلاف ورزی لازم نہیں آتی۔ بہر حال، صلوٰۃ الحاجۃ پڑھنے کا کوئی خاص طریقہ نہیں ہے بلکہ جس طرح عام نمازیں پڑھی جاتی ہیں، اسی طرح صلوٰۃ الحاجۃ کی دو رکعتیں پڑھی جائیں گی۔ بس نماز شروع کرتے وقت دل میں یہ نیت کرلے کہ میں یہ دو رکعت صلوٰۃ الحاجۃ کے طور پر پڑھتا ہوں۔

نماز کے لئے نیت کس طرح کی جائے؟

یہاں پر یہ بھی عرض کردوں کہ آج کل لوگوں میں یہ مشہور ہو گیا ہے کہ ہر نماز کی نیت کے الفاظ علیحدہ علیحدہ ہوتے ہیں اور جب تک وہ الفاظ نہ کہے جائیں اس وقت تک نماز نہیں ہوتی، اسی وجہ سے لوگ بار بار یہ پوچھتے بھی رہتے ہیں کہ فلاں نماز کی نیت کس طرح ہوتی ہے؟ اور فلاں نماز کی نیت کس طرح ہوگی؟ اور لوگوں نے نیت کے الفاظ کو باقاعدہ نماز کا حصہ بنا رکھا ہے۔ مثلاً یہ الفاظ کہ ''نیت کرتا ہوں دو رکعت نماز کی، پیچھے اس امام کے، واسطے اللہ تعالیٰ کے، منہ میرا کعبہ شریف کی طرف وغیرہ وغیرہ''، خوب سمجھ لیں کہ نیت ان الفاظ کا نام نہیں ہے بلکہ نیت تو دل کے ارادے کا نام ہے، جب آپ نے گھر سے نکلتے وقت دل میں یہ نیت کرلی کہ میں ظہر کی نماز پڑھنے جا رہا ہوں، بس نیت ہوگئی۔ میں نمازِ جنازہ پڑھنے جا رہا ہوں، بس نیت ہوگئی۔ میں نمازِ عید پڑھنے جا رہا ہوں، بس نیت ہوگئی۔ میں نمازِ حاجت پڑھنے جا رہا ہوں، بس نیت ہوگئی۔ اب یہ الفاظ زبان سے کہنا نہ تو واجب ہیں نہ ضروری ہیں، نہ سنت ہیں، نہ مستحب ہیں، زیادہ سے زیادہ جائز ہیں، اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ لہٰذا صلوٰۃ الحاجۃ پڑھنے کا نہ کوئی مخصوص طریقہ ہے اور نہ ہی نیت کے لئے الفاظ مخصوص ہیں، بلکہ عام نمازوں کی طرح دو رکعتیں پڑھ لو۔

دعا سے پہلے اللہ کی حمد وثناء

پھر جب دو رکعتیں پڑھ لیں تو اب دعا کرو۔ اور یہ دعا کس طرح کرو، اس کے آداب بھی خود حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے بتادیئے۔ یہ نہیں کہ بس سلام پھیرتے ہی دعا شروع کردو، بلکہ سب سے پہلے تو

اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء بیان کرو اور یہ کہو: یا اللہ! تمام تعریفیں آپ کے لئے ہیں، آپ کا شکر اور احسان ہے۔

حمد وثناء کی کیا ضرورت ہے؟

اب سوال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تعریف کیوں کی جائے؟ اور اس کی کیا ضرورت ہے؟ اس کی ایک وجہ تو علماء کرام رحمہم اللہ نے یہ بتائی ہے کہ جب آدمی کسی دنیاوی حاکم کے پاس اپنی غرض لے کر جاتا ہے تو پہلے اس کی تعظیم اور تکریم کے لئے کچھ الفاظ زبان سے ادا کرتا ہے تاکہ یہ خوش ہو کر میری مراد پوری کر دے۔ لہٰذا جب دنیا کے ایک معمولی سے حاکم کے سامنے پیش ہوتے وقت اس کے لئے تعریفی کلمات استعمال کرتے ہو تو جب تم احکم الحاکمین کے دربار میں جا رہے ہو تو اس کے لئے بھی تعریف کے الفاظ زبان سے کہو کہ یا اللہ! تمام تعریفیں آپ کے لئے ہیں اور آپ کا شکر و احسان ہے، آپ میری یہ ضرورت پوری فرما دیجئے۔

دعا سے پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء کرنے کی دوسری وجہ بھی ہے اور مجھے ذوقی طور پر اس دوسری وجہ کی طرف زیادہ رجحان ہوتا ہے، وہ وجہ یہ ہے کہ جب آدمی اللہ تعالیٰ کی طرف اپنی حاجت پیش کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو چونکہ انسان اپنی ضرورت کا غلام ہے اور غرض کا بندہ ہے، اور جب اس کو کسی چیز کی ضرورت اور غرض پیش آتی ہے تو وہ ضرورت اس کے دل و دماغ پر مسلط ہو جاتی ہے، اس وقت وہ اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہے کہ یا اللہ! میری فلاں ضرورت پوری فرما دیجئے۔ اس دعا کے وقت اس بات کا اندیشہ ہوتا ہے کہ کہیں اس دعا میں ناشکری کا پہلو شامل نہ ہو جائے کہ یا اللہ! آپ میری ضرورت پوری نہیں فرما رہے ہیں، میری حاجتیں آپ پوری نہیں فرما رہے ہیں۔ حالانکہ انسان پر اللہ تعالیٰ کی جو نعمتیں بارش کی طرح برس رہی ہیں، دعا کے وقت ان نعمتوں کی طرف انسان کا دھیان نہیں جاتا اور بس اپنی ضرورت اور غرض کو لے کر بیٹھ جاتا ہے۔

بہر حال، حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ تلقین فرمائی کہ جب تم اللہ تعالیٰ کے حضور کوئی حاجت اور ضرورت لے کر جاؤ تو اس حاجت اور ضرورت کو اللہ تعالیٰ سے ضرور مانگو، لیکن پہلے اس بات کا استحضار کرلو کہ اس حاجت اور ضرورت کے ابھی تک پورا نہ ہونے کے باوجود تمہارے اُوپر اللہ تعالیٰ کی کتنی بے شمار نعمتیں بارش کی طرح برس رہی ہیں۔ پہلے ان کا تو شکر ادا کرلو کہ یا اللہ! یہ نعمتیں جو آپ نے اپنی رحمت سے مجھے دے رکھی ہیں، اس پر آپ کا شکر ہے اور آپ کی حمد ہے، آپ کی ثناء ہے، البتہ ایک حاجت اور ضرورت اور ہے، یا اللہ! اس کو بھی اپنے فضل سے پورا فرما دیجئے — تاکہ انسان کی دعا میں ناشکری کا شائبہ بھی پیدا نہ ہو۔

غم اور تکالیف بھی نعمت ہیں

حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ اپنی مجلس میں یہ مضمون بیان فرما رہے تھے کہ انسان کو زندگی میں جو غم، صدمے اور تکلیفیں پیش آتی ہیں، اگر انسان غور کرے تو یہ تکلیفیں بھی درحقیقت اللہ تعالیٰ کی نعمت ہیں، بیماری بھی اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے، فقر و فاقہ بھی اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے۔ اگر انسان کو حقیقت شناس نگاہ مل جائے تو وہ یہ دیکھے کہ یہ سب چیزیں بھی اللہ تعالیٰ کی نعمتیں ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ یہ چیزیں کس طرح سے نعمت ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ حدیث شریف میں ہے کہ جب آخرت میں اللہ تعالیٰ تکالیف اور مصیبتوں پر صبر کرنے والوں کو بے حساب اجر عطا فرمائیں گے، تو جن لوگوں پر دنیا میں زیادہ تکالیف اور مصیبتیں نہیں گزری ہوں گی، وہ تمنا کریں گے کہ کاش! دنیا میں ہماری کھالیں قینچیوں سے کاٹی گئی ہوتیں اور پھر ہم اس پر صبر کرتے۔ (۱)

اور اس صبر پر وہ اجر ملتا جو آج ان صبر کرنے والوں کو مل رہا ہے۔ بہرحال، حقیقت میں یہ تکالیف بھی نعمت ہیں، مگر چونکہ ہم کمزور ہیں اس وجہ سے ہمیں ان کے نعمت ہونے کا استحضار نہیں ہوتا۔

حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی عجیب دعا

جب حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ یہ مضمون بیان فرما رہے تھے کہ اسی دوران مجلس میں ایک شخص آ گیا جو معذور تھا اور مختلف بیماریوں میں مبتلا تھا۔ وہ آ کر حضرت حاجی صاحبؒ سے کہنے لگا کہ حضرت! میرے لئے دعا فرما دیں کہ اللہ تعالیٰ مجھے اس تکلیف سے نجات دے دیں۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ہم لوگ جو حاضرینِ مجلس تھے، حیران ہو گئے کہ ابھی تو حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرما رہے تھے کہ ساری تکلیفیں اور مصیبتیں نعمت ہوتی ہیں اور اب یہ شخص تکلیف کے ازالے کی دعا کرا رہا ہے، اب اگر حضرت حاجی صاحب اس شخص کے لئے تکلیف کے ازالے کی دعا کریں گے تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ نعمت کے ازالے کی دعا کریں گے؟ حضرت حاجی صاحب نے اسی وقت ہاتھ اُٹھا کر یہ دعا فرمائی کہ یا اللہ! حقیقت میں یہ ساری تکلیفیں اور مصیبتیں نعمت ہیں، لیکن اے اللہ! ہم کمزور ہیں، آپ ہماری کمزوری پر نظر فرماتے ہوئے اس تکلیف کی نعمت کو صحت کی نعمت سے بدل دیجئے۔

---

(۱) کنز العمال، رقم: ٦٦٦٠(٣٠٣/٣)، المعجم الکبیر للطبرانی، رقم: ٨٦٨٩(٦٦/٨)، الزواجر عن اقتراف الکبائر (٤٢٧/١)

تکلیف کے وقت دوسری نعمتوں کا استحضار

اور پھر عین تکلیف کے وقت انسان کو جو بیشمار نعمتیں حاصل ہوتی ہیں، انسان ان کو بھول جاتا ہے۔ مثلاً اگر کسی کے پیٹ میں درد ہو رہا ہے، تو اب وہ اس پیٹ کے درد کو لے کر بیٹھ جاتا ہے، لیکن وہ یہ نہیں دیکھتا کہ آنکھ جو اتنی بڑی نعمت اس کو ملی ہوئی ہے، اس میں کوئی تکلیف نہیں۔ زبان میں کوئی تکلیف نہیں۔ دانتوں میں کوئی تکلیف نہیں۔ سارے جسم میں اور کسی جگہ تکلیف نہیں۔ بس صرف پیٹ میں معمولی تکلیف ہو رہی ہے۔ اب یہ دعا ضرور کرو کہ یا اللہ! پیٹ کی تکلیف دور کر دیجئے، لیکن دعا کرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ کی اس پر حمد وثناء کرو کہ یا اللہ! جو اور بیشمار نعمتیں آپ نے عطا کی ہوئی ہیں، اے اللہ! ہم اس پر آپ کا شکر ادا کرتے ہیں، البتہ اس وقت جو یہ تکلیف آ گئی ہے اس کے لئے درخواست کرتے ہیں کہ آپ اس تکلیف کو دور کر دیجئے۔

حضرت میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور شکرِ نعمت

میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ کے استاد تھے حضرت میاں اصغر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ، یہ مادرزاد ولی اللہ تھے اور عجیب وغریب بزرگ تھے۔ حضرت والد صاحب ان کا واقعہ بیان فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ مجھے پتہ چلا کہ حضرت میاں صاحب بیمار ہیں اور ان کو بخار ہے۔ میں عیادت کے لئے ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ میں نے دیکھا کہ وہ شدید بخار میں تپ رہے ہیں اور بخار کی کرب اور بے چینی کی تکلیف میں ہیں۔ میں نے جا کر سلام کیا اور پوچھا کہ حضرت! کیسے مزاج ہیں؟ طبیعت کیسی ہے؟ جواب میں فرمایا:

> ''الحمدللہ میری آنکھیں صحیح کام کر رہی ہیں۔ الحمدللہ میرے کان صحیح کام کر رہے ہیں۔ الحمدللہ میری زبان صحیح کام کر رہی ہے۔ جتنی تکلیفیں نہیں تھیں ان سب کا ایک ایک کر کے ذکر کیا کہ ان سب میں کوئی بیماری نہیں ہے، البتہ بخار ہے، دعا کرو کہ اللہ تعالیٰ اس کو بھی دور فرما دے''

یہ ہے ایک شکر گزار بندے کا عمل جو عین تکلیف میں بھی ان راحتوں اور نعمتوں کا استحضار کر رہا ہے جو اس وقت حاصل ہیں، جس کی وجہ سے اس تکلیف کی شدت میں بھی کمی آتی ہے۔

حاصل شدہ نعمتوں پر شکر

بہرحال، حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم یہ جو تلقین فرما رہے ہیں کہ دعا کرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء

کرو، مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے اس وقت جو حاجت اور ضرورت پیش کرنے جا رہے ہو، اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ کی جو نعمتیں اس وقت تمہیں حاصل ہیں، پہلے ان کا استحضار کر کے ان پر شکر ادا کرو اور اس پر اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء کرو۔

حمد و ثناء کے بعد درود شریف کیوں؟

اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء کے بعد کیا کرے؟ اس کے لئے ارشاد فرمایا:

((وَلْيُصَلِّ عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ))

''حمد و ثناء کے بعد اور اپنی حاجت پیش کرنے سے پہلے نبی کریم ﷺ پر درود بھیجو''

اب سوال یہ ہے کہ اس وقت درود بھیجنے کا کیا موقع ہے؟ بات دراصل یہ ہے کہ حضورِ اقدس ﷺ اپنی اُمت پر بہت ہی زیادہ شفیق اور مہربان ہیں۔ وہ یہ چاہتے ہیں کہ جب میرا اُمتی اللہ تعالیٰ کے حضور دعا مانگے تو اس کی وہ دعا رد نہ ہو۔ پوری کائنات میں درود شریف کے علاوہ کسی دعا کے بارے میں یہ گارنٹی نہیں ہے کہ وہ ضرور قبول ہوگی، لیکن اگر نبی کریم ﷺ پر درود بھیجا جائے تو اس کے بارے میں یہ گارنٹی یقینی ہے کہ وہ ضرور قبول ہوگا۔ جب ہم درود بھیجتے ہیں اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى آلِ مُحَمَّدِ النَّبِيِّ الْأُمِّيِّ اسکا کیا مطلب ہے؟ اسکا مطلب یہ ہے کہ اے اللہ! محمد رسول اللہ ﷺ پر رحمتیں نازل فرمایئے۔ یہ ایسی دعا ہے کہ اس کے رد ہونے کا کوئی امکان نہیں، اس کی قبولیت کا وعدہ ہے، اس کی قبولیت کی گارنٹی ہے کہ یہ دعا ضرور قبول ہوگی۔ اسلئے کہ حضورِ اقدس ﷺ پر تو پہلے سے رحمتیں نازل ہو رہی ہیں اور مزید نازل ہوتی رہیں گی، وہ ہمارے درود بھیجنے کے محتاج نہیں ہیں۔

درود شریف بھی قبول اور دعا بھی قبول

لیکن حضورِ اقدس ﷺ یہ چاہتے ہیں کہ میرے اُمتی اپنی مراد اور ضرورت مانگنے سے پہلے مجھ پر درود بھیج دیں تو اللہ تعالیٰ اس درود کو ضرور قبول فرمائیں گے، اور جب درود شریف کو قبول فرمائیں گے تو اس حاجت اور ضرورت کی دعا کو بھی ضرور قبول فرمائیں گے، اس لئے کہ ان کی رحمت سے یہ بات بعید ہے کہ ایک دعا کو تو قبول فرمالیں اور دوسری دعا کو رد فرما دیں۔ اس لئے درود شریف کے بعد کی جانے والی دعا کی قبولیت کی زیادہ اُمید ہے۔

حضور ﷺ اور ہدیہ کا بدلہ

ایک دوسری وجہ میرے حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب قدس اللہ سرہ بیان فرمایا کرتے تھے کہ

حضورِ اقدس ﷺ کا عمر بھر کا معمول یہ تھا کہ جب کوئی شخص آپ کی خدمت میں کوئی ہدیہ لے کر آتا تو آپ اس ہدیہ کا کچھ نہ کچھ بدلہ ضرور دیا کرتے تھے اور ہدیہ کی مکافات فرمایا کرتے تھے۔ اور یہ درود شریف بھی ایک ہدیہ ہے، اس لئے کہ حدیث شریف میں صراحت ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا کہ اگر کوئی شخص دور سے درود شریف بھیجتا ہے تو وہ درود مجھ تک پہنچایا جاتا ہے، اور جو شخص قبر پر آ کر مجھ کو سلام کرے اور درود بھیجے تو میں خود اس کو سنتا ہوں۔ (۱)

یہ درود شریف ایک اُمتی کا تحفہ اور ہدیہ ہے جو آپ تک پہنچایا جاتا ہے۔ لہٰذا جب دنیا میں اور زندگی میں آپ کی سنت یہ تھی کہ جب آپ کے پاس کوئی شخص ہدیہ لے کر آتا تو آپ اس کی مکافات فرمایا کرتے تھے اور اس ہدیہ کے بدلے ہدیہ دیا کرتے تھے، تو اُمید یہ ہے کہ عالمِ برزخ میں جب ایک اُمتی کی طرف سے حضورِ اقدس ﷺ کی خدمت میں درود شریف کا یہ ہدیہ پہنچے گا تو آپ اس ہدیہ کا بھی بدلہ عطا فرمائیں گے، وہ بدلہ یہ ہوگا کہ آپ ﷺ اس اُمتی کے حق میں دعائیں کریں گے کہ یا اللہ! اس اُمتی نے میرے لئے یہ تحفہ بھیجا ہے اور میرے لئے دعا کی ہے، اے اللہ! میں اس کے لئے دعا کرتا ہوں کہ اس کی مراد پوری فرمادیں۔ لہٰذا جو اُمتی درود بھیجنے کے بعد دعا کرے گا تو حضور اکرم ﷺ اس کے لئے وہاں دعا فرمائیں گے۔ اس لئے جب دعا کرنے بیٹھو تو پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء کرو اور پھر حضورِ اقدس ﷺ پر درود بھیجو۔

دعائے حاجت کے الفاظ

اس کے بعد دعا کے یہ الفاظ کہو:

((لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ الْحَلِيْمُ الْكَرِيْمُ))

اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنیٰ کے اندر کیا کیا انوارات اور کیا کیا خواص پوشیدہ ہیں یہ تو اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتے ہیں یا اللہ کے رسول ﷺ بہتر جانتے ہیں، ہم لوگ اس کی تہہ تک کہاں پہنچ سکتے ہیں۔ ان اسماء حسنیٰ میں اللہ تعالیٰ نے بذاتِ خود خاصیتیں رکھی ہیں اس لئے جب خود حضورِ اقدس ﷺ یہ تلقین فرمائیں کہ ان اسماء حسنیٰ کا ذکر کرو تو اس کے پیچھے ضرور کوئی راز ہوتا ہے۔ لہٰذا خاص طور پر وہی کلمات کہنے چاہئیں تا کہ وہ مقصد حاصل ہو۔ چنانچہ فرمایا:

((لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ الْحَلِيْمُ الْكَرِيْمُ))

''اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ اللہ جو حلیم ہیں اور کریم ہیں''

---

(۱) سنن أبي داود، كتاب المناسك، باب زيارة القبور، رقم: ١٧٤٥، سنن النسائي، كتاب السهو، باب السلام على النبي، رقم: ١٢٦٥، مسند أحمد، رقم: ٣٤٨٤

''حلم'' بھی اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے ہے اور ''کرم'' بھی اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے ہے۔ ان دونوں صفتوں کو خاص طور پر بظاہر اس لئے ذکر فرمایا کہ بندہ پہلے مرحلے پر ہی یہ اعتراف کرے کہ یا اللہ! میں اس قابل تو نہیں ہوں کہ آپ میری دعا قبول کریں، اپنی ذات کے لحاظ سے میں اس لائق نہیں ہوں کہ آپ کی بارگاہ میں کوئی درخواست پیش کرسکوں، اس وجہ سے کہ میرے گناہ بیشمار ہیں، میری خطائیں بیشمار ہیں، میری بداعمالیاں اتنی ہیں کہ آپ کے حضور درخواست پیش کرنے کی لیاقت مجھ میں نہیں ہے، لیکن چونکہ آپ حلیم ہیں، بردباری آپ کی صفت ہے، اور اس کی وجہ سے کوئی بندہ چاہے وہ کتنا ہی خطاکار ہو، اس خطاکار کی خطاؤں کی وجہ سے جذبات میں آکر آپ کوئی فیصلہ نہیں فرماتے، بلکہ اپنی صفتِ ''حلم'' کے تحت فیصلہ فرماتے ہیں، اس لئے میں صفتِ ''حلم'' کا واسطہ دے کر دعا کرتا ہوں، اور آپ کی صفتِ ''حلم'' کا تقاضا یہ ہے کہ آپ میرے گناہوں سے درگزر فرمائیں۔ اور پھر صفتِ ''کرم'' کا معاملہ فرمائیں یعنی صرف یہ نہ ہو کہ گناہوں سے درگزر فرمائیں بلکہ اُوپر سے مزید نوازشیں عطا فرمائیں، مزید اپنا کرم میرے اُوپر فرمائیں۔ صفتِ کرم اور صفتِ حلم کا واسطہ دے کر دعا کرو۔

اس کے بعد فرمایا:

((سُبْحَانَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ))

''اللہ تعالیٰ پاک ہے جو عرشِ عظیم کا مالک ہے''

((اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ))

''اور تمام تعریفیں اس اللہ کے لئے ہیں جو تمام جہانوں کا پالنے والا ہے''

پہلے یہ تعریفی کلمات کہے اور اس کے بعد ان الفاظ کے ساتھ دعا کرے:

((اَللّٰهُمَّ اَسْأَلُكَ مُوْجِبَاتِ رَحْمَتِكَ))

''اے اللہ میں آپ سے ان چیزوں کا سوال کرتا ہوں جو آپ کی رحمت کا موجب ہوں''

((وَعَزَائِمَ مَغْفِرَتِكَ))

''اور آپ کی پختہ مغفرت کا سوال کرتا ہوں''

((وَالْغَنِيْمَةَ مِنْ كُلِّ بِرٍّ))

''اور اس بات کا سوال کرتا ہوں کہ مجھے ہر نیکی سے حصہ عطا فرمایئے''

((وَالسَّلَامَةَ مِنْ كُلِّ اِثْمٍ))

''اور مجھے ہر گناہ سے محفوظ رکھئے''

((لَا تَدَعْ لَنَا ذَنْبًا اِلَّا غَفَرْتَهٗ))

''ہمارا کوئی گناہ ایسا نہ چھوڑیئے جس کو آپ نے معاف نہ فرمایا ہو۔ یعنی ہر گناہ کو معاف فرما دیجئے''

((وَلَا هَمًّا اِلَّا فَرَّجْتَهٗ))

''اور کوئی تکلیف ایسی نہ چھوڑیئے جس کو آپ نے دور نہ فرما دیا ہو''

((وَلَا حَاجَةً هِيَ لَكَ رِضًى اِلَّا قَضَيْتَهَا يَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِيْنَ))

''اور کوئی حاجت جس میں آپ کی رضامندی ہو ایسی نہ چھوڑیئے کہ اس کو آپ نے پورا نہ فرمایا ہو''

یہ دعا کے الفاظ اور اس کا ترجمہ ہے اور مسنون دعاؤں کی کتابوں میں بھی یہ دعا موجود ہے، یہ دعا ہر مسلمان کو یاد کر لینی چاہئے۔ اس کے بعد پھر اپنے الفاظ میں جو حاجت مانگنا چاہتا ہے وہ اللہ تعالیٰ سے مانگے۔ اُمید ہے اللہ تعالیٰ اس دعا کو ضرور قبول فرمائیں گے۔

ہر ضرورت کے لئے صلوٰۃ الحاجۃ پڑھیں

ایک حدیث شریف میں حضورِ اقدس ﷺ کی یہ سنت بیان کی گئی ہے:

"كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا حَزَبَهٗ اَمْرٌ صَلّٰى"(۱)

''جب بھی حضورِ اقدس ﷺ کو کوئی تشویش کا معاملہ پیش آتا تو آپ سب سے پہلے نماز کی طرف دوڑتے''

اور یہی صلوٰۃ الحاجۃ پڑھتے اور دعا کرتے کہ یا اللہ! یہ مشکل پیش آگئی ہے، آپ اس کو دور فرما دیجئے۔ اس لئے ایک مسلمان کا کام یہ ہے کہ وہ اپنے مقاصد کے لئے صلوٰۃ الحاجۃ کی کثرت کرے۔

اگر وقت تنگ ہو تو صرف دعا کرے

یہ تفصیل تو اس صورت میں ہے جب انسان کے پاس فیصلہ کرنے کے لئے وقت ہے اور دو رکعت پڑھنے کی گنجائش ہے، لیکن اگر جلدی کا موقع ہے اور اتنی مہلت نہیں ہے کہ وہ دو رکعت پڑھ کر دعا کرے، تو اس صورت میں دو رکعت پڑھے بغیر ہی دعا کے یہ الفاظ پڑھ کر اللہ تعالیٰ سے مانگے۔ لیکن

---

(۱) سنن أبي داود، كتاب الصلاة، باب قيام النبي من الليل، رقم: ١١٢٤، مسند أحمد، حديث حذيفة بن اليمان، رقم: ٢٢٢١٠

اپنی ہر حاجت اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ضرور پیش کر دے، چاہے وہ چھوٹی حاجت ہو یا بڑی حاجت ہو۔ حتیٰ کہ حضورِ اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اگر تمہارے جوتے کا تسمہ بھی ٹوٹ جائے تو اللہ تعالیٰ سے مانگو۔

لہٰذا جب چھوٹی چیز بھی اللہ تعالیٰ سے مانگنے کا حکم دیا جا رہا ہے تو بڑی چیز اور زیادہ اللہ تعالیٰ سے مانگنی چاہئے۔ اور درحقیقت یہ چھوٹی اور بڑی ہماری نسبت سے ہے، جوتے کے تسمہ کا درست ہو جانا یہ چھوٹی بات ہے اور سلطنت کا مل جانا بڑی بات ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے یہاں چھوٹے بڑے کا کوئی فرق نہیں، ان کے نزدیک سب کام چھوٹے ہیں، ہماری بڑی سے بڑی حاجت، بڑے سے بڑا مقصد اللہ تعالیٰ کے نزدیک چھوٹا ہے۔

﴿إِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ﴾ (۱)

''اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے''

ان کی قدرت ہر چیز پر یکساں ہے، اس کے لئے کوئی کام مشکل نہیں، اس کے لئے کوئی کام بڑا نہیں۔ اس لئے بڑی حاجت ہو یا چھوٹی حاجت ہو، بس اللہ ہی سے مانگو۔

یہ پریشانیاں اور ہمارا حال

آج کل ہمارے شہر میں ہر شخص پریشان ہے، ہمارے شہر کی کیا حالت بنی ہوئی ہے۔ العیاذ باللہ۔ کوئی گھرانہ ایسا نہیں ہے جو ان حالات کی وجہ سے بے چینی اور بے تابی کا شکار نہ ہو، کوئی براہِ راست مبتلا ہے اور کوئی بالواسطہ مبتلا ہے، کوئی اندیشوں کا شکار ہے، کسی کی جان مال عزت آبرو محفوظ نہیں، سب کا بُرا حال ہے۔ لیکن دوسری طرف ہمارا حال یہ ہے کہ صبح سے لے کر شام تک اس صورتِ حال پر تبصرے تو بہت کرتے ہیں، جہاں چار آدمی بیٹھے اور تبصرے شروع ہو گئے، فلاں جگہ یہ ہو گیا، فلاں جگہ یہ ہو گیا، فلاں نے یہ غلطی کی، فلاں نے یہ غلطی کی، حکومت نے یہ غلطی کی وغیرہ۔ لیکن ہم میں سے کتنے لوگ ایسے ہیں جن کو تڑپ کر اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے اور اللہ تعالیٰ سے دعا مانگنے کی توفیق ہوئی، کہ یا اللہ! یہ مصیبت ہم پر مسلط ہے، ہمارے گناہوں کا وبال ہم پر مسلط ہے، ہماری شامتِ اعمال ہم پر مسلط ہے، یا اللہ! اپنی رحمت سے اس کو دور فرما دیں۔ بتائیے کہ ہم میں سے کتنوں کو اس کی توفیق ہوئی؟

---

(۱) البقرة: ۲۰

تبصرہ کرنے سے کوئی فائدہ نہیں

۱۹۷۱ء میں جب مشرقی پاکستان کے سقوط کا واقعہ پیش آیا اور مسلمانوں کی تاریخ میں ذلت کا ایسا واقعہ پیش نہیں آیا تھا جو اس موقع پر پیش آیا کہ نوّے ہزار مسلمانوں کی فوج ہندوؤں کے آگے ہتھیار ڈال کر ذلیل ہوگئی۔ تمام مسلمانوں پر اس کے صدمے کا اثر تھا، سب لوگ پریشان تھے۔ اسی دوران میری حضرت ڈاکٹر صاحب قدس اللہ سرہ کے یہاں حاضری ہوئی، میرے ساتھ میرے بڑے بھائی حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب مدظلہم بھی تھے، جب وہاں پہنچے تو کچھ خاص خاص لوگ وہاں موجود تھے۔ اب وہاں پر تبصرے شروع ہوگئے کہ اس کے اسباب کیا تھے؟ کون اس کا سبب بنا؟ کس کی غلطی ہے؟ کسی نے کہا کہ فلاں پارٹی کی غلطی ہے، کسی نے کہا کہ فلاں پارٹی کی غلطی ہے، کسی نے کہا کہ فوج کی غلطی ہے۔ حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ تھوڑی دیر تک سب کی باتیں سنتے رہے، اس کے بعد حضرت والا فرمانے لگے کہ اچھا بھائی! آپ لوگوں نے کوئی فیصلہ کرلیا کہ کون مجرم ہے؟ اور کون بے گناہ ہے؟ اور اس فیصلے کے نتائج کیا نکلے؟ جو مجرم ہے کیا اس کو سزا دو گے؟ اور جو بے گناہ ہے اس کی برأت کا اظہار کردو گے؟ یہ بتاؤ کہ اتنی دیر تک تم جو تبصرے کرتے رہے اس کا کیا نتیجہ نکلا؟ کیا دنیا یا آخرت کا کوئی فائدہ تمہیں حاصل ہوا؟

تبصرہ کے بجائے دعا کریں

اگر اتنی دیر تم اللہ تعالیٰ کے حضور دعا کے لئے ہاتھ اُٹھا دیتے اور اللہ تعالیٰ سے کہتے کہ یا اللہ! ہماری شامتِ اعمال کے نتیجے میں ہم پر یہ مصیبت آگئی ہے، اے اللہ! ہمیں معاف فرما اور ہم سے اس مصیبت کو دور فرما اور ہماری شامتِ اعمال کو رفع فرما اور اس ذلت کو عزت سے بدل دیجئے۔ اگر یہ دعا کرلی ہوتی تو کیا بعید ہے کہ اللہ تعالیٰ اس دعا کو قبول فرمالیتے اور اگر بالفرض وہ دعا قبول نہ ہوتی تب بھی اس دعا کے کرنے کا ثواب تو حاصل ہوجاتا اور آخرت کی نعمت تمہیں حاصل ہوجاتی۔ اب یہ تم نے بیٹھ کر جو فضول تبصرے کیے اس سے نہ کوئی دنیا کا فائدہ ہوا اور نہ ہی آخرت کا کوئی فائدہ ہوا۔

اس وقت ہماری آنکھیں کھلیں کہ واقعۃً ہم دن رات اس مرض میں مبتلا ہیں کہ دن رات بس ان باتوں پر تبصرے ہورہے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ کے حضور حاضر ہوکر مانگنے کا سلسلہ ختم ہوگیا۔ ہم میں کتنے لوگ ایسے ہیں جنہوں نے ان حالات سے بیتاب ہوکر اللہ تعالیٰ سے گڑگڑا کر دعائیں کیں اور صلوٰۃ الحاجۃ پڑھ کر دعا کی ہو، کہ یا اللہ! میں صلوٰۃ الحاجۃ پڑھ رہا ہوں، اے اللہ! اپنی رحمت سے یہ عذاب ہم سے دور فرمادیجئے۔ یہ کام شاذ و نادر ہی کسی اللہ کے بندے نے کیا ہوگا، لیکن صبح سے لے کر

شام تک تبصرے ہو رہے ہیں، وقت ان تبصروں میں صرف ہو رہا ہے، اور پھر ان تبصروں میں معلوم نہیں کتنی غیبت ہو رہی ہے، کتنے بہتان باندھے جا رہے ہیں، اور ان کے ذریعہ اُلٹا اپنے سر گناہ لے رہے ہیں۔

اللہ کی طرف رجوع کریں

تمام حضرات سے درخواست ہے کہ وہ ان حالات میں دعا کی طرف توجہ کریں۔ اگر کسی کے بس میں کوئی تدبیر ہے تو وہ تدبیر اختیار کرے اور اگر تدبیر اختیار میں نہیں ہے تو اللہ تعالیٰ سے دعا کرنا تو ہر ایک کے اختیار میں ہے۔ ہمارے اندر سے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے کا سلسلہ اب ختم ہوتا جا رہا ہے۔ ہمیں یاد ہے کہ جب پاکستان بن رہا تھا، اس وقت ملک میں فسادات ہو رہے تھے، اس وقت دیو بند اور دوسرے شہروں میں گھر گھر آیتِ کریمہ کا ختم ہو رہا تھا، کسی کی طرف سے اپیل نہیں تھی، بلکہ مسلمان اپنی تحریک سے اور اپنے شوق سے اور ضرورت محسوس کر کے گھر گھر اور محلّہ محلّہ آیتِ کریمہ کا ختم کر رہے تھے، عورتیں اپنے گھروں میں بیٹھی ہوئی آیتِ کریمہ کا ختم کر رہی تھیں اور دعائیں ہو رہی تھیں کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو اس مصیبت سے نکال دے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اس مصیبت سے نجات دیدی۔

پھر بھی آنکھیں نہیں کھلتیں

آج ہمارے شہر میں سب کچھ ہو رہا ہے، آنکھوں کے سامنے لاشیں تڑپ رہی ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے کی توفیق نہیں ہوتی۔ کیا آپ نے کہیں سنا کہ محلّوں میں یا گھروں میں آیتِ کریمہ کا ختم کیا جا رہا ہو اور دعا کرنے کا اہتمام ہو رہا ہو۔ بلکہ یہ ہو رہا ہے کہ آنکھوں کے سامنے لاشیں تڑپ رہی ہیں، موت آنکھوں کے سامنے ناچ رہی ہے، اور لوگ گھروں میں بیٹھ کر وی سی آر دیکھ رہے ہیں۔ اب بتایئے ان حالات میں اللہ تعالیٰ کا قہر اور عذاب نازل نہ ہو تو کیا ہو۔ تمہارے سامنے اچھا خاصا آدمی ذرا سی دیر میں دنیا سے چل بسا، لیکن پھر بھی تمہاری آنکھیں نہیں کھلتیں، پھر بھی تم گناہوں کو نہیں چھوڑتے، پھر بھی اللہ کی نافرمانی پر کمر باندھے ہوئے ہو۔

اپنی جانوں پر رحم کرتے ہوئے یہ کام کر لو

خدا کے لئے اپنی جانوں پر رحم کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے کا سلسلہ شروع کر دو۔ اور کون مسلمان ایسا ہے جو یہ نہیں کر سکتا کہ وہ اس مقصد کے لئے دو رکعت صلوٰۃ الحاجۃ کی نیت

سے پڑھ لیا کرے۔ دو رکعتیں پڑھنے میں کتنی دیر لگتی ہے، اوسطاً دو رکعت پڑھنے میں دو منٹ لگتے ہیں، اور دو رکعت کے بعد دعا کرنے میں تین منٹ مزید لگ جائیں گے۔ اپنی اس قوم اور اس ملت کے لئے پانچ منٹ اللہ تعالیٰ کے حضور حاضر ہو کر دعا مانگنے کی بھی توفیق نہیں ہوتی تو پھر کس منہ سے کہتے ہو کہ ہمیں قوم میں ہونے والے ان فسادات کی وجہ سے صدمہ اور رنج اور تکلیف ہو رہی ہے۔ لہٰذا جب تک ان فسادات کا سلسلہ جاری ہے، اس وقت تک روزانہ دو رکعت صلوٰۃ الحاجۃ پڑھ کر اللہ تعالیٰ سے دعا کرو۔ اور خدا کے لئے اپنے جانوں پر رحم کرتے ہوئے اپنے گھروں سے نافرمانی کے ذرائع اور آلے کو نکال دو اور نافرمانی اور گناہ کے سلسلے کو بند کر دو، اور اللہ تعالیٰ کے حضور رو رو کر اور گڑگڑا کر دعا کرو۔ آیتِ کریمہ:

﴿لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ سُبْحَانَكَ إِنِّي كُنْتُ مِنَ الظَّالِمِينَ﴾ (۱)

کا ختم کرو اور "یَا سَلَامُ" کا ورد کرو اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرو۔ فضول تبصروں میں وقت ضائع کرنے کے بجائے اس کام میں لگو۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنی طرف رجوع کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ.

(۱) الأنبیاء: ۸۷

روزہ
ہم سے کیا مطالبہ کرتا ہے ☆

بعد از خطبہ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ! فَأَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِo بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِo
﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْ أُنزِلَ فِيْهِ الْقُرْآنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنَاتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ فَمَن شَهِدَ مِنكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ﴾ (۱)

برکت والا مہینہ

انشاء اللہ چند روز کے بعد رمضان المبارک کا مہینہ شروع ہونے والا ہے، اور کون مسلمان ایسا ہوگا جو اس مہینے کی عظمت اور برکت سے واقف نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ نے یہ مہینہ اپنی عبادت کے لئے بنایا ہے۔ اور نہ معلوم کیا کیا رحمتیں اللہ تعالیٰ اس مہینے میں اپنے بندوں کی طرف مبذول فرماتے ہیں۔ ہم اور آپ ان رحمتوں کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔

اس مہینے کے اندر بعض اعمال ایسے ہیں جن کو ہر مسلمان جانتا ہے، اور اس پر عمل بھی کرتا ہے۔ مثلاً اس ماہ میں روزے فرض ہیں۔ الحمدللہ مسلمانوں کو روزہ رکھنے کی توفیق ہو جاتی ہے۔ اور تراویح کے بارے میں معلوم ہے کہ یہ سنت ہے، مسلمانوں کو اس میں شرکت کی سعادت حاصل ہو جاتی ہے، لیکن اس وقت ایک اور پہلو کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں۔

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ رمضان المبارک کی خصوصیت صرف یہ ہے کہ اس میں روزے رکھے جاتے ہیں، اور رات کے وقت تراویح پڑھی جاتی ہے، اور بس، اس کے علاوہ اور کوئی خصوصیت نہیں۔ اس میں تو کوئی شک نہیں ہے کہ یہ دونوں عبادتیں اس مہینے کی بڑی اہم عبادات میں سے ہیں۔

☆ اصلاحی خطبات (۱/۱۱۵تا۱۳۶)، رمضان المبارک اور روزے کے بارے میں مزید بیانات جلد (۱۱) میں ملاحظہ فرمائیں۔

(۱) البقرة: ۱۸۵

لیکن بات صرف یہاں تک ختم نہیں ہوتی، بلکہ درحقیقت رمضان المبارک ہم سے اس سے زیادہ کا مطالبہ کرتا ہے۔ اور قرآن کریم میں اللہ جل شانہٗ نے ارشاد فرمایا:

﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ﴾ (۱)

یعنی میں نے جنات اور انسانوں کو صرف ایک کام کے لئے پیدا کیا، وہ یہ کہ میری عبادت کریں، اس آیتِ کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے انسان کی تخلیق کا بنیادی مقصد یہ بتایا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرے۔

''کیا فرشتے کافی نہیں تھے؟''

یہاں بعض لوگوں کو خاص کر نئی روشنی کے لوگوں کو یہ شبہ ہوتا ہے کہ اگر انسان کی تخلیق کا مقصد صرف عبادت تھا، تو اس کام کے لئے انسان کو پیدا کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ یہ کام تو فرشتے پہلے سے بہت اچھی طرح انجام دے رہے تھے؟ اور وہ اللہ کی عبادت تسبیح اور تقدیس میں لگے ہوئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو تخلیق فرمانے کا ارادہ کیا اور فرشتوں کو بتایا کہ میں اس طرح کا ایک انسان پیدا کرنے والا ہوں تو فرشتوں نے بے ساختہ یہ کہا کہ آپ ایک ایسے انسان کو پیدا کر رہے ہیں جو زمین میں فساد مچائے گا، اور خون ریزی کرے گا، اور عبادت، تسبیح و تقدیس ہم انجام دے رہے ہیں ــــ اسی طرح آج بھی اعتراض کرنے والے یہ اعتراض کر رہے ہیں کہ اگر انسان کی تخلیق کا مقصد صرف عبادت ہوتا تو اس کے لئے انسان کو پیدا کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ یہ کام تو فرشتے پہلے ہی انجام دے رہے تھے۔

فرشتوں کا کوئی کمال نہیں

بیشک اللہ تعالیٰ کے فرشتے اللہ تعالیٰ کی عبادت کر رہے تھے۔ لیکن ان کی عبادت بالکل مختلف نوعیت کی تھی۔ اور انسان کے سپرد جو عبادت کی گئی وہ بالکل مختلف نوعیت کی تھی۔ اس لئے کہ فرشتے جو عبادت کر رہے تھے، ان کے مزاج میں اس کے خلاف کرنے کا امکان ہی نہیں تھا۔ وہ اگر چاہیں کہ عبادت نہ کریں تو ان کے اندر عبادت چھوڑنے کی صلاحیت نہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کے اندر سے گناہ کرنے کا امکان ہی ختم فرما دیا اور نہ انہیں بھوک لگتی ہے، نہ ان کو پیاس لگتی ہے، اور نہ ان کے اندر شہوانی تقاضا پیدا ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ ان کے دل میں گناہ کا وسوسہ بھی نہیں گزرتا، گناہ کی خواہش اور گناہ پر اقدام تو دور کی بات ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان کی عبادت پر کوئی اجر و ثواب بھی نہیں رکھا۔ کیونکہ اگر

---

(۱) الذاریات: ۵۶

فرشتے گناہ نہیں کر رہے ہیں تو اس میں ان کا کوئی کمال نہیں۔ اور جب کوئی کمال نہیں تو پھر جنت والا اجر وثواب بھی مرتب نہیں ہوگا۔

نابینا کا بچنا کمال نہیں

مثلاً ایک شخص بینائی سے محروم ہے، جس کی وجہ سے ساری عمر اس نے نہ کبھی فلم دیکھی، نہ کبھی ٹی وی دیکھا، اور نہ کبھی غیر محرم پر نگاہ ڈالی۔ بتایئے کہ ان گناہوں کے نہ کرنے میں اس کا کیا کمال ظاہر ہوا؟ اس لئے کہ اس کے اندر ان گناہوں کے کرنے کی صلاحیت ہی نہیں۔ لیکن ایک دوسرا شخص جس کی بینائی بالکل ٹھیک ہے، جو چیز چاہے دیکھ سکتا ہے، لیکن دیکھنے کی صلاحیت موجود ہونے کے باوجود جب کسی غیر محرم کی طرف دیکھنے کا تقاضا دل میں پیدا ہوتا ہے، وہ فوراً صرف اللہ تعالیٰ کے خوف سے نگاہ نیچے کر لیتا ہے۔ اب بظاہر دونوں گناہوں سے بچ رہے ہیں۔ لیکن دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ پہلا شخص بھی گناہ سے بچ رہا ہے، اور دوسرا شخص بھی گناہ سے بچ رہا ہے۔ لیکن پہلے شخص کا گناہ سے بچنا کوئی کمال نہیں۔ اور دوسرے شخص کا گناہ سے بچنا کمال ہے۔

یہ عبادت فرشتوں کے بس میں نہیں ہے

لہٰذا اگر ملائکہ صبح سے شام تک کھانا نہ کھائیں تو یہ کوئی کمال نہیں۔ اس لئے کہ انہیں بھوک ہی نہیں لگتی۔ اور انہیں کھانے کی حاجت ہی نہیں۔ لہٰذا اُن کے نہ کھانے پر کوئی اجر وثواب بھی نہیں۔ لیکن انسان ان تمام حاجتوں کو لے کر پیدا ہوا ہے۔ لہٰذا کوئی انسان کتنے ہی بڑے سے بڑے مقام پر پہنچ جائے، حتیٰ کہ سب سے اعلیٰ مقام یعنی نبوت پر پہنچ جائے، تب بھی وہ کھانے پینے سے مستغنی نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ کفار نے انبیاء پر یہی اعتراض کیا کہ:

﴿وَقَالُوا مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَأْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْأَسْوَاقِ﴾ (۱)

یعنی یہ رسول کیسے ہیں جو کھانا بھی کھاتے ہیں اور بازاروں میں چلتے پھرتے ہیں۔ تو کھانے کا تقاضا انبیاء کے ساتھ بھی لگا ہوا ہے۔ اب اگر انسان کو بھوک لگ رہی ہے، لیکن اللہ کے حکم کی وجہ سے کھانا نہیں کھا رہا ہے، تو یہ کمال کی بات ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے فرمایا کہ میں ایک ایسی مخلوق پیدا کر رہا ہوں، جس کو بھوک بھی لگے گی، پیاس بھی لگے گی، اور اس کے اندر شہوانی تقاضے بھی پیدا ہوں گے۔ اور گناہ کرنے کے دواعی بھی ان کے اندر پیدا ہوں گے، لیکن جب گناہ کا داعیہ پیدا ہوگا، اس وقت وہ مجھے یاد کر لے گا۔ اور مجھے یاد کر کے اپنے نفس کو اس گناہ سے بچا لے گا۔ اس کی

(۱) الفرقان: ۷

یہ عبادت اور گناہ سے بچنا ہمارے یہاں قدر و قیمت رکھتا ہے۔ اور جس کا اجر و ثواب اور بدلہ دینے کے لئے ہم نے ایسی جنت تیار کر رکھی ہے، جس کی صفت عرضھا السموت والارض (جس کی چوڑائی زمین و آسمان کے برابر ہے) ہے۔ اس لئے کہ اس کے دل میں داعیہ اور تقاضا ہو رہا ہے، اور خواہشات پیدا ہو رہی ہیں، اور گناہ کے محرکات سامنے آرہے ہیں، لیکن یہ انسان ہمارے خوف اور ہماری عظمت کے تصور سے اپنی آنکھ کو گناہ سے بچالیتا ہے۔ اپنے کان کو گناہ سے بچالیتا ہے۔ اپنی زبان کو گناہ سے بچالیتا ہے۔ اور گناہوں کی طرف اُٹھتے ہوئے قدموں کو روک لیتا ہے۔ تاکہ میرا اللہ مجھ سے ناراض نہ ہو جائے۔ یہ عبادت فرشتوں کے بس میں نہیں تھی۔ اس عبادت کے لئے انسان کو پیدا کیا گیا۔

حضرت یوسف علیہ السلام کا کمال

حضرت یوسف علیہ السلام کو جو فتنہ زلیخا کے مقابلے میں پیش آیا، کون مسلمان ایسا ہے جو اس کو نہیں جانتا۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ زلیخا نے حضرت یوسف علیہ السلام کو گناہ کی دعوت دی۔ اس وقت زلیخا کے دل میں بھی گناہ کا خیال پیدا ہوا، اور حضرت یوسف علیہ السلام کے دل میں بھی گناہ کا خیال آ گیا۔ عام لوگ تو اس سے حضرت یوسف علیہ السلام پر اعتراض اور ان کی تنقیص بیان کرتے ہیں۔ حالانکہ قرآن کریم یہ بتلانا چاہتا ہے کہ گناہ کا خیال آجانے کے باوجود اللہ تعالیٰ کے خوف اور ان کی عظمت کے استحضار سے اس گناہ کے خیال پر عمل نہیں کیا۔ اور اللہ تعالیٰ کے حکم کے آگے سرِ تسلیم خم کر لیا۔ لیکن اگر گناہ کا خیال بھی دل میں نہ آتا، اور گناہ کرنے کی صلاحیت ہی نہ ہوتی، اور گناہ کا تقاضا ہی پیدا نہ ہوتا، تو پھر ہزار مرتبہ زلیخا گناہ کی دعوت دے، پھر تو کمال کی کوئی بات نہیں تھی۔ کمال تو یہی تھا کہ گناہ کی دعوت دی جارہی ہے، اور ماحول بھی موجود، حالات بھی سازگار، اور دل میں خیال بھی آرہا ہے، لیکن ان سب چیزوں کے باوجود اللہ کے حکم کے آگے سرِ تسلیم خم کر کے فرمایا:

﴿ قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ ﴾ (۱)

"میں اللہ کی پناہ چاہتا ہوں"

یہ عبادت ہے جس کے لئے اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا فرمایا۔

ہماری جانوں کا سودا ہو چکا ہے

جب انسان کا مقصدِ تخلیق عبادت ہے تو اس کا تقاضا یہ تھا کہ جب انسان دنیا میں آئے تو صبح

(۱) یوسف: ۲٤

سے لے کر شام تک عبادت کے علاوہ کوئی اور کام نہ کرے، اور اس کو دوسرے کام کرنے کی اجازت نہ ہونی چاہئے۔ چنانچہ دوسری جگہ قرآن کریم نے فرمایا کہ:

﴿إِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ أَنْفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ﴾ (۱)

یعنی اللہ تعالیٰ نے مؤمنوں سے ان کی جانیں اور ان کے مال خرید لیے۔ اور اس کا معاوضہ یہ مقرر فرمایا کہ آخرت میں ان کو جنت ملے گی۔ جب ہماری جانیں بک چکی ہیں، تو یہ جانیں جو ہم لیے بیٹھے ہیں، وہ ہماری نہیں ہیں۔ بلکہ بکا ہوا مال ہے۔ اس کی قیمت لگ چکی ہے۔ جب یہ جان اپنی نہیں ہے تو اس کا تقاضا یہ تھا کہ اس جان اور جسم کو سوائے اللہ کی عبادت کے دوسرے کام میں نہ لگایا جائے۔ لہٰذا اگر ہمیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ حکم دیا جاتا ہے کہ تمہیں صبح سے شام تک دوسرے کام کرنے کی اجازت نہیں، بس صرف سجدے میں پڑے رہا کرو اور اللہ اللہ کیا کرو، دوسرے کاموں کی اجازت نہیں، نہ کمانے کی اجازت ہے، نہ کھانے کی اجازت ہے، تو یہ حکم انصاف کے خلاف نہ ہوتا، اس لئے کہ پیدا ہی عبادت کے لئے کیا گیا ہے۔

ایسے خریدار پر قربان جایئے

لیکن قربان جایئے ایسے خریدار پر کہ اللہ تعالیٰ نے ہماری جان و مال کو خرید بھی لیا، اور اس کی قیمت بھی پوری لگادی، یعنی جنت، پھر وہ جان و مال ہمیں واپس بھی لوٹا دیا کہ یہ جان و مال تم اپنے پاس رکھ لو۔ اور ہمیں اس بات کی اجازت دیدی کہ کھاؤ، پیو، کماؤ، اور دنیا کے کاروبار کرو۔ بس پانچ وقت کی نماز پڑھ لیا کرو۔ اور فلاں فلاں چیزوں سے پرہیز کرو۔ باقی جس طرح چاہو، کرو۔ یہ اللہ تعالیٰ کی عظیم رحمت اور عنایت ہے۔

اس ماہ میں اصل مقصد کی طرف آجاؤ

لیکن جائز کرنے کا نتیجہ کیا ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ بھی جانتے تھے کہ جب یہ انسان دنیا کے کاروبار اور کام دھندوں میں لگے گا تو رفتہ رفتہ اس کے دل پر غفلت کے پردے پڑ جایا کریں گے۔ اور دنیا کے کاروبار اور دھندوں میں کھو جائے گا۔ تو اس غفلت کو دور کرنے کے لئے وقتاً فوقتاً کچھ اوقات مقرر فرمادیئے ہیں۔ ان میں سے ایک رمضان المبارک کا مہینہ ہے۔ اس لئے کہ سال کے گیارہ مہینے تو آپ تجارت میں، زراعت میں، مزدوری میں اور دنیا کے کاروبار اور دھندوں میں، کھانے کمانے اور ہنسنے بولنے میں لگے رہے۔ اور اس کے نتیجے میں دلوں پر غفلت کا پردہ پڑنے لگتا ہے۔ اس لئے ایک

(۱) التوبہ: ۱۱۱

مہینہ اللہ تعالیٰ نے اس کام کے لئے مقرر فرمادیا کہ اس مہینے میں تم اپنے اصل مقصدِ تخلیق یعنی عبادت کی طرف لوٹ کر آؤ۔ جس کے لئے تمہیں دنیا میں بھیجا گیا، اور جس کے لئے تمہیں پیدا کیا گیا۔ اس ماہ میں اللہ کی عبادت میں لگو، اور گیارہ مہینے تک تم سے جو گناہ سرزد ہوئے ہیں، ان کو بخشواؤ، اور دل کی صلاحیتوں پر جو میل آچکا ہے، اس کو دھلواؤ، اور دل میں جو غفلت کے پردے پڑ چکے ہیں، ان کو اُٹھواؤ۔ اس کام کے لئے ہم نے یہ مہینہ مقرر کیا ہے۔

رمضان کے معنی

لفظ "رَمْضان" میم کے سکون کے ساتھ ہم غلط استعمال کرتے ہیں۔ صحیح لفظ "رَمَضان" میم کے زبر کے ساتھ ہے۔ اور ''رمضان'' کے لوگوں نے بہت سے معنی بیان کیے ہیں۔ لیکن اصل عربی زبان میں ''رمضان'' کے معنی ہیں ''جھلسا دینے والا اور جلا دینے والا'' اور اس ماہ کا یہ نام اس لئے رکھا گیا کہ سب سے پہلے جب اس ماہ کا نام رکھا جارہا تھا، اس سال یہ مہینہ شدید جھلسا دینے والی گرمی میں آیا تھا۔ اس لئے لوگوں نے اس کا نام ''رمضان'' رکھ دیا۔

اپنے گناہ معاف کرالو

لیکن علماء نے فرمایا کہ اس ماہ کو ''رمضان'' اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس مہینے میں اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے اپنے فضل وکرم سے بندوں کے گناہوں کو جھلسا دیتے ہیں، اور جلا دیتے ہیں۔ اس مقصد کے لئے اللہ تعالیٰ نے یہ مہینہ مقرر فرمایا۔ گیارہ مہینے دنیاوی کاروبار، دنیاوی دھندوں میں لگے رہنے کے نتیجے میں غفلتیں دل پر چھا گئیں، اور اس عرصہ میں جن گناہوں اور خطاؤں کا ارتکاب ہوا، ان کو اللہ تعالیٰ کے حضور حاضر ہو کر بخشوالو۔ اور غفلت کے پردوں کو دل سے اُٹھادو، تاکہ زندگی کا ایک نیا دور شروع ہو جائے۔ اسی لئے قرآن کریم نے فرمایا:

﴿يَآأَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ﴾ (۱)

یعنی یہ روزے تم پر اس لئے فرض کیے گئے ہیں تاکہ تمہارے اندر تقویٰ پیدا ہو جائے۔ تو رمضان کے مہینے کا اصل مقصد یہ ہے کہ سال بھر کے گناہوں کو بخشوانا، اور غفلت کے حجاب دل سے اُٹھانا، اور دلوں میں تقویٰ پیدا کرنا۔ جیسے کسی مشین کو جب کچھ عرصہ استعمال کیا جائے تو اس کے بعد اس کی سروس کرانی پڑتی ہے۔ اس کی صفائی کرانی ہوتی ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے انسان کی سروس

(۱) البقرة:۱۸۳

اور اوور ہالنگ کے لئے یہ رمضان المبارک کا مہینہ مقرر فرمایا ہے۔ تاکہ اس مہینے میں اپنی صفائی کراؤ، اور اپنی زندگی کو ایک نئی شکل دو۔

اس ماہ کو فارغ کرلیں

لہٰذا صرف روزہ رکھنے اور تراویح پڑھنے کی حد تک بات ختم نہیں ہوتی، بلکہ اس مہینے کا تقاضا یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو اس مہینے میں دوسرے کاموں سے فارغ کرلے۔ اس لئے کہ گیارہ مہینے تک زندگی کے دوسرے کام دھندوں میں لگے رہے۔ لیکن یہ مہینہ انسان کے لئے اس کی اصل مقصدِ تخلیق کی طرف لوٹنے کا مہینہ ہے۔ اس لئے اس مہینے کے تمام اوقات، ورنہ کم از کم اکثر اوقات یا جتنا زیادہ سے زیادہ ہوسکے، اللہ کی عبادت میں صرف کرے۔ اور اس کے لئے انسان کو پہلے سے تیار ہونا چاہئے۔ اور اس کا پہلے سے پروگرام بنانا چاہئے۔

استقبالِ رمضان کا صحیح طریقہ

آج کل عالمِ اسلام میں ایک بات چل پڑی ہے۔ جس کی ابتداء عرب ممالک خاص کر مصر اور شام سے ہوئی۔ اور پھر دوسرے ملکوں میں بھی رائج ہوگئی۔ اور ہمارے یہاں بھی آگئی ہے۔ وہ یہ ہے کہ رمضان شروع ہونے سے پہلے کچھ محفلیں منعقد ہوتی ہیں جس کا نام "محفلِ استقبالِ رمضان" رکھا جاتا ہے۔ جس میں رمضان سے ایک دو دن پہلے ایک اجتماع منعقد کیا جاتا ہے اور اس میں قرآن کریم اور تقریر اور وعظ رکھا جاتا ہے۔ جس کا مقصد لوگوں کو یہ بتلانا ہوتا ہے کہ ہم رمضان المبارک کا استقبال کررہے ہیں اور اس کو "خوش آمدید" کہہ رہے ہیں ـــــ رمضان المبارک کے استقبال کا یہ جذبہ بہت اچھا ہے، لیکن یہی اچھا جذبہ جب آگے بڑھتا ہے تو کچھ عرصہ کے بعد بدعت کی شکل اختیار کرلیتا ہے، چنانچہ بعض جگہوں پر اس استقبال کی محفل نے بدعت کی شکل اختیار کرلی ـــــ لیکن رمضان المبارک کا اصل استقبال یہ ہے کہ رمضان آنے سے پہلے اپنے نظام الاوقات بدل کر ایسا بنانے کی کوشش کرو کہ اس میں زیادہ سے زیادہ وقت اللہ جل شانہ کی عبادت میں صرف ہو، رمضان کا مہینہ آنے سے پہلے یہ سوچو کہ یہ مہینہ آرہا ہے، کس طرح میں اپنی مصروفیات کم کرسکتا ہوں۔ اس مہینے میں اگر کوئی شخص اپنے آپ کو بالکلیہ عبادت کے لئے فارغ کرلے تو سبحان اللہ، اور اگر کوئی شخص بالکلیہ اپنے آپ کو فارغ نہیں کرسکتا تو پھر یہ دیکھے کہ کون کون سے کام ایک ماہ کے لئے چھوڑ سکتا ہوں، ان کو چھوڑے۔ اور کن مصروفیات کو کم کرسکتا ہوں، ان کو کم کرے، اور جن کاموں کو رمضان کے بعد تک مؤخر کرسکتا ہے، ان کو مؤخر کرے۔ اور رمضان کے زیادہ سے زیادہ اوقات کو عبادت میں لانے کی فکر

کرے۔ میرے نزدیک استقبالِ رمضان کا صحیح طریقہ یہی ہے۔ اگر یہ کام کرلیا تو انشاء اللہ رمضان المبارک کی صحیح روح اور اس کے انوار و برکات حاصل ہوں گے ـــــ ورنہ یہ ہوگا کہ رمضان المبارک آئے گا اور چلا جائے گا۔ اور اس سے صحیح طور پر فائدہ ہم نہیں اُٹھاسکیں گے۔

روزہ اور تراویح سے ایک قدم آگے

جب رمضان المبارک کو دوسرے مشاغل سے فارغ کرلیا، تو اب اس فارغ وقت کو کس کام میں صرف کرے؟ جہاں تک روزوں کا تعلق ہے، ہر شخص جانتا ہے کہ روزہ رکھنا فرض ہے۔ اور جہاں تک تراویح کا معاملہ ہے، اس سے بھی ہر شخص واقف ہے۔ لیکن ایک پہلو کی طرف خاص طور پر متوجہ کرنا چاہتا ہوں۔

وہ یہ کہ الحمدللہ جس شخص کے دل میں ذرّہ برابر بھی ایمان ہے، اس کے دل میں رمضان المبارک کا ایک احترام اور اس کا تقدس ہوتا ہے، جس کی وجہ سے اس کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ اس ماہِ مبارک میں اللہ کی عبادت کچھ زیادہ کرے۔ اور کچھ نوافل زیادہ پڑھے۔ جو لوگ عام دنوں میں پانچ وقت کی نماز ادا کرنے کے لئے مسجد میں آنے سے کتراتے ہیں، وہ لوگ بھی تراویح جیسی لمبی نماز میں بھی روزانہ شریک ہوتے ہیں۔ یہ سب الحمدللہ اس ماہ کی برکت ہے کہ لوگ عبادت میں، نماز میں، ذکرواذکار اور تلاوتِ قرآن میں مشغول ہوتے ہیں۔

ایک مہینہ اس طرح گزار لو

لیکن ان سب نفلی نمازوں، نفلی عبادات، نفلی ذکرواذکار، اور نفلی تلاوتِ قرآن کریم سے زیادہ مقدم ایک اور چیز ہے۔ جس کی طرف توجہ نہیں دی جاتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ اس مہینے کو گناہوں سے پاک کرکے گزارنا کہ اس ماہ میں ہم سے کوئی گناہ سرزد نہ ہو۔ اس مبارک مہینے میں آنکھ نہ بہکے، نظر غلط جگہ پر نہ پڑے، کان غلط چیز نہ سنیں۔ زبان سے کوئی غلط کلمہ نہ نکلے۔ اور اللہ تبارک کی معصیت سے مکمل اجتناب ہو، یہ مبارک مہینہ اگر اس طرح گزارلیا، پھر چاہے ایک نفلی رکعت نہ پڑھی ہو، اور تلاوت زیادہ نہ کی ہو، اور نہ ذکرواذکار کیا ہو، لیکن گناہوں سے بچتے ہوئے اللہ کی معصیت اور نافرمانی سے بچتے ہوئے یہ مہینہ گزاردیا تو آپ قابلِ مبارک باد ہیں۔ اور یہ مہینہ آپ کے لئے مبارک ہے۔ گیارہ مہینے تک ہر قسم کے کام میں مبتلا رہتے ہیں۔ اور یہ اللہ تبارک کا ایک مہینہ آرہا ہے۔ کم از کم اس کو تو گناہوں سے پاک کرلو۔ اس میں تو اللہ کی نافرمانی نہ کرو۔ اس میں تو کم از کم جھوٹ نہ بولو۔ اس میں تو غیبت نہ کرو۔ اس میں تو بدنگاہی کے اندر مبتلا نہ ہو۔ اس مبارک مہینے میں تو کانوں کو غلط جگہ پر استعمال نہ کرو۔

اس میں تو رشوت نہ کھاؤ، اس میں سود نہ کھاؤ، کم از کم یہ ایک مہینہ اس طرح گزار لو۔

یہ کیسا روزہ ہوا؟

اس لئے کہ آپ روزے تو ماشاء اللہ بڑے ذوق وشوق سے رکھ رہے ہیں، لیکن روزے کے کیا معنی ہیں؟ روزے کے معنی یہ ہیں کہ کھانے سے اجتناب کرنا، پینے سے اجتناب اور نفسانی خواہشات کی تکمیل سے اجتناب کرنا، روزے میں ان تینوں چیزوں سے اجتناب ضروری ہے۔ اب یہ دیکھیں کہ یہ تینوں چیزیں ایسی ہیں جو فی نفسہ حلال ہیں، کھانا حلال، پینا حلال اور جائز طریقے سے زوجین کا نفسانی خواہشات کی تکمیل کرنا حلال، اب روزے کے دوران آپ ان حلال چیزوں سے تو پرہیز کر رہے ہیں۔ نہ کھا رہے ہیں اور نہ پی رہے ہیں۔ لیکن جو چیزیں پہلے سے حرام تھیں، مثلاً جھوٹ بولنا، غیبت کرنا، بدنگاہی کرنا، جو ہر حال میں حرام تھیں، روزے میں یہ سب چیزیں ہو رہی ہیں۔ اب روزہ رکھا ہوا ہے۔ اور جھوٹ بول رہے ہیں۔ روزہ رکھا ہوا ہے اور غیبت کر رہے ہیں۔ روزہ رکھا ہوا ہے اور بدنگاہی کر رہے ہیں۔ اور روزہ رکھا ہوا ہے لیکن وقت پاس کرنے کے لئے گندی گندی فلمیں دیکھ رہے ہیں۔ یہ کیا روزہ ہوا کہ حلال چیز تو چھوڑ دی اور حرام چیز نہیں چھوڑی۔ اس لئے حدیث شریف میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

> ''اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جو شخص روزے کی حالت میں جھوٹ بولنا نہ چھوڑے تو مجھے اس کے بھوکا اور پیاسا رہنے کی کوئی حاجت نہیں''(۱)

اس لئے جب جھوٹ بولنا نہیں چھوڑا جو پہلے سے حرام تھا تو کھانا چھوڑ کر اس نے کونسا بڑا عمل کیا۔

روزہ کا ثواب ملیا میٹ ہو گیا

اگرچہ فقہی اعتبار سے روزہ درست ہو گیا۔ اگر کسی مفتی سے پوچھو گے کہ میں نے روزہ بھی رکھا تھا، اور جھوٹ بھی بولا تھا، تو وہ مفتی یہی جواب دے گا کہ روزہ درست ہو گیا۔ اس کی قضا واجب نہیں۔ لیکن اس کی قضا واجب نہ ہونے کے باوجود اس روزے کا ثواب اور برکات ملیا میٹ ہو گئیں، اس واسطے کہ تم نے اس روزے کی روح حاصل نہیں کی۔

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب الصوم، باب من لم یدع قول الزور والعمل به فی الصوم، رقم: ۱۷۷۰، سنن الترمذی، کتاب الصوم عن رسول اللّٰه، رقم: ٦٤١، سنن أبی داؤد، کتاب الصوم، رقم: ۲۰۱۵، سنن ابن ماجه، کتاب الصیام، رقم: ۱٦۷۹، مسند أحمد، رقم: ۹٤٦۳

روزہ کا مقصد تقویٰ کی شمع روشن کرنا

میں نے آپ کے سامنے جو یہ آیت تلاوت کی:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ﴾ (۱)

اے ایمان والو! تم پر روزے فرض کیے گئے جیسے پچھلی اُمتوں پر فرض کیے گئے۔ کیوں روزے فرض کیے گئے؟ تاکہ تمہارے اندر تقویٰ پیدا ہو، یعنی روزہ اصل میں اس لئے تمہارے ذمہ مشروع کیا گیا تاکہ اس کے ذریعہ تمہارے دل میں تقویٰ کی شمع روشن ہو۔ روزے سے تقویٰ کس طرح پیدا ہوتا ہے؟

روزہ تقویٰ کی سیڑھی ہے

بعض علماء کرام نے فرمایا کہ روزے سے تقویٰ اس طرح پیدا ہوتا ہے کہ روزہ انسان کی قوتِ حیوانیہ اور قوتِ بہیمیہ کو توڑتا ہے۔ جب آدمی بھوکا رہے گا تو اس کی وجہ سے اس کی حیوانی خواہشات اور حیوانی تقاضے کچلے جائیں گے۔ جس کے نتیجے میں گناہ پر اقدام کرنے کا داعیہ اور جذبہ سست پڑ جائے گا۔

لیکن ہمارے حضرت مولانا شاہ اشرف علی صاحب تھانوی قدس اللہ سرہ ـــــ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے۔ آمین ـــــ نے فرمایا کہ صرف قوتِ بہیمیہ توڑنے کی بات نہیں ہے، بلکہ بات دراصل یہ ہے کہ جب آدمی صحیح طریقے سے روزہ رکھے گا تو یہ روزہ خود تقویٰ کی ایک عظیم الشان سیڑھی ہے۔ اس لئے کہ تقویٰ کے کیا معنی ہیں؟ تقویٰ کے معنی یہ ہیں کہ اللہ جل جلالہ کی عظمت کے استحضار کی بنا پر گناہوں سے بچنا، یعنی یہ سوچ کر کہ میں اللہ تعالیٰ کا بندہ ہوں، اور اللہ تعالیٰ مجھے دیکھ رہے ہیں، اللہ تعالیٰ کے سامنے حاضر ہو کر مجھے جواب دینا ہے، اور اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہونا ہے، اس تصور کے بعد جب انسان گناہوں کو چھوڑتا ہے تو اسی کا نام تقویٰ ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَأَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوَى﴾ (۲)

یعنی جو شخص اس بات سے ڈرتا ہے کہ مجھے اللہ تعالیٰ کے دربار میں حاضر ہونا ہے، اور کھڑا ہونا ہے، اور اس کے نتیجے میں وہ اپنے آپ کو ہوائے نفس اور خواہشات سے روکتا ہے، یہی تقویٰ ہے۔

---

(۱) البقرة: ۱۸۳ (۲) النازعات: ۴۰

میرا مالک مجھے دیکھ رہا ہے

لہٰذا ''روزہ'' حصولِ تقویٰ کے لئے بہترین ٹریننگ اور بہترین تربیت ہے، جب روزہ رکھ لیا تو آدمی پھر کیسا ہی گنہگار، خطا کار اور فاسق و فاجر ہو، جیسا بھی ہو، لیکن روزہ رکھنے کے بعد اس کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ سخت گرمی کا دن ہے، اور سخت پیاس لگی ہوئی ہے، اور کمرہ میں اکیلا ہے، کوئی دوسرا پاس موجود نہیں، اور دروازے پر کنڈی لگی ہوئی ہے، اور کمرہ میں فریج موجود ہے، اور اس فریج میں ٹھنڈا پانی موجود ہے۔ اس وقت انسان کا نفس یہ تقاضا کرتا ہے کہ اس شدید گرمی کے عالم میں ٹھنڈا پانی پی لوں، لیکن کیا وہ شخص فریج سے ٹھنڈا پانی نکال کر پی لے گا؟ ہرگز نہیں پیئے گا۔ حالانکہ اگر وہ پانی پی لے تو کسی بھی انسان کو کانوں کان خبر نہ ہوگی۔ کوئی لعنت اور ملامت کرنے والا نہیں ہوگا۔ اور دنیا والوں کے سامنے وہ روزہ دار ہی رہے گا، اور شام کو باہر نکل کر آرام سے لوگوں کے ساتھ افطاری کھالے تو کسی شخص کو بھی پتہ نہیں چلے گا کہ اس نے روزہ توڑ دیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ پانی نہیں پیتا ہے، کیوں نہیں پیتا؟ پانی نہ پینے کی اس کے علاوہ کوئی اور وجہ نہیں ہے کہ وہ یہ سوچتا ہے کہ اگرچہ کوئی مجھے نہیں دیکھ رہا ہے، لیکن میرا مالک جس کے لئے میں نے روزہ رکھا ہے، وہ مجھے دیکھ رہا ہے۔

میں ہی اس کا بدلہ دوں گا

اسی لئے اللہ جل شانہ فرماتے ہیں:

((اَلصَّوْمُ لِیْ وَاَنَا اُجْزِی بِہٖ))(۱)

''روزہ میرے لئے ہے۔ لہٰذا میں ہی اس کی جزا دوں گا''

اور اعمال کے بارے میں تو یہ فرمایا کہ کسی عمل کا دس گنا اجر، کسی عمل کا ستر گنا اجر، اور کسی عمل کا سو گنا اجر ہے۔ حتیٰ کہ صدقہ کا اجر سات سو گنا ہے، لیکن روزے کے بارے میں فرمایا کہ روزے کا اجر میں دوں گا۔ کیونکہ روزہ اس نے صرف میرے لئے رکھا تھا۔ اس لئے کہ شدید گرمی کی وجہ سے جب حلق میں کانٹے لگ رہے ہیں۔ اور زبان پیاس سے خشک ہے۔ اور فریج میں ٹھنڈا پانی موجود ہے۔ اور تنہائی ہے۔ اور کوئی دیکھنے والا بھی نہیں ہے۔ اس کے باوجود میرا بندہ صرف اس لئے پانی نہیں پی رہا

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب التوحید، باب قول اللّٰہ تعالی یریدون أن یبدلوا کلام اللّٰہ، رقم: ۶۹۳۸، صحیح مسلم، کتاب الصیام، باب فضل الصیام، رقم: ۱۹۴۶، سنن الترمذی، کتاب الصیام عن رسول الله، باب ما جاء فی فضل الصوم، رقم: ۶۹۵، سنن النسائی، کتاب الصیام، باب فضل الصیام، رقم: ۲۱۸۱، مسند أحمد، رقم: ۴۰۳۶

ہے کہ اس کے دل میں میرے سامنے کھڑا ہونے اور جواب دہی کا ڈر اور احساس ہے۔ اس احساس کا نام تقویٰ ہے۔ اگر یہ احساس پیدا ہوگیا تو تقویٰ بھی پیدا ہوگیا۔ لہٰذا تقویٰ روزے کی ایک شکل بھی ہے۔ اور اس کے حصول کی ایک سیڑھی بھی ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نے روزے اس لئے فرض کیے تاکہ تقویٰ کی عملی تربیت دیں۔

ورنہ یہ تربیتی کورس مکمل نہیں ہوگا

اور جب تم روزے کے ذریعہ یہ عملی تربیت حاصل کر رہے ہو، تو پھر اس کو اور ترقی دو، اور آگے بڑھاؤ، لہٰذا جس طرح روزے کی حالت میں شدتِ پیاس کے باوجود پانی پینے سے رک گئے تھے، اور اللہ کے خوف سے کھانا کھانے سے رک گئے تھے، اسی طرح جب کاروبارِ زندگی میں نکلو، اور وہاں پر اللہ کی معصیت اور نافرمانی کا تقاضا اور داعیہ پیدا ہو تو یہاں بھی اللہ کے خوف سے اس معصیت سے رک جاؤ، لہٰذا ایک مہینے کے لئے ہم تمہیں ایک تربیتی کورس سے گزار رہے ہیں۔ اور یہ تربیتی کورس اس وقت مکمل ہوگا جب کاروبارِ زندگی میں ہر موقع پر اس پر عمل کرو، ورنہ اس طرح یہ تربیتی کورس مکمل نہیں ہوگا کہ اللہ کے خوف سے پانی پینے سے تو رک گئے، اور جب کاروبارِ زندگی میں نکلے تو پھر آنکھ غلط جگہ پر پڑ رہی ہے۔ کان بھی غلط باتیں سن رہے ہیں۔ زبان سے بھی غلط باتیں نکل رہی ہیں۔ اس طرح تو یہ کورس مکمل نہیں ہوگا۔

روزہ کا ایئر کنڈیشنر لگا دیا، لیکن!

جس طرح علاج ضروری ہے، اسی طرح پرہیز بھی ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ نے روزہ اس لئے رکھوایا تاکہ تمہارے اندر تقویٰ پیدا ہو، لیکن تقویٰ اس وقت پیدا ہوگا جب اللہ کی نافرمانیوں اور معصیتوں سے پرہیز کرو گے۔ مثلاً کمرہ کو ٹھنڈا کرنے کے لئے آپ نے اس میں ایئر کنڈیشنر لگایا، اور ایئر کنڈیشنر کا تقاضا یہ ہے کہ وہ پورے کمرے کو ٹھنڈا کر دے، اب آپ نے اس کو آن کر دیا۔ لیکن ساتھ ہی اس کمرے کی کھڑکیاں اور دروازے کھول دیئے۔ اِدھر سے ٹھنڈک آرہی ہے، اور اُدھر سے نکل رہی ہے۔ لہٰذا کمرہ ٹھنڈا نہیں ہوگا۔ بالکل اسی طرح یہ سوچئے کہ روزہ کا ایئر کنڈیشنر تو آپ نے لگا دیا، لیکن ساتھ ہی دوسری طرف اللہ کی نافرمانی اور معاصی کے دروازے اور کھڑکیاں کھول دیں۔ اب بتایئے ایسے روزے سے کوئی فائدہ حاصل ہوگا؟

اصل مقصد ”حکم کی اتباع“

اسی طرح روزے کے اندر یہ حکمت کہ اس کا مقصد قوتِ بہیمیہ توڑنا ہے، یہ بعد کی حکمت ہے۔ اصل مقصد یہ ہے کہ ان کے حکم کی اتباع ہو۔ اور سارے دین کا مدار اللہ اور اللہ کے رسول کے حکم کی اتباع ہے۔ وہ جب کہیں کہ کھاؤ، اس وقت کھانا دین ہے۔ اور جب وہ کہیں کہ مت کھاؤ، اس وقت نہ کھانا دین ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی اطاعت اور اپنی اتباع کا عجیب نظام بنایا ہے کہ سارا دن تو روزہ رکھنے کا حکم دیا، اور اس پر بڑا اجر وثواب رکھا، لیکن ادھر آفتاب غروب ہوا، ادھر یہ حکم آ گیا کہ اب جلدی افطار کرو، اور افطار میں جلدی کرنے کو مستحب قرار دیا۔ اور بلاوجہ افطار میں تاخیر کرنا مکروہ اور ناپسندیدہ ہے۔ کیوں ناپسندیدہ ہے؟ اس لئے کہ جب آفتاب غروب ہوگیا تو اب ہمارا یہ حکم آ گیا کہ اب بھی اگر نہیں کھاؤ گے، اور بھوکے رہو گے تو یہ بھوک کی حالت ہمیں پسند نہیں۔ اس لئے کہ اصل کام ہماری اتباع کرنا ہے۔ اپنا شوق پورا نہیں کرنا ہے۔

عام حالات میں دنیا کی کسی چیز کی حرص اور ہوس بہت بری چیز ہے۔ لیکن جب وہ کہیں کہ حرص کرو، تو پھر حرص ہی میں لطف اور مزہ ہے۔ کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے کہ ؎

چوں طمع خواہد ز من سلطان دیں
خاک بہ فرق قناعت بعد ازیں

جب سلطانِ دین یہ چاہ رہے ہیں کہ میں حرص اور طمع کروں تو پھر قناعت کے سر پر خاک، پھر قناعت میں مزہ نہیں ہے۔ پھر تو طمع اور حرص میں مزہ ہے، یہ افطار میں جلدی کرنے کا حکم اسی وجہ سے ہے۔ غروبِ آفتاب سے پہلے تو یہ حکم تھا ایک ذرہ بھی اگر منہ میں چلا گیا تو گناہ بھی لازم اور کفارہ بھی لازم، مثلاً سات بجے آفتاب غروب ہو رہا تھا۔ اب اگر کسی شخص نے چھ بج کر انسٹھ منٹ پر ایک چنے کا دانہ کھالیا۔ اب بتایئے کہ روزہ میں کتنی کمی آئی؟ صرف ایک منٹ کی کمی آئی، ایک منٹ کا روزہ توڑا، لیکن اس ایک منٹ کے روزے کے کفارے میں ساٹھ دن کے روزے رکھنے واجب ہیں، اس لئے کہ بات صرف ایک چنے اور ایک منٹ کی نہیں ہے، بات دراصل یہ ہے کہ اس نے ہمارا حکم توڑا، ہمارا حکم یہ تھا کہ جب تک آفتاب غروب نہ ہو جائے اس وقت تک کھانا جائز نہیں، لیکن تم نے یہ حکم توڑ دیا، لہٰذا اب ایک منٹ کے بدلے میں ساٹھ دن کے [illegible]ے رکھو۔

افطار میں جلدی کرو

اور پھر جیسے ہی آفتاب غروب ہوگیا تو یہ حکم آ گیا کہ اب جلدی کھاؤ، اگر بلاوجہ تاخیر کر دی تو

گناہ ہوگا، کیوں؟ اس واسطے کہ ہم نے حکم دیا تھا کہ کھاؤ، اب کھانا ضروری ہے۔

سحری میں تاخیر افضل ہے

سحری کے بارے میں حکم یہ ہے کہ سحری تاخیر سے کھانا افضل ہے۔ جلدی کھانا خلافِ سنت ہے، بعض لوگ رات کو بارہ بجے سحری کھا کر سو جاتے ہیں، یہ خلافِ سنت ہے، چنانچہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا بھی یہی معمول تھا کہ بالکل آخری وقت تک کھاتے تھے۔ اس واسطے کہ یہ وہ وقت ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہ صرف یہ کہ کھانے کی اجازت ہے بلکہ کھانے کا حکم ہے، اس لئے جب تک وہ وقت باقی رہے گا، ہم کھاتے رہیں گے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی اتباع اور اطاعت اسی میں ہے، اب اگر کوئی شخص پہلے سحری کھالے تو گویا کہ اس نے روزے کے وقت میں اپنی طرف سے اضافہ کر دیا، اس لئے پہلے سے سحری کھانے کو ممنوع قرار دیا۔ پورے دین میں سارا کھیل اتباع کا ہے، جب ہم نے کہا کہ کھاؤ تو کھانا ثواب ہے، اور جب ہم نے کہا کہ مت کھاؤ تو نہ کھانا ثواب ہے۔ اس لئے حضرت حکیم الامت قدس اللہ سرہ فرمایا کرتے تھے کہ جب اللہ میاں کہہ رہے ہیں کہ کھاؤ، اور بندہ کہے کہ میں تو نہیں کھاتا، یا میں کم کھاتا ہوں، یہ تو بندگی اور اطاعت نہ ہوئی۔ ارے بھائی! نہ تو کھانے میں کچھ رکھا ہے اور نہ ہی نہ کھانے میں کچھ رکھا ہے۔ سب کچھ ان کی اطاعت میں ہے، اس لئے جب انہوں نے کہہ دیا کہ کھاؤ، تو پھر کھاؤ، اس میں اپنی طرف سے زیادہ پابندی کرنے کی ضرورت نہیں۔

ایک مہینہ بغیر گناہ کے گزار لو

البتہ اہتمام کرنے کی چیز یہ ہے کہ جب روزہ رکھ لیا تو اب اپنے آپ کو گناہوں سے بچاؤ۔ آنکھوں کو بچاؤ، کانوں کو بچاؤ، زبانوں کو بچاؤ۔ ایک رمضان کے موقع پر ہمارے حضرت قدس اللہ سرہ نے یہاں تک فرمایا کہ میں ایک ایسی بات کہتا ہوں جو کوئی اور نہیں کہے گا۔ وہ یہ کہ اپنے نفس کو اس طرح بہلاؤ، اور اس سے عہد کر لو کہ ایک مہینہ بغیر گناہ کے گزار لو۔ جب یہ ایک مہینہ گزر جائے تو پھر تیرا جو جی چاہے کرنا۔ چنانچہ حضرت والا فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے اُمید ہے کہ جب یہ ایک مہینہ بغیر گناہ کے گزر جائے گا، تو پھر اللہ تعالیٰ خود اس کے دل میں گناہ چھوڑنے کا داعیہ پیدا فرما دیں گے۔ لیکن یہ عہد کر لو کہ یہ اللہ کا مہینہ آرہا ہے۔ یہ عبادت کا مہینہ ہے۔ یہ تقویٰ پیدا کرنے کا مہینہ ہے۔ ہم اس میں گناہ نہیں کریں گے۔ اور ہر شخص اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھے کہ وہ کن گناہوں میں مبتلا ہے۔ پھر ان سب کے بارے میں یہ عہد کر لے کہ میں ان میں مبتلا نہیں ہوں گا۔ مثلاً یہ عہد کر لے کہ رمضان المبارک میں آنکھ غلط جگہ پر نہیں اُٹھے گی۔ کان غلط بات نہیں سنیں گے۔ زبان سے غلط

بات نہیں نکلے گی۔ یہ تو کوئی بات نہ ہوئی کہ روزہ بھی رکھا ہوا ہے اور فواحشات کو بھی آنکھ سے دیکھ رہے ہیں، اور اس سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔

اس ماہ میں رزقِ حلال

دوسری اہم بات جو ہمارے حضرت رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ کم از کم اس ایک مہینے میں تو رزقِ حلال کا اہتمام کرلو، جو لقمہ آئے، وہ حلال کا آئے، کہیں ایسا نہ ہو کہ روزہ تو اللہ کے لئے رکھا، اور اس کو حرام چیز سے افطار کر رہے ہیں۔ سود پر افطار ہو رہا ہے۔ یا رشوت پر افطار ہو رہا ہے۔ یا حرام آمدنی پر افطار ہو رہا ہے۔ یہ کیسا روزہ ہوا کہ سحری بھی حرام اور افطاری بھی حرام، اور درمیان میں روزہ۔ اس لئے خاص طور پر اس مہینے میں حرام روزی سے بچو۔ اور اللہ تبارک وتعالیٰ سے مانگو کہ یا اللہ! میں رزقِ حلال کھانا چاہتا ہوں۔ مجھے رزقِ حرام سے بچا لیجئے۔

حرام آمدنی سے بچیں

بعض حضرات وہ ہیں جن کا بنیادی ذریعۂ معاش۔ الحمد للہ۔ حرام نہیں ہے، بلکہ حلال ہے، البتہ اہتمام نہ ہونے کی وجہ سے کچھ حرام آمدنی کی آمیزش ہو جاتی ہے۔ ایسے حضرات کے لئے حرام سے بچنا کوئی دشوار کام نہیں ہے، وہ کم از کم اس ماہ میں تھوڑا سا اہتمام کرلیں، اور حرام آمدنی سے بچیں۔

یہ عجیب قصہ ہے کہ اس ماہ کے لئے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا کہ یہ صبر کا مہینہ ہے۔ یہ مواسات اور غم خواری کا مہینہ ہے۔ ایک دوسرے سے ہمدردی کا مہینہ ہے۔ لیکن اس ماہ میں مواسات کے بجائے لوگ اُلٹا کھال کھینچنے کی فکر کرتے ہیں۔ اِدھر رمضان المبارک کا مہینہ آیا، اور اُدھر چیزوں کی ذخیرہ اندوزی شروع کر دی۔ لہٰذا کم از کم اس ماہ میں اپنے آپ کو ایسے حرام کاموں سے ضرور بچا لیں۔

اگر آمدنی مکمل حرام ہے تو پھر؟

بعض حضرات وہ ہیں جن کا ذریعہ آمدنی مکمل طور پر حرام ہے، مثلاً وہ کسی سودی ادارے میں ملازم ہیں، ایسے حضرات اس ماہ میں کیا کریں؟ ہمارے حضرت ڈاکٹر عبد الحی صاحب قدس اللہ سرہ۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے۔ آمین۔ ہر آدمی کے لئے راستہ بتا گئے۔ وہ فرماتے ہیں کہ میں ایسے آدمی کو جس کی مکمل آمدنی حرام ہے، یہ مشورہ دیتا ہوں کہ اگر ہو سکے تو رمضان میں چھٹی لے لے، اور کم از کم اس ماہ کے خرچ کے لئے جائز اور حلال ذریعہ سے انتظام کرلے۔ کوئی جائز آمدنی کا ذریعہ اختیار کرلے۔ اور اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو اس ماہ کے خرچ کے لئے کسی سے قرض لے لے۔ اور

یہ سوچ کہ میں اس مہینہ میں حلال آمدنی سے کھاؤں گا۔ اور اپنے بچوں کو بھی حلال کھلاؤں گا، کم از کم اتنا تو کر لے۔

گناہوں سے بچنا آسان ہے

بہر حال! میں یہ کہنا چاہ رہا تھا کہ لوگ اس مہینے میں نوافل وغیرہ کا تو اہتمام بہت کرتے ہیں، لیکن گناہوں سے بچنے کا اتنا اہتمام نہیں کرتے۔ حالانکہ اس ماہ میں شیطان کو بیڑیاں پہنا دی جاتی ہیں۔ اور ان کو قید کر دیا جاتا ہے۔ لہٰذا شیطان کی طرف سے گناہ کرنے کے وسوسے اور تقاضے ختم ہو جاتے ہیں۔ اس لئے گناہوں سے بچنا آسان ہو جاتا ہے۔

روزے میں غصے سے پرہیز

تیسری بات جس کا روزے سے خاص تعلق ہے، وہ ہے غصے سے اجتناب اور پرہیز، چنانچہ حدیث شریف میں ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ یہ مواسات کا مہینہ ہے۔ ایک دوسرے سے غمخواری کا مہینہ ہے۔ لہٰذا غصہ اور غصہ کی وجہ سے سرزد ہونے والے جرائم اور گناہ، مثلاً جھگڑا، مار پٹائی اور تو تکار، ان چیزوں سے پرہیز کا اہتمام کریں۔ حدیث شریف میں حضور اقدس ﷺ نے یہاں تک فرمادیا:

((وإِنْ جَهِلَ عَلٰى اَحَدِكُمْ جَاهِلٌ وَهُوَ صَائِمٌ، فَلْيَقُلْ اِنِّیْ صَائِمٌ))[1]

"اگر کوئی شخص تم سے جہالت اور لڑائی کی بات کرے تو تم کہہ دو کہ میرا روزہ ہے"

میں لڑنے کے لئے تیار نہیں۔ نہ زبان سے لڑنے کے لئے تیار ہوں، اور نہ ہاتھ سے۔ اس سے پرہیز کریں۔ یہ سب بنیادی کام ہیں۔

رمضان میں نفلی عبادات زیادہ کریں

جہاں تک عبادات کا تعلق ہے، تمام مسلمان ماشاء اللہ جانتے ہی ہیں کہ روزہ رکھنا، تراویح پڑھنا ضروری ہے، اور تلاوتِ قرآن کو چونکہ اس مہینے سے خاص مناسبت ہے، چنانچہ حضور نبی کریم ﷺ رمضان کے مہینے میں حضرت جبرائیل علیہ السلام کے ساتھ پورے قرآن کریم کا دور فرمایا کرتے تھے۔ اس

(۱) سنن الترمذی، کتاب الصوم عن رسول اللّٰہ، باب ما جاء فی فضل الصوم، رقم: ٦٩٥، سنن ابن ماجه، کتاب الصیام، باب ما جاء فی الغیبة والرفث الصائم، رقم: ١٦٨١، مسند أحمد، مسند أبی هريرة، رقم: ٧٥٠٤

لئے جتنا زیادہ سے زیادہ ہو سکے، اس مہینے میں تلاوت کریں۔ اور اس کے علاوہ چلتے، پھرتے، اُٹھتے، بیٹھتے زبان پر اللہ کا ذکر کریں۔ اور تیسرا کلمہ سُبْحَانَ اللّٰہِ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ وَلَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاللّٰہُ اَکْبَرُ، اور درود شریف اور استغفار کا چلتے پھرتے اس کی کثرت کا اہتمام کریں۔ اور نوافل کی جتنی کثرت ہو سکے، کریں۔ اور عام دنوں میں رات کو اُٹھ کر تہجد کی نماز پڑھنے کا موقع نہیں ملتا، لیکن رمضان المبارک میں چونکہ انسان سحری کے لئے اُٹھتا ہے، تھوڑا پہلے اُٹھ جائے، اور سحری سے پہلے تہجد پڑھنے کا معمول بنالے۔ اور اس ماہ میں نماز خشوع کے ساتھ اور مرد باجماعت نماز پڑھنے کا اہتمام کرلیں۔

یہ سب کام تو اس ماہ میں کرنے ہی چاہئیں۔ یہ رمضان المبارک کی خصوصیات میں سے ہیں۔ لیکن ان سب چیزوں سے زیادہ اہم گناہوں سے بچنے کی فکر ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے، اور رمضان المبارک کے انوار و برکات سے صحیح طور پر مستفید ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ.

حج کی اہمیت ☆

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ
نَحْمَدُهٗ وَنُصَلِّيْ عَلٰى رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ

آج عرفہ کا دن ہے، یہ دن ایک مسلمان کی زندگی میں بڑی اہمیت کا حامل ہے، عرفہ کے دن ہزار ہا مسلمانوں کی ایک ایسی عبادت تکمیل پاتی ہے جو نہ صرف یہ کہ بذاتِ خود ایک اعلیٰ عبادت ہے بلکہ بہت سی عبادتوں کا مجموعہ اور بہت سی پاکیزہ صفات کا سرچشمہ ہے، آج کے دن لاکھوں فرزندانِ توحید محض خدا کو یاد کرنے کے لئے ایک ایسے میدان میں جمع ہوتے ہیں جس پر خدا کی رحمتوں کے سوا کسی چیز کا سایہ نہیں ہے۔ اس حدِ نظر تک پھیلے ہوئے خشک ریگستان میں کالے اور گورے، عربی اور عجمی، امیر اور غریب اور حاکم اور محکوم کے درمیان ہر امتیاز مٹ جاتا ہے۔ یہاں ایک جاہ و جلال والا بادشاہ بھی اپنے مالک کے حضور جیسے ایک بے کس اور بے سہارا مزدور۔

یہاں سینکڑوں ملکوں سے آئے ہوئے لاکھوں انسان ایک ہی لباس میں ملبوس نظر آتے ہیں۔ یہ سب ایک ہی خدا کو پکارتے ہیں اور ان سب کی زبان پر ایک ہی روح پرور نعرہ ہوتا ہے:

"لَبَّيْكَ اَللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ لَبَّيْكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ لَبَّيْكَ"

حج کی یہ دلآویز عبادت جو سرزمینِ حجاز کی مقدس وادیوں میں ادا کی جاتی ہے تمام عبادتوں میں ایک منفرد اور نرالی شان رکھتی ہے۔ اس عبادت نے عشق کے اس جذبے کو ایک صحیح رُخ مہیا کیا ہے جو انسان کی فطرت میں داخل ہے، اور جس کی وجہ سے وہ کبھی کبھی "پاسبانِ عقل" کو خیر باد کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

یہ عبادت ہمیں یہ سکھلاتی ہے کہ عشق و محبت کی صحیح حقدار صرف وہ ذات ہے جس نے تمہیں اور اس کائنات کی ہر چیز کو پیدا کیا ہے، اگر پوجنا ہے تو اسی کو پوجو، چاہنا ہے تو اسی کو چاہو، پکارنا ہے تو اسی کو پکارو، مانگنا ہے تو اسی سے مانگو، کسی کے کوچے میں چکر کاٹنے کو جی چاہتا ہے تو اسی کے گھر کا طواف کرو، اور کسی کی یاد میں سرگرداں پھرنا چاہتے ہو تو اسی کی یاد میں سرگرداں پھرو۔

قرآن کریم نے بہت سے مواقع پر حج کی اہمیت اور فضیلت کو واضح الفاظ میں بیان فرمایا ہے،

☆ نشری تقریریں، ص:۵۱ - ۵۸، فرد کی اصلاح، ص:۷۱

سورۂ آل عمران میں ارشاد ہے:

﴿وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيْلًا﴾ (۱)

''اور لوگوں پر اللہ کا حق ہے کہ جو شخص اس کے گھر تک آنے کی قدرت رکھتا ہو وہ حج کے لئے آئے''

اسلام نے اس عبادت کی کس قدر تاکید کی ہے اس کا اندازہ رسولِ کریم ﷺ کے اس ارشاد سے ہوگا، آپ ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ لَمْ يَمْنَعْهُ عَنِ الْحَجِّ حَاجَةٌ ظَاهِرَةٌ أَوْ سُلْطَانٌ جَائِرٌ أَوْ مَرَضٌ حَابِسٌ فَمَاتَ وَلَمْ يَحُجَّ فَلْيَمُتْ إِنْ شَآءَ يَهُوْدِيًّا وَإِنْ شَآءَ نَصْرَانِيًّا)) (۲)

''جس شخص کو نہ کسی کھلی ضرورت نے حج سے روکا ہو، نہ کسی ظالم سلطان نے، اور نہ کسی روکنے والے مرض نے، اور اس کے باوجود وہ حج کیے بغیر مر جائے تو اسے اختیار ہے خواہ یہودی بن کر مرے یا نصرانی بن کر''

دوسری طرف اس عبادت کی طرف ترغیب دیتے ہوئے بخاری اور مسلم کی ایک حدیث میں ارشاد ہے:

((اَلْحَجُّ الْمَبْرُوْرُ لَيْسَ لَهُ جَزَاءٌ إِلَّا الْجَنَّةُ)) (۳)

''جو حج اللہ کی بارگاہ میں قبول ہو جائے اس کا صلہ جنت کے سوا کچھ نہیں''

صحیح مسلم کی ایک اور حدیث میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا آنحضرت ﷺ سے روایت کرتی ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

((مَا مِنْ يَوْمٍ أَكْثَرَ مِنْ أَنْ يُعْتِقَ اللّٰهُ فِيْهِ عَبْدًا مِنَ النَّارِ مِنْ يَوْمِ عَرَفَةَ)) (٤)

---

(۱) آل عمران: ۹۷

(۲) سنن الدارمی، کتاب المناسك، باب من مات ولم یحج، رقم: ۱۷۱۹

(۳) صحیح البخاری، کتاب الحج، باب وجوب العمرة وفضلها، رقم: ۱٦۵۰، صحیح مسلم، کتاب الحج، باب فی فضل الحج والعمرة ویوم عرفة، رقم: ۲٤۰۳، سنن الترمذی، کتاب الحج عن رسول الله، باب ما ذکر فی فضل العمرة، رقم: ۸۵۵، سنن النسائی، کتاب مناسك الحج، باب فضل العمرة، رقم: ۲۵۸۲، سنن ابن ماجه، کتاب المناسك، باب فضل الحج والعمرة، رقم: ۲۸۷۹

(٤) صحیح مسلم، کتاب الحج، باب فی فضل الحج والعمرة ویوم عرفة، رقم: ۲٤۰۲، سنن النسائی، کتاب مناسك الحج، باب ما ذکر فی یوم عرفة، رقم: ۲۹۵۳، سنن ابن ماجه، کتاب المناسك، باب الدعاء بعرفة، رقم: ۳۰۰۵

''اللہ تعالیٰ جتنے بندوں کو عرفہ کے دن آگ کے عذاب سے آزاد کرتا ہے اتنا کسی اور دن نہیں کرتا''

سوال یہ ہے کہ اس عاشقانہ عبادت کو اسلام میں اتنی اہمیت کیوں دی گئی ہے؟ قرآن کریم نے صرف ایک مختصر جملے میں حج کی حکمتوں کو سمیٹ دیا ہے، ارشاد ہے:

﴿لِيَشْهَدُوا مَنَافِعَ لَهُمْ﴾ (۱)

(یعنی حج کی حکمت یہ ہے) کہ لوگ یہاں آکر کھلی آنکھوں دیکھیں کہ اس حج میں ان کے لئے کیسے کیسے فائدے ہیں۔

اور حقیقت بھی یہی ہے کہ حج کے فوائد اور حکمتوں کا تھوڑا بہت اندازہ اسی خوش نصیب کو ہوتا ہے جسے اللہ نے اس عظیم سعادت کی توفیق بخشی ہو، وہاں پہنچ کر بلاشبہ وہ کھلی آنکھوں ان فوائد کا مشاہدہ کرتا ہے جنہیں دیکھنا تصور کی نگاہ کے لئے ممکن ہی نہیں ہے۔

تاہم آیئے! اس عبادت کے اعمال وافعال پر ایک سرسری نظر ڈال کر ان بعض حکمتوں کا ایک معمولی سا اندازہ کرنے کی کوشش کریں جو ہمارے تصور کے دائرے میں آسکتی ہیں۔

حج کی عبادت میں سب سے پہلی بات جو نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ اس سے انسان کو بے شمار پاکیزہ صفات سے آراستہ ہونے اور اپنی پوشیدہ صلاحیتوں کو نکھارنے کا خوب موقع ملتا ہے، ذرا تصور کیجئے کہ جو شخص حجِ بیت اللہ کا عزم کرکے اپنے گھر سے نکل رہا ہے، اسے کس چیز نے اس سفر پر آمادہ کیا ہے؟ اس کے سر میں کونسا سودا سمایا ہوا ہے جو اسے مجبور کررہا ہے کہ وہ اپنا گھر بار چھوڑے، مال ودولت، اپنے عزیزوں اور دوستوں کو خیر باد کہے، اپنے وطن کی راحت وآرام کو قربان کرے، اور سینکڑوں میل کا کٹھن راستہ طے کرکے ان صحراؤں کی خاک چھانے جن میں ظاہری اعتبار سے کوئی دلکشی نہیں؟

آپ غور کریں گے تو معلوم ہوگا کہ ایک عازم حج کو اس سفر پر اُبھارنے والی چیز خدا کی محبت کے سوا کچھ نہیں، حقیقت یہ ہے کہ اس سفر پر کوئی شخص اس وقت تک آمادہ ہو ہی نہیں سکتا جب تک اس کے دل میں خدا کی محبت نہ ہو، اس کے رسول ﷺ کا عشق نہ ہو، آخرت کی فکر نہ ہو، اور اپنے فرض کو فرض سمجھنے کا خیال نہ ہو۔

جب یہ شخص اس نیک ارادے کے ساتھ اپنے گھر سے قدم نکالتا ہے تو اس کے دل کی دنیا بالکل بدل جاتی ہے، اب وہ خدا کے راستے کا راہی ہے جسے ہر قدم پر یہ خیال رہتا ہے کہ اس کی کوئی حرکت اس مالک کی مرضی کے خلاف نہ ہو جس کا مہمان بن کر وہ جارہا ہے، یہ تصور اس کے دل میں نیکی کی اُمنگ، بھلائی کی لگن اور بدی کی نفرت پیدا کرتا ہے، اسے ہر آن اپنے مالک کا یہ ارشاد آنکھوں

(۱) الحج: ۲۷

کے سامنے نظر آتا ہے کہ:

﴿فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ فِی الْحَجِّ﴾ (۱)

''حج (کے سفر) میں کسی فحش بات کی گنجائش نہیں، کسی گناہ کی گنجائش نہیں اور کسی جھگڑے کی گنجائش نہیں''

راستے میں اسے اپنے جیسے بہت سے ہم سفر ملتے ہیں۔ جب وہ یہ تصور کرتا ہے کہ یہ لوگ بھی اسی لگن کو لے کر جارہے ہیں جو میرے دل میں موجزن ہے، تو اسے ان لوگوں میں اپنائیت محسوس ہوتی ہے، وہ ان سے محبت کرتا ہے، ان کی طرف سے کوئی ناگوار بات پیش آتی ہے تو حتی الامکان اس پر صبر کرنے کی کوشش کرتا ہے، اور یہ چیز اس کے دل میں دوسروں کے لئے ایثار، اخوت اور عفو درگزر کے قیمتی جذبات پیدا کرتی ہے۔

پھر سفر کے دوران ایک مرحلہ ایسا آجاتا ہے جہاں سے احرام کے بغیر گزرنا جائز نہیں، یہاں پہنچ کر حج کا یہ مسافر اپنی ظاہری زیب و زینت اور لباس کی تمام سج دھج بھی قربان کر ڈالتا ہے، اسے خوشبو لگانے کی اجازت نہیں، وہ سلے ہوئے کپڑے نہیں پہن سکتا، اس کے لئے اپنے سر اور منہ کو ڈھکنا بھی ناجائز ہے، وہ کسی جانور کا شکار نہیں کرسکتا، اور نہ اسے زن و شو کے تعلقات قائم کرنے کا اختیار ہے، وہ صرف دو سادہ چادروں میں ملبوس ہے جو اس بات کا اعلان کررہی ہیں کہ اب تک وہ خواہ کچھ رہا ہو اب وہ تمام رشتے ناطے توڑ کر صرف خدا کے در کا ایک بھکاری ہے جس کی زبان پر ایک ہی آواز ہے:

لَبَّیْکَ اَللّٰھُمَّ لَبَّیْکَ لَبَّیْکَ لَا شَرِیْکَ لَکَ لَبَّیْکَ اِنَّ الْحَمْدَ وَالنِّعْمَةَ لَکَ وَالْمُلْکَ، لَا شَرِیْکَ لَکَ (۲)

یہ آواز درحقیقت اس پکار کا جواب ہے جو آج سے پانچ ہزار سال پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے لگائی تھی، اللہ کے اس منادی نے اس وقت پکار کر کہا تھا کہ اللہ کے بندو! اللہ کے گھر کی طرف آؤ، زمین کے ہر گوشے سے آؤ۔ اس پکار کے جواب میں دیارِ حبیب کا ہر مسافر بلند آواز سے لبیک کہتا ہے، یعنی میں حاضر ہوں، بارالٰہا، میں حاضر ہوں، تیرا کوئی شریک نہیں، میں صرف تیری طلبی پر حاضر ہوں، تعریف تیری ہے، نعمت تیری ہے، ملک تیرا ہے، اور تیرا کوئی شریک نہیں۔

---

(۱) البقرۃ: ۱۹۷

(۲) ان الفاظ کا ترجمہ یہ ہے: ''میں حاضر ہوں اے اللہ میں حاضر ہوں، میں حاضر ہوں، تیرا کوئی شریک نہیں میں حاضر ہوں بے شک تعریف تیرے لئے ہے اور نعمتیں تیری طرف سے ہیں بادشاہت تیری ہی ہے، تیرا کوئی شریک نہیں ہے''

احرام کا یہ فقیرانہ ماحول اس مسافر کے دل میں عاجزی اور انکساری، تواضع اور مسکنت پیدا کرتا ہے اور غرور و تکبر اور نخوت و ریاکاری کے تمام گھناؤنے جذبات کو کچل ڈالتا ہے، یہاں تک کہ جب اللہ کا یہ بندہ اس کے مقدس گھر میں پہنچتا ہے تو اسے اپنی بندگی کے سوا کسی چیز کا ہوش نہیں رہتا، یہاں اپنی ہستی کے ہر غرور کو خاک میں ملا کر وہ اس گھر کے گرد دیوانہ وار چکر کاٹتا ہے، اس کے پتھروں کو چومتا ہے، اس کی چوکھٹ تھام کر روتا اور گڑگڑاتا ہے۔

اس مقدس زمین کا ایک ایک ذرّہ اس کا رشتہ انبیاء اور صحابہ کے مقدس گروہ کے ساتھ جوڑ دیتا ہے اور اس مسافر کے دل میں اسی گروہ کی سی صفات اپنے آپ میں پیدا کرنے کا داعیہ جنم لیتا ہے۔ طواف سے فارغ ہو کر وہ مقامِ ابراہیم پر پہنچتا ہے تو کعبے کے مقدس معماروں کا تصور اس کے دل میں عقیدت و محبت کے جذبات پیدا کرتا ہے۔ پھر وہ صفا اور مروہ کے درمیان سعی کرتا ہے تو ایک طرف اسے حضرت ہاجرہ کی وہ آزمائش یاد آتی ہے جو انہوں نے اللہ کی خوشنودی کے لئے برداشت کی تھی، دوسری طرف اس کے دل میں خدا کے دین کے لئے سعی و عمل کے جذبات پروان چڑھتے ہیں۔

یہاں تک کہ پھر ایک دن وہ مسجدِ حرام کو بھی خیر باد کہہ کر ان صحراؤں کا رخ کرتا ہے جہاں کے ہر ہر چپے سے اسلامی تاریخ کے بیشمار واقعات وابستہ ہیں، وہ اللہ کے حکم کے مطابق کبھی منیٰ میں پڑاؤ ڈالتا ہے، کبھی عرفات میں خیمہ زن ہوتا ہے، کبھی مزدلفہ میں رات گزارتا ہے، اور بالآخر منیٰ کے تین جمرات پر بار بار کنکریاں مار کر وہ شیطانی وساوس اور نفسانی خواہشات کے ساتھ جنگ کرنے کا عملی مظاہرہ پیش کرتا ہے، یہیں پر کسی جانور کی قربانی پیش کر کے وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عظیم الشان قربانی کی یاد تازہ کرتا ہے، اور گویا ان تمام عبادتوں کے آخر میں اس بات کا اقرار کرتا ہے کہ وقت آنے پر خدا کے دین کے لئے اپنی جان کی قربانی سے بھی دریغ نہیں کرے گا۔

آپ نے دیکھا کہ افعالِ حج کی ایک ایک نقل و حرکت اس کے اندر اعلیٰ ترین اوصاف اور پاکیزہ ترین خصلتیں پیدا کرنے میں کتنی مدد کرتی ہے؟

حج کے یہ تمام فائدے انفرادی نوعیت رکھتے ہیں، یہ وہ فوائد ہیں جو تنہا حج کرنے والے کو حاصل ہوتے ہیں، لیکن حج کے فوائد کی فہرست یہاں ختم نہیں ہو جاتی، اب ایک طائرانہ نظر ان فوائد پر ڈال کر دیکھئے جو حج کی وجہ سے مسلمانوں کے پورے معاشرے کو حاصل ہوتے ہیں۔

آپ دیکھتے ہیں کہ حج کے زمانے میں عالمِ اسلام کا ہر گوشہ سفرِ حج کی سرگرمیوں سے معمور ہو جاتا ہے، رمضان سے لے کر ربیع الاول تک چھ مہینوں میں عازمینِ حج کی آمد و رفت کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ اس عرصے میں جو لوگ حج کو نہیں جاتے وہ بھی حاجیوں کو سفر کے لئے تیار کر کے انہیں رخصت کر کے، اور پھر واپسی پر ان کا استقبال کر کے اور ان سے دیارِ حبیب کے پُر کیف احوال سن کر

کسی نہ کسی درجے میں ان صفات کا ایک حصہ حاصل کر لیتے ہیں جو حج کا سفر انسان میں پیدا کرتا ہے، اور اس طرح پوری دنیا میں ایک اسلامی روح بیدار ہوتی ہے۔

حج کے مسافروں کا یہ قافلہ جس کے دل میں خدا کی رضا جوئی کے سوا کوئی لگن نہیں، جس بستی سے گزرتا ہے، اس کو اپنے اخلاق و اعمال سے متاثر کرتا ہے، اور ان کے دلوں میں بھی اس پُر کیف سفر کے ولولے پیدا ہوتے ہیں۔

پھر عرفات کے میدان میں کوئی حاجی تنہا نہیں پہنچتا، یہاں لاکھوں فرزندانِ توحید کا ایک دلآویز اجتماع ہوتا ہے، ان کی زبانیں مختلف ہیں، ان کے رنگ مختلف ہیں، ان کی نسلیں جدا ہیں، مگر یہ آپس کے ہر فرق کو مٹا کر اس طرح ایک ہو جاتے ہیں کہ ان کا خدا ایک، ان کا رسول ایک، ان کی کتاب ایک، ان کا کعبہ ایک، ان کے لبوں پر پکار ایک، انکے دلوں میں لگن ایک، یہاں تک کہ ان کے بدن پر لباس ایک ہوتا ہے، اس طرح آسمان کی نگاہیں انسانی اتحاد کا وہ عظیم ترین مظاہرہ دیکھتی ہیں جس کی نظیر دنیا کے کسی گوشے میں نظر نہیں آسکتی۔

یہاں ہر مسلمان کو اپنے بھائی کے حالات سننے، اس کے دکھ سکھ میں شریک ہونے اور پوری ملتِ اسلامیہ کی فلاح و بہبود کے طریقے سوچنے کا موقع ملتا ہے، یہاں مسلمانوں کو اتحاد کے ساتھ تنظیم کی تربیت ملتی ہے، یہاں لاکھوں انسانوں کا لشکر ایک امیر الحج کی پیروی کرتا ہے، اسی کے پیچھے نماز پڑھتا ہے، اسی کی تقریریں سن کر ان پر عمل کرتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ روحانی تربیت کی اس عظیم عبادت سے فارغ ہو کر انسان چاہے تو وہ اپنے آپ کو انسانیت کا ایک ایسا مکمل نمونہ بنا سکتا ہے جو اس کے معاشرے کے ہر فرد کے لئے باعثِ رشک ہو، اسی لئے سرکارِ دو عالم محمد مصطفیٰ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((مَنْ حَجَّ فَلَمْ يَرْفُثْ وَلَمْ يَفْسُقْ رَجَعَ كَيَوْمِ وَلَدَتْهُ أُمُّهُ)) (۱)

''جو شخص اس طرح حج کرے کہ اس نے کوئی بے حیائی کا کام نہ کیا ہو، اور نہ کسی فسق و فجور میں مبتلا ہوا ہو، وہ اس طرح پاک صاف ہو کر لوٹتا ہے جیسے آج اپنی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا ہے''

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.

(۱) سنن الترمذی، کتاب الحج عن رسول الله، باب ما جاء فی ثواب الحج والعمرة، رقم: ۷۳۹، مسند أحمد، رقم: ٦٨٣٩

حج ایک عاشقانہ عبادت ☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ! فَأَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

﴿وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيْلًا﴾ (۱)

بزرگانِ محترم اور برادرانِ عزیز! رمضان المبارک گزر جانے کے بعد شوال کا مہینہ شروع ہو چکا ہے۔ شوال کا مہینہ ان مہینوں میں شمار ہوتا ہے جن کو اللہ جل شانہ نے ''اشہر الحج'' یعنی حج کے مہینے کہا ہے، کیونکہ شوال، ذیقعدہ اور ذی الحجہ کے دس دن کو اللہ تعالیٰ نے حج کے مہینے قرار دیا ہے۔

رمضان المبارک سے لے کر ذی الحجہ تک کے ایام اللہ تعالیٰ نے ایسی عبادتوں کے لئے مخصوص فرمائے ہیں جو خاص انہی ایام میں انجام دی جاسکتی ہیں، چنانچہ رمضان کا مہینہ اللہ تعالیٰ نے روزے کے لئے اور تراویح کے لئے مقرر فرمایا اور شوال، ذیقعدہ اور ذی الحجہ کے مہینے حج کے لئے اور قربانی کے لئے مقرر فرمائے، حج اور قربانی ایسی عبادتیں ہیں جو ان ایام کے علاوہ دوسرے ایام میں نہیں انجام دی جاسکتیں، گویا کہ عبادات کا ایک سلسلہ ہے جو رمضان المبارک سے شروع ہوتا ہے اور ذی الحجہ پر جاکر ختم ہوتا ہے، اس لئے ان مہینوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بڑا تقدس حاصل ہے۔

ماہِ شوال کی فضیلت

رمضان المبارک تو تمام مہینوں میں مبارک مہینہ ہے، شوال کے بارے میں حضورِ اقدس ﷺ نے فرمایا:

''جو شخص شوال کے مہینے میں چھ روزے رکھ لے تو اللہ تعالیٰ اس کو سارے سال روزے رکھنے کا ثواب عطا فرماتے ہیں'' (۲)

☆ اصلاحی خطبات (۱۴/۴۵ تا ۵۸) بعد از نمازِ عصر، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی

(۱) آل عمران: ۹۷ (۲) حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں

کیونکہ ہر نیکی کا ثواب اللہ تعالیٰ دس گنا عطا فرماتے ہیں، لہٰذا جب ایک شخص نے رمضان المبارک میں تیس روزے رکھے تو اس کا دس گنا تین سو ہوگیا اور چھ روزے جب شوال میں رکھے تو ان کا دس گنا ساٹھ ہوگیا، اس طرح تمام روزوں کا ثواب مل کر تین سو ساٹھ روزوں کے برابر ہوگیا اور سال کے تین سو ساٹھ دن ہوتے ہیں، اس لئے فرمایا کہ اگر کسی شخص نے رمضان کے ساتھ شوال میں چھ روزے رکھ لیے تو گویا اس نے پورے سال روزے رکھے۔ شوال کے چھ روزوں کے ذریعہ اللہ تعالیٰ یہ ثواب عطا فرماتے ہیں۔ بہتر یہ ہے کہ یہ چھ روزے عیدالفطر کے فوراً بعد رکھ لیے جائیں، لیکن اگر فوراً نہ رکھ سکیں تو شوال کے مہینے کے اندر اندر پورے کرلیں۔

ماہِ شوال اور امورِ خیر

اسی شوال کے مہینے میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے نکاح ہوا اور اسی مہینے میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی رخصتی ہوئی۔ لہٰذا اس ماہ میں برکتوں کے بہت سارے اسباب جمع ہیں۔

ماہِ ذیقعدہ کی فضیلت

اسی طرح ذیقعدہ کا اگلا مہینہ بھی ''اشہرالحج'' میں شامل ہے، حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی میں مدینہ طیبہ کے قیام کے دوران حج کے علاوہ چار عمرے ادا فرمائے، یہ چاروں عمرے ذیقعدہ کے مہینے میں ادا فرمائے۔ اس لحاظ سے بھی اس ماہ کو تقدس حاصل ہے۔

ماہِ ذیقعدہ منحوس نہیں

ہمارے معاشرے میں ''ذیقعدہ'' کے مہینے کو جو منحوس سمجھا جاتا ہے اور اس کو ''خالی'' کا مہینہ کہا جاتا ہے یعنی یہ مہینہ ہر برکت سے خالی ہے، چنانچہ اس ماہ میں نکاح اور شادی نہیں کرتے اور کوئی خوشی کی تقریب نہیں کرتے، یہ سب فضولیات اور توہم پرستی ہے، شریعت میں اس کی کوئی اصل نہیں۔ بہر حال! یہ تین مہینے حج کے مہینے ہیں، اس لئے خیال ہوا کہ آج حج کے بارے میں تھوڑا سا بیان ہوجائے۔

(حاشیہ صفحہ گزشتہ) صحیح مسلم، کتاب الصیام، باب استحباب صوم ستة أیام من شوال اتباعًا لرمضان، رقم: ۱۹۸٤، سنن الترمذی، کتاب الصوم عن رسول اللّٰہ، باب ما جاء فی صیام ستة أیام من شوال، رقم: ٦٩٠، سنن أبی داؤد، کتاب الصوم، باب فی صوم ستة أیام من شوال، رقم: ۲۰۷۸، سنن ابن ماجه، کتاب الصیام، باب صیام ستة أیام من شوال، رقم: ۱۷۰۵، مسند أحمد، رقم: ۱۳۷۸۳

حج اسلام کا اہم رکن ہے

یہ حج اسلام کے ارکان میں سے ایک اہم رکن ہے۔ اسلام کے چار ارکان ہیں یعنی نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج، ان چاروں ارکان پر اسلام کی بنیاد ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لئے عبادت کے جو مختلف طریقے تجویز فرمائے ہیں، ان میں سے ہر طریقہ نرالی شان رکھتا ہے، مثلاً نماز کی الگ شان ہے، روزہ کی ایک الگ شان ہے، زکوٰۃ کی الگ شان ہے، حج کی الگ شان ہے۔

عبادات کی تین اقسام

عام طور پر عبادتوں کو تین حصوں پر تقسیم کیا جاتا ہے، ایک ''عباداتِ بدنیہ'' جو انسان کے بدن سے تعلق رکھتی ہیں اور بدن کے ذریعہ ان کی ادائیگی ہوتی ہے، جیسے نماز بدنی عبادت ہے۔ دوسری ''عباداتِ مالیہ'' جس میں بدن کو دخل نہیں ہوتا بلکہ اس میں پیسے خرچ ہوتے ہیں، جیسے زکوٰۃ اور قربانی۔

تیسری عبادات وہ ہیں جو بدنی بھی ہیں اور مالی بھی ہیں، ان کے ادا کرنے میں انسان کے بدن کو بھی دخل ہوتا ہے اور مال کو بھی دخل ہوتا ہے، جیسے حج کی عبادت۔ حج کی عبادت میں انسان کا بدن بھی خرچ ہوتا ہے اور اس کا مال بھی خرچ ہوتا ہے، اس لئے یہ عبادت بدن اور مال دونوں سے مرکب ہے۔ اور اس حج کی عبادت میں عاشقانہ شان پائی جاتی ہے، کیونکہ حج میں اللہ تعالیٰ نے ایسے ارکان رکھے ہیں جن کے ذریعہ اللہ تعالیٰ سے عشق و محبت کا اظہار ہوتا ہے۔

اِحرام کا مطلب

جب یہ حج کی عبادت شروع ہوتی ہے تو سب سے پہلے احرام باندھا جاتا ہے۔ عام طور پر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ چادریں باندھنا ہی احرام ہے، حالانکہ محض ان چادروں کا نام احرام نہیں بلکہ ''اِحرام'' کے معنی ہیں ''بہت سی چیزوں کو اپنے اُوپر حرام کر لینا''

جب انسان حج یا عمرہ کی نیت کرنے کے بعد تلبیہ پڑھ لیتا ہے تو اس کے بعد اس کے اُوپر بہت سی چیزیں حرام ہو جاتی ہیں۔ مثلاً سلا ہوا کپڑا پہننا حرام، خوشبو لگانا حرام، جسم کے کسی بھی حصے کے بال کاٹنا حرام، ناخن کاٹنا حرام اور اپنی بیوی کے ساتھ جائز نفسانی خواہشات پوری کرنا حرام۔ اسی وجہ سے اس کا نام ''احرام'' رکھا گیا ہے۔

اے اللہ! میں حاضر ہوں

اور جب انسان حج یا عمرہ کی نیت کر کے یہ تلبیہ پڑھتا ہے:

"لَبَّيْكَ اَللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ، لَبَّيْكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ لَبَّيْكَ، إِنَّ الْحَمْدَ وَالنِّعْمَةَ لَكَ وَالْمُلْكَ، لَا شَرِيْكَ لَكَ"

جس کے معنی یہ ہیں کہ اے اللہ! میں حاضر ہوں ـــــ کیوں حاضر ہوں؟ اس لئے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بیت اللہ شریف کی تعمیر فرمائی تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے ان کو حکم فرمایا:

﴿وَأَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَأْتُوكَ رِجَالًا وَّعَلَى كُلِّ ضَامِرٍ يَّأْتِيْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ﴾(۱)

"(اے ابراہیم!) لوگوں میں یہ اعلان فرمادیں کہ وہ اس بیت اللہ کے حج کے لئے آئیں، پیدل آئیں اور سوار ہو کر آئیں، دور دراز سے اور دنیا کے چپے چپے سے یہاں پہنچیں"

چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایک پہاڑ پر چڑھ کر یہ اعلان فرمایا تھا کہ اے لوگو! یہ اللہ کا گھر ہے، اللہ کی عبادت کے لئے یہاں آؤ۔ یہ اعلان آپ نے پانچ ہزار سال پہلے کیا تھا، آج جب کوئی عمرہ کرنے والا یا حج کرنے والا حج یا عمرہ کا ارادہ کرتا ہے تو وہ درحقیقت حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کے اعلان کا جواب دیتے ہوئے یہ کہتا ہے:

لَبَّيْكَ اَللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ

اے اللہ! میں حاضر ہوں اور بار بار حاضر ہوں۔ اور جس وقت بندہ نے یہ کہہ دیا کہ میں حاضر ہوں، بس اسی وقت سے احرام کی پابندیاں شروع ہو گئیں، چنانچہ اب وہ سلا ہوا کپڑا نہیں پہن سکتا، خوشبو نہیں لگا سکتا، بال نہیں کاٹ سکتا، ناخن نہیں کاٹ سکتا اور اپنی جائز نفسانی خواہشات بھی پوری نہیں کر سکتا۔

احرام کفن یاد دلاتا ہے

گویا اللہ جل شانہ کی پکار پر ایک عاشق بندے نے اپنے پروردگار کے عشق میں دنیا کی آسائشیں اور راحتیں سب چھوڑ دیں، اب تک وہ سلے ہوئے کپڑے پہنے ہوا تھا، وہ سب اُتار دیئے، اب وہ دو چادریں پہنے ہوا ہے جو اسے اس کے کفن کی یاد دلا رہی ہیں کہ ایک وقت ایسا آنے والا ہے

---

(۱) الحج: ۲۷

کہ جب تو دنیا سے رخصت ہو رہا ہوگا تو اس وقت تیرا یہی لباس ہوگا، چاہے وہ بادشاہ ہو، چاہے سرمایہ دار ہو، چاہے فقیر ہو، سب آج دو چادر پہنے ہوئے ہیں اور انسانی مساوات کا ایک منظر پیش کر رہے ہیں، جس شخص کو دیکھو وہ آج دو چادروں میں ملبوس نظر آ رہا ہے۔

''طواف'' ایک لذیذ عبادت

پھر وہاں بیت اللہ کے پاس پہنچ کر بیت اللہ کا طواف کر رہے ہیں، اس ''طواف'' میں ایک عاشقانہ شان ہے، جس طرح ایک عاشق اپنے محبوب کے گھر کے گرد چکر لگاتا ہے، اسی طرح یہ اللہ کا بندہ اللہ تعالیٰ کے گھر کے گرد چکر لگا رہا ہے۔ اور یہ چکر لگانا اللہ تعالیٰ کو اتنا محبوب ہے کہ اس طواف میں ایک ایک قدم پر ایک ایک گناہ معاف ہو رہا ہے اور ایک ایک درجہ بلند ہو رہا ہے۔ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے طواف کرنے کا موقع عطا فرمایا ہے وہ میری اس بات کی تصدیق کریں گے کہ شاید روئے زمین پر طواف سے زیادہ لذیذ عبادت کوئی اور نہ ہو۔

اظہارِ محبت کے مختلف انداز

انسان کی فطرت یہ چاہتی ہے کہ وہ اپنے مالک کے ساتھ عشق و محبت کا اظہار کرے، اس کے گھر کا چکر لگائے، اس کے دروازے کو چومے اور اس سے لپٹ جائے، اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت کے اس تقاضے کی تکمیل کے سارے اسباب اس بیت اللہ میں جمع فرما دیے ہیں۔ جب آپ کسی سے محبت کرتے ہیں تو آپ کا دل چاہتا ہے کہ اس کو گلے لگاؤں، اس کے پاس رہوں، اب اللہ تعالیٰ سے محبت تو ہے لیکن اس کو گلے سے نہیں لگا سکتے، براہِ راست اللہ تعالیٰ کی قدم بوسی نہیں کر سکتے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے میرے بندو! تم یہ کام براہِ راست تو نہیں کر سکتے، اس لئے تم ایسا کرو کہ یہ میرا گھر ہے، تم اس گھر کے چکر لگاؤ اور اس کے اندر میں نے ایک حجرِ اسود رکھ دیا ہے، تم اس حجرِ اسود کو چومو، یہ تمہارا حجرِ اسود کو چومنا یہ تمہارے عشق و محبت کا اظہار ہوگا، اور اگر مجھ سے لپٹنے کو دل چاہتا ہے تو میرے اس گھر کے دروازے اور حجرِ اسود کے درمیان جو دیوار ہے جس کو ملتزم کہتے ہیں، اس دیوار سے لپٹ جاؤ اور یہاں لپٹ کر تم جو کچھ مجھ سے مانگو گے میرا وعدہ ہے کہ تمہیں دوں گا۔ یہ عاشقانہ شان اللہ تعالیٰ نے اس حج کی عبادت میں رکھی ہے، آدمی کو اپنے جذبات کے اظہار کا اس سے بہتر موقع کہیں اور نہیں مل سکتا جیسا موقع وہاں ملتا ہے۔

دینِ اسلام میں انسانی فطرت کا خیال

ہمارے دینِ اسلام کی بھی عجیب شان ہے کہ ایک طرف بت پرستی کو منع کر دیا اور اس کو شرک اور حرام قرار دے دیا اور یہ کہہ دیا کہ جو شخص بت پرستی کرے گا وہ اسلام کے دائرے سے خارج ہے، اس لئے کہ یہ بت تو بے جان پتھر ہیں، نہ ان کے اندر نفع پہنچانے کی صلاحیت ہے اور نہ ہی نقصان پہنچانے کی صلاحیت ہے، لیکن دوسری طرف چونکہ انسان کی فطرت میں یہ بات داخل ہے کہ وہ اپنے محبوب کے ساتھ اپنی محبت کا اظہار کرے، اس محبت کے اظہار کے لئے اللہ تعالیٰ نے بیت اللہ کو ایک نشان بنا دیا اور ساتھ میں یہ بتا دیا کہ بیت اللہ کی ذات میں کچھ نہیں رکھا، لیکن چونکہ ہم نے اس کو اپنی طرف منسوب کر کے یہ کہہ دیا کہ یہ ہمارا گھر ہے اور ہم نے ہی اس کے اندر پتھر رکھ دیا ہے تاکہ تمہارے جذبات کی تسکین ہو جائے، اب نسبت کے بعد اس گھر کے چکر لگانا اور اس پتھر کو چومنا عبادت ہے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا حجرِ اسود سے خطاب

اسی وجہ سے حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ جب حج کے لئے تشریف لے گئے اور حجرِ اسود کے پاس جا کر اس کو بوسہ دینے لگے تو اس حجرِ اسود کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ اے حجرِ اسود! میں جانتا ہوں کہ تو ایک پتھر ہے، نہ تو نقصان پہنچا سکتا ہے اور نہ فائدہ پہنچا سکتا ہے، اگر میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بوسہ دیتے ہوئے نہ دیکھا ہوتا تو میں تجھے بوسہ نہ دیتا۔ (۱)

چونکہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ یہ سنت جاری فرما دی، اس لئے اس کا چومنا اور بوسہ دینا عبادت بن گیا۔

ہرے ستونوں کے درمیان دوڑنا

طواف کے بعد صفا اور مروہ کے درمیان چکر لگائے جا رہے ہیں اور جب سبز ستون کے پاس پہنچے تو دوڑنا شروع کر دیا، جسے دیکھو دوڑا جا رہا ہے، بھاگا جا رہا ہے، اچھے خاصے سنجیدہ آدمی، پڑھے لکھے، تعلیم یافتہ، جن کو کبھی بھاگ کر چلنے کی عادت نہیں، مگر ہر ایک دوڑا جا رہا ہے، چاہے بوڑھا ہو، جوان ہو، بچہ ہو، یہ کیا ہے؟ یہ اس لئے دوڑا جا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو سنت قرار دیا ہے۔ حضرت ہاجرہ علیہا السلام نے یہاں دوڑ لگائی تھی، اللہ تعالیٰ کو ان کی یہ ادا اتنی پسند آئی کہ

---

(۱) البداية والنهاية (۱۵۳/۵)، حياة الصحابة (۴۷۷/۲)

قیامِ قیامت تک آنے والے تمام مسلمانوں کے لئے یہ ضروری قرار دیدیا کہ جو حج کرنے آئے گا، وہ صفا مروہ کے درمیان چکر لگائے گا اور دوڑے گا۔

اب مسجدِ حرام کو چھوڑ دو

جب ۸/ ذی الحجہ کی تاریخ آگئی تو اب یہ حکم آیا کہ مسجدِ حرام کو چھوڑ دو اور منیٰ میں جا کر پانچ نمازیں ادا کرو، حالانکہ اطمینان سے مکہ میں رہ رہے تھے اور مسجدِ حرام میں نمازیں ادا کر رہے تھے، جہاں ایک نماز کا ثواب ایک لاکھ نمازوں کے برابر مل رہا تھا، لیکن اب یہ حکم آگیا کہ اب مکہ سے نکل جاؤ اور منیٰ میں جا کر قیام کرو اور پانچ نمازیں وہاں ادا کرو۔ کیوں؟ اس حکم کے ذریعہ یہ بتلانا مقصود ہے کہ نہ مسجدِ حرام میں اپنی ذات کے اعتبار سے کچھ رکھا ہے اور نہ بیت اللہ میں اپنی ذات کے اعتبار سے کچھ رکھا ہے۔ جو کچھ ہے وہ ہمارے حکم میں ہے۔ جب تک ہمارا حکم تھا کہ مکہ مکرمہ میں رہو، اس وقت تک مسجدِ حرام میں ایک نماز کا ثواب ایک لاکھ نمازوں کے برابر مل رہا تھا اور اب ہمارا حکم یہ ہے کہ یہاں سے جاؤ تو اب اس کے لئے یہاں رہنا جائز نہیں۔

اب عرفات چلے جاؤ

منیٰ کے قیام کے بعد اب ایسی جگہ تمہیں لے جائیں گے جہاں حدِ نگاہ تک میدان پھیلا ہوا ہے، کوئی عمارت نہیں اور کوئی سایہ نہیں، ایک دن تمہیں یہاں گزارنا ہوگا۔ یہ دن اس طرح گزارنا کہ ظہر اور عصر کی نماز ایک ساتھ ادا کر لینا اور پھر اس کے بعد سے لے کر مغرب تک کھڑے ہو کر ہمیں پکارتے رہنا اور ہمارا ذکر کرتے رہنا، ہم سے دعائیں کرنا اور تلاوت کرنا اور مغرب تک یہاں رہنا۔

اب مزدلفہ چلے جاؤ

اور عرفات میں تو تمہیں خیمے لگانے کی اجازت تھی، اب ہم تمہیں ایسے میدان میں لے جائیں گے جہاں تم خیمہ بھی نہیں لگا سکتے، وہ ہے ''مزدلفہ''، لہٰذا غروبِ آفتاب کے بعد مزدلفہ کی طرف روانہ ہو جاؤ اور رات وہاں گزارو۔

مغرب کو عشاء کے ساتھ ملا کر پڑھو

عام دنوں میں تو یہ حکم ہے کہ جیسے ہی غروبِ آفتاب ہو جائے تو فوراً مغرب کی نماز ادا کرو، لیکن آج یہ حکم ہے کہ مزدلفہ جاؤ اور وہاں پہنچ کر مغرب اور عشاء کی نماز ایک ساتھ ادا کرو۔ ان احکام

کے ذریعہ یہ بتایا جارہا ہے کہ جب تک ہم نے کہا تھا کہ مغرب کی نماز جلدی پڑھو، اس وقت تک جلدی پڑھنا تمہارے ذمے واجب تھا، اور جب ہم نے کہا کہ تاخیر سے پڑھو تو اب تاخیر سے پڑھنا تمہارے ذمے ضروری ہے، لہٰذا کسی وقت کے اندر کچھ نہیں رکھا جب تک ہمارا حکم نہ ہو۔

کنکریاں مارنا عقل کے خلاف ہے

قدم قدم پر اللہ تعالیٰ عام قوانین کو توڑ کر بندے کو یہ بتا رہے ہیں کہ تیرا کام تو ہماری عبادت کرنا اور ہمارا حکم ماننا ہے، اور کوئی چیز اپنی ذات میں کوئی حقیقت نہیں رکھتی جب تک ہمارا حکم نہ ہو۔ اب مزدلفہ سے پھر واپس منیٰ آؤ اور تین دن یہاں گزارو۔ اب یہاں تین دن کیوں گزاریں؟ یہاں کیا کام ہے؟ یہاں تمہارا کام یہ ہے کہ یہاں منیٰ میں تین ستون ہیں جن کو جمرات کہا جاتا ہے، ہر آدمی روزانہ تین دن تک ان کو سات سات کنکریاں مارے۔ ذرا اس عمل کو عقل وخرد کی ترازو میں تول کر دیکھو تو یہ عمل فضول اور بیکار نظر آئے گا۔ گذشتہ سال پچیس لاکھ مسلمانوں نے حج کیا اور یہ پچیس لاکھ انسان تین دن تک منیٰ میں پڑے ہوئے ہیں جن پر کروڑوں اور اربوں روپے خرچ ہو رہے ہیں اور ان میں ہر ایک کو یہ دھن ہے کہ میں ان جمرات کو سات سات کنکریاں ماروں۔ اچھے خاصے پڑھے لکھے، تعلیم یافتہ، معقول آدمی ہیں، مگر جس کو دیکھو وہ کنکریاں ڈھونڈتا پھر رہا ہے اور پھر ان جمرات کو مار کر خوش ہو رہا ہے کہ میں نے یہ عمل پورا کرلیا۔

حکم الٰہی، ہر چیز پر مقدم

کیا یہ کنکریاں مارنے کا عمل ایسا ہے جس پر اربوں روپیہ خرچ کیا جائے؟ بات یہ ہے کہ اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ کسی کام میں عقل وخرد کی بات نہیں، جب ہمارا حکم آجائے تو وہی کام جس کو تم دیوانگی سمجھ رہے تھے، وہی عقل کا کام بن جاتا ہے، جب ہمارا حکم آگیا کہ ان پتھروں کو مارو تو تمہارا کام یہ ہے کہ مارو، اسی میں تمہارے لئے اجر وثواب ہے، اسی عمل کے ذریعہ اللہ تعالیٰ تمہارے درجات بلند کر رہے ہیں۔ لہٰذا ہم نے اپنے دلوں میں عقل وخرد کے جو بت تعمیر کیے ہوئے ہیں، اس حج کی عبادت کے ذریعہ قدم قدم پر اللہ تعالیٰ ان بتوں کو توڑ رہے ہیں اور یہ بتا رہے ہیں کہ ان بتوں کی کوئی حقیقت نہیں اور یہ بتا رہے ہیں کہ اس کائنات میں کوئی چیز قابلِ تعمیل ہے تو وہ ہمارا حکم ہے۔ جب ہمارا حکم آجائے تو وہ حکم عقل میں آئے تو، عقل میں نہ آئے تو، تمہیں اس حکم کے آگے سر جھکانا ہے اور اس پر عمل کرنا ہے، پورے حج کے اندر یہی تربیت دی جارہی ہے۔

اسی وجہ سے حضورِ اقدس ﷺ نے اس حج کی بڑی فضیلت بیان فرمائی کہ اگر کوئی شخص حجِ مبرور

کر کے آتا ہے تو وہ ایسا گناہوں سے پاک صاف ہوتا ہے جیسے آج وہ اپنی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا ہے۔ (۱)

اللہ تعالیٰ نے اس عبادت کا یہ مقام رکھا ہے۔

حج کس پر فرض ہے؟

یہ حج کس پر فرض ہوتا ہے؟ اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں بیان فرمایا جو ابھی میں نے آپ کے سامنے تلاوت کی:

﴿وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا﴾ (۲)

یعنی اللہ کے لئے لوگوں پر فرض ہے کہ وہ بیت اللہ کا حج کریں اور یہ ہر اس شخص پر فرض ہے جو وہاں جانے کی استطاعت اور صلاحیت رکھتا ہو، یعنی اس کے پاس اتنے پیسے ہوں کہ وہ سواری کا انتظام کر سکے۔ فقہاء کرام نے اس کی تشریح میں فرمایا کہ جس کے پاس اتنا مال ہو کہ اس کے ذریعہ وہ حج پر جا سکے اور وہاں حج کے دوران اپنے کھانے پینے اور رہنے کا انتظام کر سکے اور اپنے پیچھے جو اہل وعیال ہیں، واپس آنے تک ان کے کھانے پینے کا انتظام کر سکے، ایسے شخص پر حج فرض ہو جاتا ہے۔

لیکن آج کل لوگوں نے حج کرنے کے لئے اپنے اُوپر بہت سی شرطیں عائد کر رکھی ہیں جن کی شریعت میں کوئی بنیاد نہیں۔ ان کے بارے میں آئندہ جمعہ انشاء اللہ تفصیل سے عرض کروں گا۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.

---

(۱) سنن الترمذی، کتاب الحج عن رسول اللہ، باب ما جاء فی ثواب الحج والعمرة، رقم: ۷۳۹، مسند أحمد، رقم: ٦٨٣٩

(۲) آل عمران: ۹۷

حج میں تاخیر کیوں؟☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ! فَأَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

﴿وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا﴾ (۱)

بزرگانِ محترم و برادرانِ عزیز! گذشتہ جمعہ کو اسی آیت پر بیان کیا تھا، اس آیت میں اللہ جل شانہ نے حج کی فرضیت کا ذکر فرمایا ہے۔ اس آیت کا ترجمہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لئے لوگوں پر واجب ہے کہ جو شخص بیت اللہ تک جانے کی استطاعت رکھتا ہو، وہ حج کرے۔ یہ حج ارکانِ اسلام میں سے چوتھا رکن ہے اور صاحبِ استطاعت پر اللہ تعالیٰ نے عمر بھر میں ایک مرتبہ فرض قرار دیا ہے۔ اور جب یہ حج فرض ہو جائے تو اب حکم یہ ہے کہ اس فریضے کو جلد از جلد ادا کیا جائے، بلاوجہ اس حج کو مؤخر کرنا درست نہیں، کیونکہ انسان کی موت اور زندگی کا کچھ بھروسہ نہیں۔ اگر حج فرض ہونے کے بعد اور ادائیگی سے پہلے انسان دنیا سے چلا جائے تو یہ بہت بڑا فریضہ اس کے ذمّے باقی رہ جاتا ہے، اس لئے حج فرض ہو جانے کے بعد جلد از جلد اس کی ادائیگی کی فکر کرنی چاہئے۔

ہم نے مختلف شرائط عائد کر لی ہیں

لیکن آجکل ہم لوگوں نے حج کرنے کے لئے اپنے اُوپر بہت سی شرطیں عائد کر لی ہیں، بہت سی ایسی پابندیاں عائد کر لی ہیں جن کی شریعت میں کوئی اصل نہیں۔ بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جب تک ان کے دنیوی مقاصد پورے نہ ہو جائیں مثلاً جب تک مکان نہ بن جائے یا جب تک بیٹیوں کی شادیاں نہ ہو جائیں، اس وقت تک حج نہیں کرنا چاہئے۔ یہ خیال بالکل غلط ہے، بلکہ جب انسان کے پاس اتنا مال ہو جائے کہ اس کے ذریعہ حج ادا کر سکے یا اس کی ملکیت میں سونا اور زیور ہے اور وہ اتنا ہے کہ اگر اس کو وہ فروخت کر دے تو اس کی رقم اتنی وصول ہو جائے گی جس کے ذریعہ حج ادا ہو جائے گا، تب بھی حج فرض ہو جائے گا، لہٰذا حج فرض ہو جانے کے بعد اس کو کسی چیز کے انتظار کرنے کی ضرورت نہیں۔

☆ اصلاحی خطبات (۱۴/۶۰ تا ۷۴) بعد از نمازِ عصر، جامع مسجد بیت المکرّم، کراچی (۱) آل عمران: ۹۷

حج مال میں برکت کا ذریعہ ہے

لہٰذا یہ سوچنا کہ ہمارے ذمے بہت سارے کام ہیں، ہمیں مکان بنانا ہے، ہمیں اپنی بیٹیوں یا بیٹوں کی شادی کرنی ہے، اگر یہ رقم ہم حج میں صرف کر دیں گے تو ان کاموں کے لئے رقم کہاں سے آئے گی؟ یہ سب فضول خیالات اور فضول سوچ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس حج کی خاصیت یہ رکھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے حج ادا کرنے کے نتیجے میں آج تک کوئی شخص مفلس نہیں ہوا۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے:

﴿لِيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ﴾ (۱)

یعنی ہم نے حج فرض کیا ہے، تاکہ اپنی آنکھوں سے وہ فائدے دیکھیں جو ہم نے ان کے لئے حج کے اندر رکھے ہیں۔ حج کے بے شمار فائدے ہیں، ان کا احاطہ کرنا بھی ممکن نہیں ہے، ان میں سے ایک فائدہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ رزق میں برکت عطا فرما دیتے ہیں۔

آج تک حج کی وجہ سے کوئی فقیر نہیں ہوا

حجِ بیت اللہ کا سلسلہ ہزاروں سال سے جاری ہے، آج تک کوئی ایک انسان بھی ایسا نہیں ملے گا جس کے بارے میں یہ کہا جا سکے کہ اس شخص نے چونکہ اپنے پیسے حج پر خرچ کر دیئے تھے، اس وجہ سے یہ مفلس اور فقیر ہو گیا۔ البتہ ایسے بے شمار لوگ آپ کو ملیں گے کہ حج کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے ان کے رزق میں برکت عطا فرمائی اور وسعت اور خوشحالی عطا فرمائی، لہٰذا یہ خیال بالکل غلط ہے کہ جب تک دنیا کے فلاں فلاں کام سے فارغ نہ ہو جائیں، اس وقت تک حج نہیں کریں گے۔

چونکہ مدینہ منورہ کا سفر حج کے ارکان میں سے نہیں ہے اور فرض و واجب بھی نہیں ہے، اگر کوئی شخص مکہ مکرمہ جا کر حج کر لے اور مدینہ منورہ نہ جائے تو اس کے حج میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی۔ البتہ یہ بات ضرور ہے کہ مدینہ منورہ کی حاضری عظیم سعادت ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر مؤمن کو عطا فرمائے اور سرکار دو عالم ﷺ کے روضۂ اقدس پر حاضر ہو کر سلام عرض کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔ لہٰذا چونکہ مدینہ منورہ کا سفر حج کے ارکان میں سے نہیں ہے، اس لئے فقہاء کرام نے لکھا ہے کہ اگر کسی شخص کے پاس اتنے پیسے ہیں کہ وہ مکہ مکرمہ جا کر حج تو ادا کر سکتا ہے لیکن مدینہ منورہ جانے کے پیسے نہیں ہیں، تب بھی اس کے ذمے حج فرض ہے۔ اس کو چاہئے کہ حج کر کے مکہ مکرمہ ہی سے واپس آ جائے۔ حالانکہ حضورِ اقدس ﷺ کے روضۂ اقدس کی حاضری ایسی عظیم نعمت ہے کہ انسان ساری عمر اس کی تمنا کرتا رہتا ہے۔ لہٰذا یہ خیال کہ اس حج کو فلاں کام ہونے تک مؤخر کر دیا جائے، یہ خیال درست نہیں۔

---

(۱) الحج: ۲۸

والدین کو پہلے حج کرانا ضروری نہیں

بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جب تک ہم والدین کو حج نہیں کرادیں گے، اس وقت تک ہمارا حج کرنا درست نہیں ہوگا۔ یہ خیال اتنا عام ہوگیا ہے کہ کئی لوگوں نے مجھ سے پوچھا کہ میں حج پر جانا چاہتا ہوں لیکن میرے والدین نے حج نہیں کیا، لوگ مجھے یہ کہتے ہیں کہ اگر والدین کے حج سے پہلے تم حج کرلو گے تو تمہارا حج قبول نہیں ہوگا۔ یہ محض جہالت کی بات ہے۔ ہر انسان پر اس کا فریضہ الگ ہے۔ جیسے والدین نے اگر نماز نہیں پڑھی تو بیٹے سے نماز ساقط نہیں ہوتی۔ بیٹے سے اس کی نماز کے بارے میں الگ سوال ہوگا اور ماں باپ سے ان کی نمازوں کے بارے میں الگ سوال ہوگا۔ یہی معاملہ حج کا ہے، اگر ماں باپ پر حج فرض نہیں ہے تو کوئی حرج نہیں، اگر وہ حج پر نہیں گئے تو کوئی بات نہیں، لیکن اگر آپ پر حج فرض ہے تو آپ کے لئے حج پر جانا ضروری ہے، اور یہ کوئی ضروری نہیں کہ پہلے والدین کو حج کرائے اور پھر خود کرے، یہ سب خیالات غلط ہیں، ہر انسان اللہ تعالیٰ کے نزدیک اپنے اعمال کا مکلّف ہے، اس کو اپنے اعمال کی فکر کرنی چاہئے۔

حج نہ کرنے پر شدید وعید

ہم میں سے بہت سے مسلمان ایسے ہیں جو ذاتی ضروریات اور ذاتی کاموں کی خاطر لمبے لمبے سفر کرتے ہیں، یورپ کا سفر کرتے ہیں، امریکہ اور فرانس اور جاپان کا سفر کرتے ہیں، لیکن اس بات کی توفیق نہیں ہوتی کہ اللہ تعالیٰ کے گھر پر حاضری دیدیں، یہ بڑی محرومی کی بات ہے۔
نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کے لئے بڑی سخت وعید بیان فرمائی ہے جو صاحبِ استطاعت ہونے کے باوجود حج نہ کرے، چنانچہ آپ نے ایک حدیث میں ارشاد فرمایا کہ جس شخص پر حج فرض ہوگیا ہو اور پھر بھی وہ حج کیے بغیر مر جائے تو ہمیں اس کی کوئی پرواہ نہیں کہ وہ یہودی ہو کر مرے یا نصرانی ہو کر مرے۔ (۱)

لہٰذا یہ معاملہ اتنا معمولی نہیں ہے کہ انسان اس حج کے فریضے کو ٹلاتا رہے اور یہ سوچتا رہے کہ جب فرصت اور موقع ہوگا تو حج کرلیں گے۔

بیٹیوں کی شادی کے عذر سے حج مؤخر کرنا

بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ بیٹیوں کی شادیاں کرنی ہیں، جب تک بیٹیوں کی شادیاں نہ ہوجائیں،

---

(۱) سنن الدارمی، کتاب المناسك، باب من مات ولم یحج، رقم: ۱۷۱۹

اس وقت تک حج نہیں کرنا، لہٰذا پہلے بیٹیوں کی شادی کریں گے پھر حج کریں گے۔ یہ بھی بیکار بات ہے، یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے کوئی شخص یہ کہے کہ جب بیٹی کی شادی ہو جائے گی تو اس کے بعد نماز پڑھوں گا۔ بھائی! اللہ تعالیٰ نے جو فریضہ عائد کیا ہے وہ فریضہ ادا کرنا ہے، وہ کسی اور بات پر موقوف نہیں۔

حج سے پہلے قرض ادا کریں

البتہ حج ایک چیز پر موقوف ہے، وہ یہ کہ اگر کسی شخص پر قرضہ ہے تو قرض کو ادا کرنا حج پر مقدم ہے۔ قرض کو ادا کرنے کی اللہ تعالیٰ نے بڑی سخت تاکید فرمائی ہے کہ انسان کے اُوپر قرض نہیں رہنا چاہئے، جلد از جلد قرض کو ادا کرنا چاہئے۔ اس کے علاوہ لوگوں نے اپنی طرف سے بہت سے کام حج پر مقدم کر رکھے ہیں، مثلاً پہلے میں اپنا مکان بنالوں یا پہلے مکان خرید لوں، یا پہلے گاڑی خرید لوں، پھر جا کر حج کرلوں گا، اس کی شریعت میں کوئی اصل نہیں۔

حج کے لئے بڑھاپے کا انتظار کرنا

بعض لوگ یہ سوچتے ہیں کہ جب بڑھاپا آجائے گا تو اس وقت حج کریں گے، جوانی میں حج کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ حج کرنا تو بوڑھوں کا کام ہے، جب بوڑھے ہو جائیں گے اور مرنے کا وقت قریب آئے گا تو اس وقت حج کرلیں گے۔

یاد رکھئے! یہ شیطانی دھوکہ ہے۔ ہر وہ شخص جو بالغ ہو جائے اور اس کے پاس اتنی استطاعت ہو کہ وہ حج ادا کر سکے تو اس پر حج فرض ہو گیا اور جب حج فرض ہو گیا تو اب جلد از جلد اس فریضے کو انجام دینا واجب ہے، بلا وجہ تاخیر کرنا جائز نہیں، کیا پتہ کہ بڑھاپے تک وہ زندہ بھی رہے گا یا نہیں۔ بلکہ درحقیقت حج تو جوانی کی عبادت ہے، جوانی میں آدمی کے قویٰ مضبوط ہوتے ہیں، وہ تندرست ہوتا ہے، اس وقت وہ حج کی مشقت کو آسانی کے ساتھ برداشت کرسکتا ہے، لہٰذا یہ سمجھنا کہ بڑھاپے میں حج کریں گے، یہ بات درست نہیں۔

حج فرض ادا نہ کرنے کی صورت میں وصیت کر دیں

یہاں یہ مسئلہ بھی عرض کردوں کہ اگر بالفرض کوئی شخص حج فرض ہو جانے کے باوجود اپنی زندگی میں حج ادا نہ کرسکا تو اس پر یہ فرض ہے کہ وہ اپنی زندگی میں یہ وصیت کرے کہ اگر میں زندگی میں حج فرض ادا نہ کرسکوں تو میرے مرنے کے بعد میرے ترکے سے کسی کو میری طرف سے حجِ بدل کے لئے بھیجا جائے۔ کیونکہ اگر آپ یہ وصیت کردیں گے تب تو آپ کے وارثین پر لازم ہوگا کہ وہ آپ کی

طرف سے حجِ بدل کرائیں ورنہ نہیں۔

حج صرف ایک تہائی مال سے ادا کیا جائے گا

اور وارثین پر بھی آپ کی طرف سے حجِ بدل کرنا اس وقت لازم ہوگا جب حج کا پورا خرچہ آپ کے پورے ترکے کے ایک تہائی کے اندر آتا ہو۔ مثلاً فرض کریں کہ حج کا خرچ ایک لاکھ روپے ہے اور آپ کا ترکہ تین لاکھ روپے بنتا ہے یا اس سے زیادہ، تو اس صورت میں یہ وصیت نافذ ہوگی اور ورثاء پر لازم ہوگا کہ آپ کی طرف سے حجِ بدل کرائیں، لیکن اگر حج کا خرچ ایک لاکھ روپے ہے اور آپ کا پورا ترکہ تین لاکھ سے کم ہے تو اس صورت میں ورثاء پر یہ لازم نہیں ہوگا کہ آپ کی طرف سے حجِ بدل ضرور کرائیں، کیونکہ شریعت کا یہ اُصول ہے کہ یہ مال جو ہمارے پاس موجود ہے، اس مال پر ہمارا اختیار اس وقت تک ہے جب تک ہم پر مرض الموت طاری نہیں ہوجاتا، ہم اس مال کو جس طرح چاہیں استعمال کریں، لیکن جیسے ہی مرض الموت شروع ہوجاتا ہے، اس وقت اس مال پر سے ہمارا اختیار ختم ہوجاتا ہے اور یہ مال وارثوں کا ہوجاتا ہے، البتہ اس وقت صرف ایک تہائی مال کی حد تک ہمارا اختیار باقی رہ جاتا ہے۔

تمام عبادات کا فدیہ ایک تہائی سے ادا ہوگا

لہٰذا اگر ہمارے ذمے نمازیں رہ گئی ہیں تو ان نمازوں کا فدیہ اس ایک تہائی سے ادا ہوگا، اگر روزے چھوٹ گئے ہیں تو ان روزوں کا فدیہ بھی اسی ایک تہائی سے ادا ہوگا، اگر زکوٰۃ باقی رہ گئی ہے تو اس کی ادائیگی بھی اسی ایک تہائی سے ہوگی، اگر حج رہ گیا ہے تو وہ بھی اسی ایک تہائی سے ادا ہوگا اور ایک تہائی سے باہر کی وصیت وارثوں کے ذمہ لازم نہیں ہوگی۔ اس لئے زندگی میں حج ادا نہ کرنا بڑا خطرناک ہے، کیونکہ اگر ہم وصیت بھی کر جائیں کہ ہمارے مال سے حج ادا کرا دیا جائے لیکن ترکہ اتنا نہ ہو جس کے ایک تہائی سے حج ادا ہوسکے تو ان کے ذمے اس وصیت کو پورا کرنا لازم نہیں ہوگا، اگر حج کرادیں تو یہ ان کا ہم پر احسان ہوگا اور اگر حج نہ کرائیں تو ان پر آخرت میں کوئی گرفت نہیں ہوگی۔

حجِ بدل مرنے والے کے شہر سے ہوگا

بعض لوگ حجِ بدل کراتے وقت یہ سوچتے ہیں کہ اگر ہم یہاں کراچی سے حجِ بدل کرائیں گے تو ایک لاکھ کا خرچ ہوگا، اس لئے ہم مکہ مکرمہ میں ہی کسی کو پیسے دیدیں گے، وہ وہیں سے حج ادا کرلے گا۔ یاد رکھئے! اس بارے میں مسئلہ یہ ہے کہ شدید مجبوری کے بغیر اس طرح حجِ بدل ادا نہیں ہوتا۔ اگر

میں کراچی میں رہتا ہوں اور میرے ذمے حج فرض ہے تو اگر میں کسی کو اپنی طرف سے حجِ بدل کے لئے بھیجوں تو وہ بھی کراچی سے جانا چاہئے، یہ نہیں کرسکتا کہ مکہ مکرمہ سے کسی کو پکڑ کر دو سو روپے میں حج کرالیا، چونکہ میں کراچی میں رہتا ہوں، اسلئے میرے وطن سے ہی حجِ بدل ہوگا، مکہ مکرمہ سے نہیں ہوگا۔

عذرِ معقول کی وجہ سے مکہ سے حج کرانا

یہ اور بات ہے کہ ایک آدمی دنیا سے چلا گیا اور اس نے ترکہ بالکل نہیں چھوڑا، اب اس کے ورثاء نے سوچا کہ اور کچھ نہیں ہوسکتا تو کم از کم اتنا ہو جائے کہ کسی کو مکہ مکرمہ ہی سے بھیج کر اس کی طرف سے حج کرادیں۔ تو قانون کے اعتبار سے تو وہ حجِ بدل نہیں ہوگا لیکن اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے قبول کرلیں تو یہ ان کا کرم ہے اور نہ ہونے سے یہ صورت بہر حال بہتر ہے۔ لیکن اصول اور قانون وہی ہے کہ جس شخص کے ذمے حج واجب ہے، حجِ بدل والے کو اسی شخص کے شہر سے جانا چاہئے۔

قانونی پابندی عذر ہے

آج کل یہ حال ہے کہ حج کرنا اپنے اختیار میں نہیں رہا، کیونکہ حج کرنے پر بہت ساری قانونی اور سرکاری پابندیاں عائد ہیں، مثلاً پہلے درخواست دو، پھر قرعہ اندازی میں نام آئے وغیرہ۔ لہٰذا جب کسی شخص پر حج فرض ہوگیا اور اس نے حج پر جانے کی قانونی کوشش کرلی اور پھر بھی نہ جاسکا تو وہ اللہ تعالیٰ کے یہاں معذور ہے، لیکن اپنی طرف سے کوشش کرے اور حج پر جانے کے جتنے قانونی ذرائع ہوسکتے ہیں ان کو اختیار کرے، لیکن آدمی ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جائے اور جانے کی فکر ہی نہ کرے تو یہ گناہ کی بات ہے۔

حج کی لذت حج ادا کرنے سے معلوم ہوگی

جب آپ ایک مرتبہ حج کرکے آئیں گے تو اس وقت آپ کو پتہ چلے گا کہ اس عبادت میں کیا چاشنی ہے؟ کیسی لذت ہے؟ اللہ تعالیٰ نے اس عبادت میں عجیب ہی کیف رکھا ہے۔ حج کے اندر سارے کام عقل کے خلاف ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے اس عبادت میں عشق کی جو شان رکھی ہے، اس کی وجہ سے اس عبادت کی خاصیت یہ ہے کہ اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کی محبت، اس کی عظمت، اس کے ساتھ عشق انسان کے دل میں پیدا ہو جاتا ہے اور جب وہ حج سے واپس آتا ہے تو ایسا ہو جاتا ہے جیسے وہ آج ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا ہے۔

حجِ نفل کے لئے گناہ کا ارتکاب جائز نہیں

اور جب آدمی ایک مرتبہ حج کر کے واپس آتا ہے تو اس کی پیاس اور زیادہ بڑھ جاتی ہے اور پھر بار بار جانے کو دل چاہتا ہے، اللہ تعالیٰ نے بار بار جانے پر کوئی پابندی بھی نہیں لگائی، فرض تو زندگی میں ایک مرتبہ کیا ہے، لیکن دوبارہ جانے پر کوئی پابندی نہیں ہے، جب بھی موقع ہو، آدمی نفلی حج پر جاسکتا ہے۔ مگر اس میں اس بات کا لحاظ رکھنا چاہئے کہ نفلی عبادتوں کی وجہ سے کسی گناہ کا ارتکاب نہ کرنا پڑے، کیونکہ نفلی عبادت کا حکم یہ ہے کہ اگر اس کو نہ کریں تو کوئی گناہ نہیں اور دوسری طرف گناہ سے بچنا واجب تھا، مثلاً جب حج کی درخواست دی جاتی ہے تو اس میں یہ لکھنا پڑتا ہے کہ میں نے اس سے پہلے حج نہیں کیا، اب آپ نے نفلی حج کے لئے یہ لکھ کر دے دیا کہ میں نے اس سے پہلے حج نہیں کیا، یہ آپ نے جھوٹ بولنے کا گناہ کرلیا اور جھوٹ بولنا حرام ہے، جھوٹ سے بچنا فرض ہے، گویا کہ آپ نے نفلی عبادت کے لئے جھوٹ کا ارتکاب کرلیا اور شریعت میں نفلی عبادت کے لئے جھوٹ کے ارتکاب کی کوئی گنجائش نہیں، ایسا جھوٹ بولنا ناجائز اور حرام ہے۔

حج کے لئے سودی معاملہ کرنا جائز نہیں

اسی طرح اگر اسپانسر شپ کے تحت حج کی درخواست دینی ہو تو اس کے لئے باہر سے ڈرافٹ منگوایا جاتا ہے، بعض لوگ یہاں سے خرید لیتے ہیں جس کے نتیجے میں سودی معاملہ کا ارتکاب کرنا پڑتا ہے۔ اب حجِ نفل کے لئے سودی معاملہ کر کے جانا، شرعاً اس کی کوئی گنجائش نہیں۔

حجِ نفل کے بجائے قرض ادا کریں

اسی طرح ایک شخص کے ذمے دوسروں کا قرض ہے تو قرض کی ادائیگی انسان پر مقدم ہے، اب وہ شخص قرض تو ادا نہیں کر رہا ہے لیکن ہر سال حج پر جا رہا ہے، گویا کہ فرض کام کو چھوڑ کر نفل کام کی طرف جا رہا ہے، یہ حرام اور ناجائز ہے۔

حجِ نفل کے بجائے نان ونفقہ ادا کریں

اسی طرح ایک شخص خود تو نفلی حج اور نفلی عمرے کر رہا ہے، جبکہ گھر والوں کو اور جن کا نفقہ اس شخص پر واجب ہے ان کو نفقہ کی تنگی ہو رہی ہے، یہ سب کام ناجائز ہیں یہ افراط ہے۔
بلکہ اگر کسی شخص کو یہ محسوس ہو کہ فلاں کام میں اس وقت خرچ کی زیادہ ضرورت ہے تو ایسی

صورت میں نفلی حج اور نفلی عمرے کے مقابلے میں اس کام پر خرچ کرنا زیادہ باعثِ ثواب ہے۔

حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ کا حجِ نفل چھوڑنا

حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ بڑے اُونچے درجے کے محدثین اور فقہاء میں سے ہیں اور صوفی بزرگ ہیں، یہ ہر سال حج کیا کرتے تھے، ایک مرتبہ اپنے قافلے کے ساتھ حج پر جا رہے تھے تو راستے میں ایک بستی کے پاس سے گزر ہوا، بستی کے قریب ایک کوڑے کا ڈھیر تھا، ایک بچی بستی سے نکل کر آئی اور اس کوڑے میں ایک مردار مرغی پڑی ہوئی تھی، اس بچی نے اس مردار مرغی کو اُٹھایا اور جلدی سے اپنے گھر کی طرف چلی گئی۔ حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ کو دیکھ کر بڑا تعجب ہوا کہ یہ بچی ایک مردار مرغی کو اُٹھا کر لے جا رہی ہے، چنانچہ آپ نے آدمی بھیج کر اس بچی کو بلوایا کہ تم اس مردار مرغی کو کیوں اُٹھا کر لے گئی ہو؟ اس بچی نے جواب دیا کہ بات دراصل یہ ہے کہ ہمارے گھر میں کئی روز سے فاقہ ہے اور ہمارے پاس اپنی جان بچانے کا کوئی راستہ اس کے سوا نہیں ہے کہ ہم اس مردار مرغی کو کھالیں۔ حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ کے دل پر بڑا اثر ہوا اور آپ نے فرمایا کہ ہم حج کا یہ سفر ملتوی کرتے ہیں اور تمام ساتھیوں سے فرمایا کہ اب ہم حج پر نہیں جائیں گے، جو پیسہ ہم حج پر خرچ کرتے، وہ پیسہ ہم اس بستی کے لوگوں پر خرچ کریں گے، تاکہ ان کی بھوک پیاس اور ان کی فاقہ کشی کا سدباب ہو سکے۔

تمام عبادات میں اعتدال اختیار کریں

لہٰذا یہ نہیں کہ ہمیں حج کرنے اور عمرہ کرنے کا شوق ہو گیا ہے، اب ہمیں اپنا یہ شوق پورا کرنا ہے، چاہے اس کے نتیجے میں شریعت کے دوسرے تقاضے نظر انداز ہو جائیں۔ بلکہ شریعت نام ہے توازن کا، کہ جس وقت میں اور جس جگہ میں جو ہم سے مطالبہ ہے، اس مطالبے کو پورا کریں اور یہ دیکھیں کہ اس وقت میرے مال کا زیادہ صحیح مصرف کیا ہو سکتا ہے جس کی اس وقت میں زیادہ ضرورت ہے؟ نفلی عبادتوں میں ان باتوں کا لحاظ رکھنا زیادہ ضروری ہے۔

اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے مجھے اور آپ کو حج کے انوار و برکات عطا فرمائے اور اپنی رضا کے مطابق اس کو قبول فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.

حج کے بارے میں کچھ گذارشات ☆

آج کل حج پر جانے کے خواہش مند حضرات سے درخواستیں وصول کی جارہی ہیں، اس سلسلے میں حج پالیسی کا اعلان ہو چکا ہے، اور قواعد وضوابط مشتہر کردیئے گئے ہیں، غالباً ۳۰/ نومبر تک حج کی درخواستیں وصول کی جائیں گی، اس موقع پر بعض قارئین نے خط کے ذریعے توجہ دلائی ہے کہ حج کی فرضیت کے بارے میں طرح طرح کی غلط فہمیاں لوگوں میں پھیلی ہوئی ہیں، اگر ایک مضمون کے ذریعے ان کا ازالہ کردیا جائے تو مفید ہوگا، اس فرمائش کی تعمیل میں چند گذارشات پیشِ خدمت ہیں:

(۱) حج کے بارے میں بہت سے حضرات یہ سمجھتے ہیں کہ یہ بڑھاپے میں کرنے کا کام ہے، لہٰذا جب تک اچھی خاصی عمر نہ گزر جائے، لوگوں کو دھیان ہی نہیں ہوتا کہ اس فریضے کی ادائیگی کرنی چاہئے، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ حج کا کسی خاص عمر سے کوئی تعلق نہیں ہے، جس طرح نماز اور روزہ بالغ ہوتے ہی انسان کے ذمّے فرض ہو جاتے ہیں، اور اگر انسان صاحبِ نصاب ہو تو زکوٰۃ بھی فرض ہو جاتی ہے، اسی طرح بالغ ہونے کے بعد جب بھی کسی شخص کو اتنی استطاعت حاصل ہو کہ وہ حج کر سکے، اس پر فوراً حج فرض ہو جاتا ہے۔ قرآن کریم نے فرمایا ہے کہ حج ہر اس شخص پر فرض ہے جو بیت اللہ تک جانے کی استطاعت رکھتا ہو، اس استطاعت کا مطلب یہ ہے کہ انسان کے پاس مکہ مکرمہ آنے جانے اور وہاں قیام و طعام وغیرہ کا ضروری خرچ موجود ہو، نیز اگر وہ اہل وعیال کو وطن میں چھوڑ کر جارہا ہے تو ان کے ضروری اخراجات انہیں دے کر جاسکے، جب بھی کسی شخص کے پاس اتنی رقم موجود ہو کہ وہ یہ ضروریات پوری کر سکے، تو اس پر حج کی ادائیگی فرض ہے، اگر اتنا خرچ نقد موجود نہ ہو، لیکن اپنی ملکیت میں اتنا زیور ہو، یا فوری ضرورت سے زائد اتنا سامان (مثلاً سامانِ تجارت) ہو کہ اس کی مالیت سے یہ خرچ پورے ہو سکتے ہوں تو اس پر بھی حج فرض ہو جاتا ہے۔

(۲) جب ایک مرتبہ حج فرض ہو جائے تو پھر اسے کسی شدید عذر کے بغیر ٹلانا یا مؤخر کرنا جائز نہیں، بلا وجہ مؤخر کرنے سے انسان گناہگار ہوتا ہے، ظاہر ہے کہ یہ بات کسی کو معلوم نہیں ہے کہ وہ کتنا عرصہ زندہ رہے گا، لہٰذا حج فرض ہونے کے بعد جس قدر جلد ممکن ہو، یہ فریضہ ادا کر لینا

☆ ذکر وفکر، ص: ۲۱۴ تا ۲۱۹، ۶ نومبر ۱۹۹۴ء

چاہئے، آج کل چونکہ اس کام کے لئے درخواست دے کر منظوری لینی پڑتی ہے، اس لئے جس شخص کے ذمّے بھی اُوپر بیان کیے ہوئے معیار کے مطابق حج فرض ہو، اس پر حج کے لئے درخواست دینا شرعاً ضروری ہے، اگر قرعہ اندازی میں نام نہ آئے، یا سرکار کی طرف سے اجازت نہ ملے تو ایک مجبوری ہے، اور انشاء اللہ اس صورت میں درخواست دینے والا حج کو مؤخر کرنے سے گناہگار نہیں ہوگا، اور جب تک وہ ہر سال درخواست دیتا رہے گا، اس کی ذمہ داری پوری ہوتی رہے گی، یہاں تک کہ اسے اجازت مل جائے، اور وہ باقاعدہ حج کرے۔ لیکن یہ تصور قطعی طور پر غلط اور بے بنیاد تصور ہے کہ جب عمر بڑی ہو جائے گی اس وقت حج کے لئے درخواست بھیجی جائے گی۔

بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ حج کا اصل لطف درحقیقت جوانی ہی میں ہے۔ اول تو اس لئے کہ حج میں جسمانی محنت اور مشقت کی ضرورت ہوتی ہے، اور حج کے افعال اسی وقت نشاط اور ذوق وشوق کے ساتھ انجام دیئے جاسکتے ہیں جب انسان کے قویٰ اچھے ہوں، اور وہ اطمینان کے ساتھ یہ محنت برداشت کرسکتا ہو، ورنہ بڑھاپے میں اگرچہ انسان جوں توں کر کے حج کر لیتا ہے، لیکن کتنے کام ایسے ہیں جنہیں نشاط، چستی اور حضورِ قلب کے ساتھ انجام دینے کی حسرت ہی دل میں رہ جاتی ہے۔ دوسرے اس لئے کہ حج اگر اخلاص اور نیک نیتی سے صحیح طور پر انجام دیا جائے تو تجربہ یہ ہے کہ وہ انسان کے دل میں ایک انقلاب ضرور لے کر آتا ہے۔ اس سے انسان کے دل میں نرمی، اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق اور آخرت کی فکر پیدا ہوتی ہے جو بالآخر اسے گناہوں، جرائم اور بدعنوانیوں سے روکتی ہے، قلب وذہن کی اس تبدیلی کی سب سے زیادہ ضرورت انسان کو جوانی میں ہوتی ہے، کیونکہ اس کے بغیر وہ جوانی کی رو میں غلطیاں کرتا چلا جاتا ہے۔

وقت پیری گرگِ ظالم می شود پرہیزگار
در جوانی توبہ کردن شیوۂ پیغمبری

”بڑھاپے میں تو ظالم بھیڑیا بھی ”پرہیزگار“ بن جاتا ہے، پیغمبروں کا شیوہ یہ ہے کہ جوانی میں ظلم اور گناہ سے توبہ کی جائے“

(۳) یہ غلط فہمی بھی بہت سے لوگوں کے ذہن میں پائی جاتی ہے کہ جب تک تمام اولاد کی شادیاں نہ ہو جائیں، اس وقت تک حج نہیں کرنا چاہئے، یہ خیال بھی سراسر غلط ہے جس کی کوئی بنیاد نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ حج کی فرضیت کا اولاد کی شادیوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ جس شخص کو بھی مذکورہ بالا معیار کے مطابق استطاعت ہو، اس کے ذمّے حج فرض ہو جاتا ہے، خواہ اولاد کی شادیاں ہوئی ہوں، یا نہ ہوئی ہوں۔

(۴) بعض گھرانوں میں یہ رواج بھی دیکھنے میں آیا کہ جب تک گھر کا بڑا فرد حج نہ کرلے اس وقت تک چھوٹے حج کرنا ضروری نہیں سمجھتے، بلکہ بعض گھرانوں میں اس کو ایک عیب سمجھا جاتا ہے کہ چھوٹا بڑے سے پہلے حج کر آئے، حالانکہ دوسری عبادتوں یعنی نماز، روزے اور زکوٰۃ کی طرح حج بھی ایک ایسا فریضہ ہے جو ہر شخص پر انفرادی طور سے عائد ہوتا ہے، خواہ کسی دوسرے نے حج کیا ہو، یا نہ کیا ہو، اگر گھر کے کسی چھوٹے فرد کے پاس حج کی استطاعت ہے تو اس پر حج فرض ہے، اگر بڑے کے پاس استطاعت نہ ہو، یا استطاعت کے باوجود وہ حج نہ کررہا ہو تو نہ اس سے چھوٹے کا فریضہ ساقط ہوتا ہے، نہ اسے مؤخر کرنے کا کوئی جواز پیدا ہوتا ہے۔

(۵) بہت سے گھرانوں میں یہ صورت دیکھنے میں آئی کہ باپ صاحبِ استطاعت نہیں ہے مگر بیٹا صاحبِ استطاعت ہے، اس کے باوجود وہ یہ سمجھتا ہے کہ پہلے میں باپ کو حج کراؤں، پھر خود حج کروں، یا اس وقت کا انتظار کروں جب میں باپ کو اپنے ساتھ حج کو لے جاسکوں، یہ طرزِ عمل بھی درست نہیں ہے۔ اگرچہ باپ کو حج کرانا ایک بڑی سعادت مندی ہے، لیکن اس سعادت کے حصول کے لئے اپنے فریضہ کو مؤخر کرنا درست نہیں۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے رمضان کے مہینے میں باپ بیماری یا ضعیفی کی وجہ سے روزے نہ رکھ سکے تو بیٹے کے لئے اس بات کا جواز پیدا نہیں ہوتا کہ وہ باپ کی وجہ سے خود اپنے روزے بھی چھوڑ دے، اور یہ طے کرلے کہ جب تک باپ روزے رکھنے کے لائق نہ ہو، میں بھی روزے نہیں رکھوں گا۔ جس طرح یہ طرزِ عمل غلط ہے، اسی طرح اپنے حج کو باپ کے حج پر موقوف رکھنا بھی غلط ہے۔ اپنا فرض ادا کرلینا چاہئے، پھر جب کبھی استطاعت ہو، اس وقت باپ کو حج کرانے کی بھی کوشش کرلینی چاہئے۔

خلاصہ یہ ہے کہ حج ایک عبادت ہے، اور وہ اسی طرح ہر شخص پر انفرادی طور سے فرض ہوتی ہے، جیسے نماز روزہ، اور کسی کے ذمّے دوسرے کو نہ حج کرانا فرض ہے، نہ اپنے حج کی ادائیگی دوسرے کے حج پر موقوف ہے، لہٰذا جن حضرات کے ذمّے مذکورہ بالا معیار کے مطابق حج فرض ہوچکا ہے، انہیں حج کی درخواست ضرور دینی چاہئے۔

(۶) جن حضرات کی درخواستیں منظور ہوجائیں، انہیں جانے سے پہلے حج کے مکمل احکام و آداب سیکھنے چاہئیں۔ اس کے لئے ہر زبان میں کتابیں بھی موجود ہیں، اور ہمارے ملک میں مختلف حلقوں کی طرف سے حج کے تربیتی کورس بھی منعقد ہوتے ہیں ان میں شرکت کرنی چاہئے۔ عموماً درخواست کی منظوری اور حج کے لئے روانگی کے درمیان خاصا طویل وقفہ ہوتا ہے جو حج

کے احکام و آداب سیکھنے کے لئے بہت کافی ہے، بہت سے حضرات اس طرف توجہ دیئے بغیر حج کے لئے روانہ ہو جاتے ہیں، اور اتنا خرچ اور مشقت اُٹھا کر بھی صحیح طریقے کے مطابق حج کرنے سے محروم رہتے ہیں۔ بعض حضرات اپنی اس لاعلمی کو اپنی من گھڑت آراء کے پردے میں چھپانے کی بھی کوشش کرتے ہیں، اور اپنی رائے سے حج کے طریقوں میں خود ساختہ تبدیلیاں بھی کر لیتے ہیں۔

دنیا میں ہر کام کے لئے کچھ ادب آداب ہیں، اور تو اور کھیلوں تک کے آداب اور قواعد مقرر ہیں، اور اب تو کھیلوں کے آداب و قواعد مستقل فن کی صورت اختیار کر گئے ہیں، اور کوئی شخص کھیل بھی کھیلنا چاہے تو اسے یہ قواعد سیکھنے پڑتے ہیں، اور دل مانے یا نہ مانے، ان کی پابندی کرنی پڑتی ہے، حج تو پھر ایک عبادت ہے، بڑی مقدس اور عظیم الشان عبادت، لہٰذا اس کے آداب و احکام سیکھنا اور ان کی پابندی کرنا ضروری ہے، محض اپنی رائے کے بل پر ان قواعد و آداب میں تبدیلی کرنا اپنی محنت اور پیسے کو ضائع کرنے کے مرادف ہے، اگر اپنی من مانی کرنی ہے تو حج کے تکلف کی ضرورت ہی کیا ہے۔

(۷) حج چونکہ تمام مسلمان اکٹھے ہو کر انجام دیتے ہیں اور حج کے موقع پر انسانوں کا سب سے بڑا اجتماع ہوتا ہے، اس لئے اس میں ایک دوسرے سے تکلیف پہنچنے کے امکانات بھی زیادہ ہوتے ہیں، اسی لئے اسلام نے حج کے احکام میں اس بات کو خاص طور پر مدِ نظر رکھا ہے کہ کوئی شخص کسی کے لئے تکلیف کا باعث نہ بنے، قدم قدم پر ایسی ہدایات دی گئی ہیں جن کا مقصد لوگوں کو تکلیف سے بچانا ہے، اس غرض کے لئے بہت سے ایسے کاموں کو ترک کرنے کی ہدایت دی گئی ہے جو بذاتِ خود بہت فضیلت رکھتے ہیں، لیکن افسوس ہے کہ صحیح معلومات اور مناسب تربیت نہ ہونے کی وجہ سے لوگ ان احکام کو پسِ پشت ڈال کر دوسروں کے لئے جان تک کا خطرہ پیدا کر دیتے ہیں، جو کام تھوڑا صبر و تحمل پیدا کر کے آرام و سکون کے ساتھ ہو سکتے ہیں ان میں دھکم پیل کی جاتی ہے، اور بلاوجہ حج جیسی عبادت کو دھینگا مشتی میں تبدیل کر دیا جاتا ہے، حالانکہ یہ بات اسلامی احکام کے قطعی خلاف اور سراسر ناجائز ہے جس سے عبادت کی روح پامال ہوتی ہے، لہٰذا حج کے تربیتی کورسوں اور حج سے متعلق ہدایات میں یہ پہلو خاص طور سے نمایاں کر کے اس پر زور دینے کی ضرورت ہے، وزارتِ مذہبی امور کو بطورِ خاص اس کام پر توجہ دینی چاہئے، حج کی پروازوں میں تمام راستے ایسی تقریریں نشر کی جانی چاہئیں جو عوام کو ان احکام و آداب سے نہ صرف واقف کرائیں، بلکہ ان کی اہمیت ان کے ذہن میں اچھی طرح بٹھا دیں۔

یکم جمادی الثانیہ ۱۴۱۵ھ، ۶/نومبر ۱۹۹۴ء

زکوٰۃ کی اہمیت اور اس کا نصاب ☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ! فَأَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ○ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ○

﴿قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ○ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ○ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ○ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ○﴾ (۱)

بزرگانِ محترم و برادرانِ عزیز! گذشتہ چند جمعوں سے فلاح یافتہ مؤمنوں کی صفات کا بیان چل رہا ہے، ان میں سے پہلی صفت یہ بیان فرمائی کہ فلاح یافتہ مؤمن وہ ہیں جو اپنی نمازوں میں خشوع اختیار کرنے والے ہیں، دوسری صفت یہ بیان فرمائی کہ جو لغو کاموں سے اعراض کرنے والے ہیں۔ ان دونوں صفات کا تفصیلی بیان گزشتہ جمعوں میں ہو چکا۔ فلاح یافتہ مؤمنوں کا تیسرا وصف یہ بیان فرمایا:

﴿وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ○﴾

''فلاح یافتہ مؤمن وہ ہیں جو زکوٰۃ ادا کرنے والے ہیں''

زکوٰۃ کے دو معنی

مفسرین نے اس آیتِ کریمہ کے دو مطلب بیان فرمائے ہیں۔ ایک یہ ہے کہ اس سے مراد فریضۂ زکوٰۃ کی ادائیگی ہے اور دوسرا مطلب بعض مفسرین نے یہ بیان فرمایا ہے کہ یہاں ''زکوٰۃ'' کے وہ مشہور معنی مراد نہیں ہیں بلکہ اس کے معنی ہیں ''اپنے اخلاق کو پاک صاف کرنا''

عربی زبان میں ''زکوٰۃ'' کے معنی ہیں ''کسی بھی چیز کو گندگی سے، آلائشوں سے، اور نجاست سے پاک کرنا''، زکوٰۃ کو بھی زکوٰۃ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ وہ انسان کے مال کو پاک کر دیتی ہے، جس مال کی زکوٰۃ نہ دی جائے وہ مال گندا ہے اور ناپاک ہے۔

بہرحال، بعض حضرات نے فرمایا کہ اس آیت میں زکوٰۃ کے معنی ہیں ''اپنے اخلاق کو پاک کرنا'' برے اخلاق سے اپنے آپ کو بچانا، لیکن یہ کام کہ اپنے آپ کو اچھے اخلاق سے مزین کیا جائے

☆ اصلاحی خطبات (۱۴/۲۸۶ تا ۲۹۸)، بعد از نمازِ عصر، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی

(۱) المؤمنون: ۱ تا ٤

اور برے اخلاق سے بچایا جائے، یہ ایک عمل چاہتا ہے، اسی وجہ سے اس آیت میں فرمایا:

﴿وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ۝﴾

یعنی جو لوگ اپنے آپ کو بُرے اخلاق سے بچانے کے عمل سے گزرتے ہیں اور اپنے اخلاق کو پاک کر لیتے ہیں۔ بہر حال اس آیتِ کریمہ کی یہ دو تفسیریں ہیں۔

زکوٰۃ کی اہمیت

آج اس آیت کے مشہور معنی کے اعتبار سے تفسیر عرض کرتا ہوں، یعنی وہ لوگ جو زکوٰۃ ادا کرتے ہیں۔ ہر مسلمان جانتا ہے کہ ''زکوٰۃ'' اسلام کے پانچ ستونوں میں سے ایک ستون ہے اور ارکان اور فرائض میں سے ہے اور جس طرح نماز فرض ہے، اسی طرح زکوٰۃ بھی فرض ہے۔ قرآن کریم نے بیشمار مواقع پر زکوٰۃ کو نماز کے ساتھ ملا کر بیان فرمایا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

﴿وَأَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ﴾ (۱)

''نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو''

ان آیات کے ذریعہ اس طرف اشارہ فرمایا کہ جس طرح نماز کی ادائیگی انسان کے لئے فرض اور ضروری ہے، اسی طرح زکوٰۃ کی ادائیگی بھی انسان کے لئے اتنے ہی درجے میں فرض اور ضروری ہے، نماز اگر بدنی عبادت ہے جس کو انسان اپنے جسم کے ذریعہ ادا کرتا ہے تو زکوٰۃ ایک مالی عبادت ہے جس کو انسان اپنے مال سے ادا کرتا ہے۔

زکوٰۃ ادا نہ کرنے پر وعید

اس کے چھوڑنے پر قرآن و حدیث میں بے شمار وعیدیں آئی ہیں۔ چنانچہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيْمٍ۝ يَّوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِأَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ۝﴾ (۲)

یعنی جو لوگ سونے اور چاندی کا ذخیرہ کر کے جمع کر کے رکھتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے راستہ میں اس کو خرچ نہیں کرتے یعنی جہاں اللہ تعالیٰ نے خرچ کرنے کا حکم دیا ہے، وہاں خرچ نہیں کرتے، مثلاً زکوٰۃ کی ادائیگی اور صدقۃ الفطر کی ادائیگی اور قربانی کرنے کا جو حکم دیا ہے اور اسی طرح غریبوں اور

(۱) البقرۃ:۴۳ (۲) التوبۃ: ۳۴-۳۵

مسکینوں کی مدد کرنے کا جو حکم دیا ہے، ان احکام پر عمل نہیں کرتے تو ایسے لوگوں کو دردناک عذاب کی خوشخبری سنا دیجئے کہ ان کو دردناک عذاب ہونے والا ہے۔ پھر اگلی آیت میں اس عذاب کی تفصیل بیان فرمائی کہ جس مال کو اور سونے چاندی کو انہوں نے جمع کیا تھا، اس کو جہنم کی آگ میں تپایا جائے گا اور پھر ان کی پیشانیاں اس مال سے داغی جائیں گی۔ جیسے لوہے کو آگ پر گرم کیا جاتا ہے اور وہ انگارہ بن جاتا ہے، اسی طرح ان کے مال اور سونے چاندی کو جہنم کی آگ پر گرم کیا جائے گا اور جب وہ آگ پر انگارہ کی طرح بن جائے گا تو اس کے بعد ان کی پیشانیاں اس سے داغی جائیں گی اور ان کے پہلو اور پشتیں داغی جائیں گی اور ان سے یہ کہا جائے گا کہ یہ وہ مال ہے جو تم نے اپنے پاس جمع کر کے رکھا تھا، آج تم اس مال کا مزہ چکھو جو تم نے جمع کر کے رکھا تھا۔ یہ کتنی سخت وعید ہے جو اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ ادا نہ کرنے والوں کے لئے بیان فرمائی، اس سے پتہ چلا کہ زکوٰۃ کتنا عظیم فریضہ ہے۔

زکوٰۃ، مال کی محبت کم کرنے کا مؤثر ذریعہ

اللہ تعالیٰ نے یہ زکوٰۃ کا فریضہ ایسا رکھا ہے کہ اس کا اصل مقصد تو اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل ہے، لیکن اس کے فائدے بھی بے شمار ہیں، ایک فائدہ یہ ہے کہ جو بندہ زکوٰۃ ادا کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کو مال کی محبت سے محفوظ رکھتا ہے، چنانچہ جس کے دل میں مال کی محبت ہوگی، وہ کبھی زکوٰۃ نہیں نکالے گا، کیونکہ بخل اور مال کی محبت انسان کی بدترین کمزوری ہے اور اس کا علاج اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ کے ذریعہ فرمایا ہے۔

زکوٰۃ کے ذریعے غربت کا خاتمہ

زکوٰۃ کا دوسرا فائدہ یہ ہے کہ اس کے ذریعہ بے شمار غریبوں کو فائدہ پہنچتا ہے۔ میں نے ایک مرتبہ اندازہ لگایا کہ اگر پاکستان کے تمام لوگ ٹھیک ٹھیک زکوٰۃ نکالیں اور اس زکوٰۃ کو صحیح مصرف پر خرچ کریں تو یقیناً پاکستان سے غربت کا خاتمہ ہوسکتا ہے۔ لیکن ہو یہ رہا ہے کہ بہت سے لوگ تو زکوٰۃ نکالتے ہی نہیں اور جو بہت سے لوگ زکوٰۃ نکالتے ہیں تو وہ ٹھیک ٹھیک نہیں نکالتے بلکہ اندازے سے حساب کتاب کے بغیر نکال دیتے ہیں، اور پھر وہ اس کو صحیح مصرف پر خرچ کرنے کا اہتمام بھی نہیں کرتے۔ اس زکوٰۃ کا مصرف براہِ راست غریب لوگ ہیں، اس لئے شریعت نے زکوٰۃ کو بڑے بڑے رفاہی کاموں پر خرچ کرنے کی اجازت نہیں دی، لیکن لوگ اس مسئلے کی پرواہ نہیں کرتے اور زکوٰۃ کو مختلف مصارف پر خرچ کر لیتے ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ زکوٰۃ سے غریبوں کو جو فائدہ پہنچنا چاہئے تھا وہ فائدہ ان کو نہیں پہنچ رہا، اگر ٹھیک ٹھیک حساب کر کے صحیح مصرف پر زکوٰۃ خرچ کی جائے تو چند ہی سال میں ملک کی کایا پلٹ سکتی ہے۔

زکوٰۃ ادا نہ کرنے کے اسباب

لیکن یہ زکوٰۃ جتنا بڑا فریضہ ہے اور جتنے بے شمار اس کے فائدے ہیں، اتنی ہی اس کی طرف سے ہمارے معاشرے میں غفلت برتی جارہی ہے، چنانچہ بہت سے لوگ اس وجہ سے زکوٰۃ ادا نہیں کرتے کہ ان کے دلوں میں اسلام کے فرائض، واجبات اور ارکان کی اہمیت ہی نہیں ہے، جو پیسہ آرہا ہے آنے دو، غنیمت ہے، اور اس کو اپنے اللّے تللّے میں خرچ کرتے رہو، اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو ایسا بننے سے محفوظ رکھے۔ آمین۔ کچھ لوگ ایسے ہیں جو یہ سوچتے ہیں کہ ہم تو دینی کاموں کے لئے پیسے دیتے رہتے ہیں، کبھی کسی کام کے لئے اور کبھی کسی کام کے لئے، لہٰذا ہماری زکوٰۃ تو خود بخود نکل رہی ہے، اب الگ سے زکوٰۃ نکالنے کی کیا ضرورت ہے؟

مسائل سے ناواقفیت

بعض لوگ وہ ہیں جن کو پتہ ہی نہیں کہ زکوٰۃ کس وقت فرض ہوتی ہے، وہ لوگ زکوٰۃ کے احکام سے ناواقف ہیں، ان کو یہ بھی معلوم نہیں کہ زکوٰۃ کس شخص پر فرض ہوتی ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہمارے ذمے زکوٰۃ فرض ہی نہیں ہے، حالانکہ ان پر زکوٰۃ فرض ہے۔ وہ ایسا اس لئے سمجھ رہے ہیں کہ ان کو صحیح مسئلہ معلوم نہیں کہ کس شخص پر زکوٰۃ فرض ہوتی ہے، اس کے نتیجے میں وہ لوگ زندگی بھر زکوٰۃ کی ادائیگی سے محروم رہتے ہیں۔

زکوٰۃ کا نصاب

خوب سمجھ لیں کہ شریعت نے زکوٰۃ کا ایک نصاب مقرر کیا ہے، جس شخص کے پاس وہ نصاب موجود ہوگا اس پر زکوٰۃ فرض ہو جائے گی، اور وہ نصاب ساڑھے باون تولہ چاندی ہے۔ بازار میں ساڑھے باون تولہ چاندی کی قیمت معلوم کرلی جائے، آج کل کے لحاظ سے اس کی قیمت تقریباً چھ ہزار روپے بنتی ہے۔ لہٰذا شریعت کا حکم یہ ہے کہ اگر کسی شخص کے پاس چھ ہزار روپے نقد ہوں یا سونے کی شکل میں ہوں یا چاندی کی شکل میں ہوں یا مالِ تجارت کی شکل میں ہوں، اس شخص پر زکوٰۃ واجب ہو جاتی ہے، بشرطیکہ یہ روپے اس کی ضروریاتِ اصلیہ سے زائد ہوں یعنی روزمرہ کی ضروریات اور اپنے بیوی بچوں پر خرچ کرنے کی ضرورت سے زائد ہوں، البتہ اگر کسی شخص پر قرض ہے تو جتنا قرض ہے، وہ اس زکوٰۃ کے نصاب سے منہا کرلیا جائے گا، مثلاً یہ دیکھا جائے کہ یہ رقم جو ہمارے پاس ہے، اگر اس کو قرض ادا کرنے میں صرف کر دیا جائے تو باقی کتنی رقم بچے گی، اگر باقی چھ ہزار روپے یا اس سے زائد نہ

بچے تو پھر زکوٰۃ واجب نہیں، اور اگر چھ ہزار روپے یا اس سے زائد بچے تو زکوٰۃ واجب ہوگی۔

ضرورت سے کیا مراد ہے؟

بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہمارے پاس چھ ہزار روپے تو ہیں، مگر وہ ہم نے اپنی بیٹی کی شادی کے لئے رکھے ہیں اور شادی کرنا ضرورت میں داخل ہے، لہٰذا اس رقم پر زکوٰۃ واجب نہیں۔ یہ خیال غلط ہے، اس لئے کہ ضرورت سے مراد زندگی کی روزمرہ کی کھانے پینے کی ضرورتیں ہیں، یعنی اگر وہ ان روپوں کو خرچ کردے گا تو اس کے پاس کھانے پینے کے لئے کچھ نہیں بچے گا، اپنے بیوی بچوں کو کھلانے کے لئے کچھ باقی نہیں رہے گا، لیکن جو رقم دوسرے منصوبوں کے لئے رکھی ہے مثلاً بیٹیوں کی شادی کرنی ہے یا مکان بنانا ہے یا گاڑی خریدنی ہے اور اس کے واسطے رقم جمع کر کے رکھی ہے تو وہ رقم ضرورت سے زائد ہے، اس پر زکوٰۃ واجب ہے۔

زکوٰۃ سے مال کم نہیں ہوتا

بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہم نے تو یہ پیسے بیٹی کی شادی کے لئے رکھے ہیں، اب اگر اس میں سے زکوٰۃ ادا کریں گے تو وہ رقم ختم ہو جائے گی۔ یہ کہنا درست نہیں ہے۔ اس لئے کہ زکوٰۃ تو بہت معمولی سی یعنی اڑھائی فیصد اللہ تعالیٰ نے فرض فرمائی ہے یعنی ایک ہزار پر پچیس روپے فرض کیے ہیں، لہٰذا اگر کسی کے پاس چھ ہزار روپے ہیں تو اس پر صرف ڈیڑھ سو روپے زکوٰۃ فرض ہوگی جو بہت معمولی مقدار ہے اور پھر اللہ تعالیٰ نے یہ نظام ایسا بنایا ہے کہ جو بندہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے زکوٰۃ ادا کرتا ہے تو اس کے نتیجے میں وہ مفلس نہیں ہوتا، بلکہ زکوٰۃ ادا کرنے کے نتیجے میں اس کے مال میں برکت ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ اس کو اور زیادہ عطاء فرماتے ہیں۔ حدیث شریف میں جناب رسول اللہ ﷺ نے ایک خوبصورت جملہ ارشاد فرمایا ہے:

((مَا نَقَصَتْ صَدَقَةٌ مِنْ مَالٍ)) (۱)

''کوئی صدقہ اور کوئی زکوٰۃ کسی مال میں کمی نہیں کرتی''

مطلب یہ ہے کہ انسان زکوٰۃ کی مد میں جتنا خرچ کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کو اتنا ہی مال اور عطا فرماتے ہیں اور کم از کم یہ تو ہوتا ہی ہے کہ جتنا مال موجود ہے، اس میں اللہ تعالیٰ اتنی برکت عطا فرماتے

(۱) صحيح مسلم، كتاب البر والصلة والآداب، باب استباب العفو والتواضع، رقم: ٤٦٨٩، سنن الترمذي، كتاب البر والصلة عن رسول الله، باب ما جاء في التواضع، رقم: ١٩٥٢، مسند أحمد، رقم: ٦٩٠٨، مؤطا مالك، كتاب الجامع، باب ما جاء في التعفف عن المسألة، رقم: ١٥٩٠

ہیں کہ وہ کام جو ہزاروں میں نکلنا چاہئے تھا، سینکڑوں میں نکل جاتا ہے۔

مال جمع کرنے اور گننے کی اہمیت

آج ہماری دنیا مادہ پرستی کی دنیا ہے، اس مادہ پرستی کی دنیا میں ہر کام کا فیصلہ گنتی سے کیا جاتا ہے۔ ہر وقت انسان یہ گنتا رہتا ہے کہ میرے پاس کتنے پیسے ہیں، کتنے پیسے آئے اور کتنے پیسے چلے گئے۔ جس کو قرآن کریم میں اس طرح بیان فرمایا ہے:

﴿جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ﴾(۱) ''مال جمع کرتا ہے اور گنتا رہتا ہے''

لہٰذا آج گنتی کا دور ہے۔ یہ دیکھتے ہیں کہ کتنی گنتی بڑھی اور کتنی گھٹ گئی۔ لیکن کوئی اللہ کا بندہ یہ نہیں دیکھتا کہ زکوٰۃ ادا کرنے کے نتیجے میں گنتی گھٹنے کے باوجود اللہ تعالیٰ نے اس تھوڑے مال میں کتنا کام نکال دیا اور اگر زکوٰۃ ادا نہ کرنے کے نتیجے میں گنتی بڑھ گئی تو اس بڑھے ہوئے مال کے نتیجے میں کتنی بے برکتی آگئی، کتنے مسائل کھڑے ہوگئے اور کتنی مصیبتوں کا سامنا ہوگیا۔ یہ اللہ تعالیٰ کا نظام ہے کہ جو بندہ زکوٰۃ ادا کرتا ہے، اس کے مال میں کمی نہیں ہوتی۔

فرشتے کی دعا کے مستحق کون؟

ایک حدیث میں حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک فرشتہ مقرر ہے جو مسلسل یہ دعا کرتا رہتا ہے:

((اَللّٰھُمَّ أَعْطِ مُنْفِقًا خَلَفًا وَأَعْطِ مُمْسِكًا مَالًا تَلَفًا))(۲)

''اے اللہ! جو شخص اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے والا ہو اور جو صدقہ خیرات کرنے والا ہو، اس کو اس کے مال کا دنیا ہی میں بدلہ عطا فرمایئے''

آخرت میں اس کو عظیم ثواب ملنا ہی ہے لیکن وہ فرشتہ دعا کرتا ہے کہ اے اللہ! اس کو دنیا میں بھی بدلہ عطا فرمایئے اور جو شخص اپنا مال کھینچ کر اور چھپا کر رکھتا ہے تاکہ مجھے خرچ نہ کرنا پڑے، اے اللہ! اس کے مال پر بربادی ڈالئے اور اس کے مال کو ہلاک فرمایئے۔ لہٰذا یہ سوچنا کہ ہم نے تو فلاں مقصد کے لئے یہ پیسے رکھے ہیں اور وہ مقصد بھی ضروری ہے، وہ مقصد بیٹی کی شادی ہے، گھر بنانا ہے، گاڑی خریدنی ہے، اگر ہم نے زکوٰۃ دیدی تو وہ پیسے کم ہو جائیں گے، یہ خیال درست نہیں، بلکہ اگر تم

(۱) الھمزہ:۲ (۲) صحیح البخاری، کتاب الزکاۃ، باب قول اللہ تعالی فأما من أعطی......الخ، رقم: ۱۳۵۱، صحیح مسلم، کتاب الزکاۃ، باب فی المنفق والممسك، رقم: ۱۶۷۸، مسند أحمد، رقم: ۷۷۰۹

نے زکوٰۃ دیدی اور اس کے ذریعہ ظاہری طور پر کچھ کمی بھی آ گئی تو یہ کمی تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچائے گی بلکہ اس کے بدلے میں اللہ تعالیٰ اور دیدیں گے اور جو مال بچا ہے، اس میں برکت عطا فرمائیں گے اور زکوٰۃ ادا کرنے کی وجہ سے انشاء اللہ تمہارا کام نہیں رکے گا۔

زکوٰۃ کی وجہ سے کوئی شخص فقیر نہیں ہوتا

آج تک کسی شخص کا کام زکوٰۃ ادا کرنے کی وجہ سے نہیں رکا بلکہ میں چیلنج کر کے کہتا ہوں کہ کوئی شخص آج تک زکوٰۃ ادا کرنے کی وجہ سے مفلس نہیں ہوا، کوئی شخص ایک مثال بھی پیش نہیں کر سکتا کہ کوئی شخص زکوٰۃ ادا کرنے کی وجہ سے مفلس ہو گیا ہو، لہٰذا یہ جو لوگوں میں یہ مشہور ہے کہ جو رقم حج کے لئے رکھی ہوئی ہو، اس پر زکوٰۃ فرض نہیں، یہ بات غلط ہے، کوئی رقم کسی بھی مقصد کے لئے رکھی ہے اور وہ رقم تمہاری روزمرہ کی ضروریات سے فاضل ہے تو اس پر زکوٰۃ واجب ہے۔

زیور پر زکوٰۃ فرض ہے

اگر کسی شخص کے پاس نقد رقم تو نہیں ہے لیکن اس کے پاس زیور کی شکل میں سونا یا چاندی ہے تو اس پر بھی زکوٰۃ واجب ہے۔ اکثر و بیشتر گھروں میں اتنا زیور ہوتا ہے جو نصابِ زکوٰۃ کی مقدار کو پہنچ جاتا ہے، لہٰذا جس کی ملکیت میں وہ زیور ہے، چاہے وہ شوہر ہو یا بیوی ہو یا بیٹا اور بیٹی ہو اس پر زکوٰۃ واجب ہے۔ اگر شوہر کی ملکیت میں ہے تو شوہر پر زکوٰۃ واجب ہے اور اگر بیوی کی ملکیت میں ہے تو بیوی پر زکوٰۃ واجب ہے۔ آجکل ملکیت کا معاملہ بھی صاف نہیں ہوتا اور یہ معلوم نہیں ہوتا کہ یہ زیور کس کی ملکیت ہے؟ شریعت نے اس بات کا حکم دیا ہے کہ ہر بات صاف اور واضح ہونی چاہئے۔ لہٰذا یہ بات بھی واضح ہونی چاہئے کہ یہ زیور کس کی ملکیت ہے؟ شوہر کی ملکیت ہے یا بیوی کی ملکیت ہے؟ اگر اب تک واضح نہیں تھی تو اب واضح کر لو کہ کس کی ملکیت ہے؟ جس کی ملکیت ہے اس پر زکوٰۃ واجب ہے۔

شاید آپ پر زکوٰۃ فرض ہو

بہرحال نصابِ زکوٰۃ کے بارے میں یہ شریعت کا دستور ہے، اگر اس کو سامنے رکھتے ہوئے دیکھا جائے تو یہ نظر آئے گا کہ بہت سے لوگوں پر زکوٰۃ فرض ہے، مگر وہ یہ سمجھ رہے ہیں کہ ہم پر زکوٰۃ فرض نہیں ہے، اس وجہ سے وہ لوگ زکوٰۃ کے فریضے کی ادائیگی سے محروم رہتے ہیں۔ یہ نصابِ زکوٰۃ سے متعلق مختصر مسئلہ تھا، اگر زندگی باقی رہی تو تفصیل انشاء اللہ آئندہ جمعہ میں عرض کروں گا۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.

زکوٰۃ کے چند اہم مسائل ☆

أَمَّا بَعْدُ! فَأَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ o بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ o
﴿قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ o﴾ (۱)

بزرگانِ محترم و برادرانِ عزیز! گذشتہ چند جمعوں سے ان آیات پر بیان ہو رہا ہے، ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے فلاح یافتہ مؤمنوں کی صفات بیان فرمائی ہیں، ان میں سے دو صفات کا تفصیلی بیان ہو چکا، تیسری صفت کا بیان چل رہا ہے کہ فلاح یافتہ مؤمن وہ ہیں جو زکوٰۃ ادا کرتے ہیں، زکوٰۃ کی اہمیت اور زکوٰۃ ادا نہ کرنے پر وعید اور زکوٰۃ کے نصاب کے بارے میں گزشتہ جمعہ کو تفصیل سے عرض کر دیا تھا، آج زکوٰۃ کے بارے میں چند مسائل بیان کرنے کا ارادہ ہے جن سے ناواقفیت کی وجہ سے ہم لوگ اس فریضے کو صحیح طریقے پر ادا نہیں کر رہے ہیں۔

مالکِ نصاب پر زکوٰۃ واجب ہے

یہاں یہ مسئلہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو اس کی ملکیت کا مکلّف بنایا ہے، ہر انسان پر اس کی ملکیت کے حساب سے احکام جاری ہوتے ہیں، مثلاً اگر باپ صاحبِ نصاب ہے تو اس پر زکوٰۃ اس کی ملکیت کے حساب سے واجب ہے، اگر بیٹا بھی صاحبِ نصاب ہے تو بیٹے پر اس کے مال کی زکوٰۃ واجب ہے، اگر شوہر صاحبِ نصاب ہے اور بیوی بھی صاحبِ نصاب ہے تو شوہر پر اس کے مال کی زکوٰۃ واجب ہے اور بیوی پر اس کے مال کی زکوٰۃ واجب ہے، ہر ایک کی ملکیت کا الگ الگ اعتبار ہے۔

☆ اصلاحی خطبات (۱۴/۳۰۱ تا ۳۱۲) بعد از نماز عصر، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی،

(۱) المؤمنون: ۱۔۴

باپ کی زکوٰۃ بیٹے کے لئے کافی نہیں

بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ گھر کا جو بڑا اور سربراہ ہے، چاہے وہ باپ ہو یا شوہر ہو، اگر اس نے زکوٰۃ نکال دی تو سب کی طرف سے زکوٰۃ ادا ہوگئی، اب گھر کے دوسرے افراد کو زکوٰۃ ادا کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ بات درست نہیں، اس لئے کہ جس طرح باپ کے نماز پڑھ لینے سے بیٹے کی نماز ادا نہیں ہوتی بلکہ بیٹے کو اپنی نماز الگ پڑھنی ہوگی اور جس طرح شوہر کے نماز پڑھ لینے سے بیوی کی نماز ادا نہیں ہوتی بلکہ بیوی کو اپنی نماز الگ پڑھنی ہوگی، اسی طرح زکوٰۃ کا حکم یہ ہے کہ گھر کے اندر جو شخص بھی صاحبِ نصاب ہے، چاہے وہ باپ ہے، بیٹا ہے، بیٹی ہے، بیوی ہے، شوہر ہے، سب پر اپنی اپنی ملکیت کے حساب سے الگ الگ زکوٰۃ واجب ہوگی۔

مال پر سال گزرنے کا مسئلہ

ایک اور مسئلہ جس میں لوگوں کو بکثرت غلط فہمی رہتی ہے، وہ مسئلہ یہ ہے کہ زکوٰۃ اس وقت فرض ہوتی ہے جب مال پر سال گزر جائے، سال گزرنے سے پہلے زکوٰۃ فرض نہیں ہوتی۔ عام طور پر لوگ اس مسئلہ کا یہ مطلب سمجھتے ہیں کہ ہر ہر مال پر الگ الگ سال گزرنا ضروری ہے، حالانکہ یہ مطلب نہیں ہے، بلکہ سال گزرنے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی سارے سال صاحبِ نصاب رہے۔ مثلاً کسی شخص کے پاس یکم رمضان المبارک کو دس ہزار روپے آگئے، اب یہ شخص صاحبِ نصاب ہوگیا، اب اگر سال کے اکثر حصے میں اس کے پاس ان میں سے چھ ہزار روپے موجود رہے ہیں یا چھ ہزار روپے کی مالیت کا زیور رہا ہے، یا مالِ تجارت رہا ہے تو وہ صاحبِ نصاب ہے، اگر درمیانِ سال میں اس کے پاس اور روپے آگئے تو اس پر علیحدہ سے مکمل سال کا گزرنا ضروری نہیں ہے، بلکہ اگلے رمضان کی پہلی تاریخ کو جتنی رقم یا زیور یا مالِ تجارت ہوگا، اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

دو دن پہلے آنے والے مال میں زکوٰۃ

مثلاً یکم رمضان سے دو دن پہلے اس کے پاس دس ہزار روپے مزید آگئے تو اب یکم رمضان کو اس دس ہزار روپے میں بھی زکوٰۃ واجب ہو جائے گی، اس پر علیحدہ سے سال گزرنا ضروری نہیں ہے، کیونکہ وہ شخص پورے سال صاحبِ نصاب رہا ہے، اس لئے اگر درمیان میں کوئی اضافہ ہو جائے تو اس پر الگ سے سال گزرنا ضروری نہیں۔

زکوٰۃ کن چیزوں میں فرض ہوتی ہے؟

ایک مسئلہ یہ ہے کہ کن چیزوں میں زکوٰۃ فرض ہوتی ہے؟ زکوٰۃ ان چیزوں میں فرض ہوتی ہے:

(۱) نقد روپیہ، چاہے بینک میں ہو یا گھر پر ہو، اس پر زکوٰۃ فرض ہے۔

(۲) سونے چاندی اور زیور پر بھی زکوٰۃ فرض ہے، چاہے زیور استعمال ہو رہا ہو یا یونہی رکھا ہوا ہو، اور وہ زیور جس کی ملکیت میں ہوگا اسی پر زکوٰۃ فرض ہوگی۔

اس معاملے میں بھی ہمارے معاشرے میں بڑی بدنظمی پائی جاتی ہے، گھر میں خاتون کے پاس جو زیور ہوتا ہے، اس کے بارے میں یہ واضح نہیں ہوتا کہ یہ کس کی ملکیت ہے؟ کیا وہ عورت کی ملکیت ہے یا شوہر کی ملکیت ہے؟ شرعی اعتبار سے اس کو واضح کرنا ضروری ہے۔

زیور کس کی ملکیت ہوگا؟

مثلاً شادی کے موقع پر عورت کو جو زیور چڑھایا جاتا ہے، اس میں سے کچھ زیور لڑکی والوں کی طرف سے چڑھایا جاتا ہے اور کچھ زیور لڑکے والوں کی طرف سے چڑھایا جاتا ہے۔ اس کا قاعدہ یہ ہے کہ جو زیور لڑکی والوں کی طرف سے چڑھایا جاتا ہے، وہ سو فیصد لڑکی کی ملکیت ہوتا ہے اور لڑکی ہی پر اس کی زکوٰۃ فرض ہے اور جو زیور لڑکے والوں کی طرف سے چڑھایا جاتا ہے، وہ دلہن کی ملکیت نہیں ہوتا بلکہ وہ ایک طرح سے عاریتاً دیا جاتا ہے، اس کا مالک لڑکا ہوتا ہے، لہٰذا اس زیور کی زکوٰۃ بھی اسی پر فرض ہوگی، البتہ اگر لڑکا اپنی بیوی سے یہ کہہ دے کہ میں نے تمہیں یہ زیور دے دیا، تم اس کی مالک ہو، تو اب زیور عورت کی ملکیت میں آجائے گا اور اس کی زکوٰۃ عورت ہی پر فرض ہوگی۔ لہٰذا اس کو واضح کرنے کی ضرورت ہے کہ گھر میں جو زیور ہے، وہ کس کی ملکیت ہے؟ اس کی وضاحت نہ ہونے کی وجہ سے بعد میں جھگڑے بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ جو زیور شوہر کی ملکیت ہے، اس کی زکوٰۃ شوہر پر فرض ہوگی اور جو زیور عورت کی ملکیت ہے، اس کی زکوٰۃ عورت پر فرض ہے۔

زیور کی زکوٰۃ ادا کرنے کا طریقہ

زیور کی زکوٰۃ ادا کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ زیور کا وزن کرلیا جائے، چونکہ زکوٰۃ سونے کے وزن پر فرض ہوتی ہے، اس لئے اگر زیور میں موتی لگے ہوئے ہیں یا کوئی اور دھات اس کے اندر شامل

ہے تو وہ وزن میں شامل نہیں ہوں گے، لہٰذا خالص سونا دیکھا جائے کہ اس زیور میں کتنا سونا ہے؟ پھر اس وزن کو کسی جگہ لکھ کر محفوظ کرلیا جائے کہ فلاں زیور کا اتنا وزن ہے۔ پھر جس تاریخ میں زکوٰۃ کا حساب کیا جائے مثلاً یکم رمضان کو زکوٰۃ کی تاریخ مقرر کی ہوئی ہے تو اب یکم رمضان کو بازار سے سونے کی قیمت معلوم کی جائے کہ آج بازار میں سونے کی کیا قیمت ہے؟ قیمت معلوم کرنے کے بعد اس کا حساب نکالا جائے کہ اس زیور میں کتنی مالیت کا سونا ہے، اس مالیت پر اڑھائی فیصد کے حساب سے زکوٰۃ نکالی جائے، مثلاً اگر اس سونے کی مالیت ایک ہزار روپے ہے تو اس پر ۲۵ روپے زکوٰۃ واجب ہوگی اور اگر دو ہزار ہے تو ۵۰ روپے واجب ہوگی اور اگر چار ہزار روپے ہے تو سو روپے زکوٰۃ واجب ہوگی، اس طرح حساب کر کے اڑھائی فیصد زکوٰۃ ادا کردی جائے۔ سونے کی قیمت اس دن کی معتبر ہوگی جس دن آپ زکوٰۃ کا حساب کر رہے ہیں، جس دن آپ نے سونا خریدا تھا، اس دن کی قیمتِ خرید معتبر نہیں ہوگی۔

مالِ تجارت میں زکوٰۃ

(۳) تیسری چیز جس میں زکوٰۃ فرض ہوتی ہے، وہ مالِ تجارت ہے۔

مثلاً کسی شخص نے کوئی دکان کھولی ہوئی ہے، اب اس دکان میں جتنا مال رکھا ہے، اس کی قیمت لگائی جائے گی اور قیمت اس طرح لگائی جائے گی کہ اگر اس کا پورا سامان آج ایک ساتھ فروخت کیا جائے تو اس کی کیا قیمت لگے گی، بس قیمت کا ڈھائی فیصد زکوٰۃ میں ادا کرنا ہوگا۔

کمپنی کے شیئرز میں زکوٰۃ

اگر کسی شخص نے کسی کمپنی کے شیئرز خریدے ہوئے ہیں تو وہ شیئرز بھی مالِ تجارت میں داخل ہیں، لہٰذا ان شیئرز کی جو بازاری قیمت ہے، اس قیمت کا اڑھائی فیصد زکوٰۃ کے طور پر ادا کرنا ہوگا۔ آجکل کمپنیاں خود شیئرز کی زکوٰۃ کاٹ لیتی ہیں، لیکن وہ کمپنیاں شیئرز کی اصل قیمت پر زکوٰۃ کاٹتی ہیں، بازاری قیمت پر نہیں کاٹتیں، مثلاً ایک کمپنی کے شیئرز کی اصل قیمت دس روپے ہے اور بازار میں اس کی قیمت پچاس روپے ہے، اب کمپنی تو دس روپے کے حساب سے زکوٰۃ کاٹ لے گی لیکن درمیان میں چالیس روپے کا جو فرق ہے، اس کی زکوٰۃ شیئرز ہولڈر کو خود ادا کرنی ضروری ہے۔

مکان یا پلاٹ میں زکوٰۃ

اگر کسی شخص نے کوئی مکان یا پلاٹ فروخت کرنے کی نیت سے خریدا ہے، اس میں بھی زکوٰۃ

واجب ہے۔ یعنی اس نیت سے خریدا ہے کہ میں اس پلاٹ کو فروخت کر کے اس سے نفع کماؤں گا، تو اس مکان اور پلاٹ کی مالیت میں بھی زکوٰۃ واجب ہوگی، لیکن اگر کسی شخص نے کوئی مکان یا پلاٹ فروخت کرنے کی نیت سے نہیں خریدا بلکہ رہائش کی نیت سے خریدا ہے یا اس نیت سے خریدا ہے کہ میں اس مکان کو کرایہ پر دے کر اس سے آمدنی حاصل کروں گا تو اس صورت میں مکان کی مالیت پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، البتہ جو کرایہ آئے گا وہ نقدی میں شامل ہو کر اس پر اڑھائی فیصد کے حساب سے زکوٰۃ ادا کی جائے گی۔

خام مال میں زکوٰۃ

بہر حال بنیادی طور پر تین چیزوں میں زکوٰۃ واجب ہوتی ہے: (۱) نقدی (۲) زیور (۳) مالِ تجارت

مالِ تجارت میں خام مال بھی شامل ہوگا، مثلاً اگر کسی کمپنی کے اندر خام مال پڑا ہوا ہے تو زکوٰۃ کا حساب جس دن کیا جائے گا، اس دن اس خام مال کی قیمت لگا کر اس کی زکوٰۃ بھی ادا کرنی ضروری ہوگی اور جو مال تیار ہے، اس پر بھی زکوٰۃ واجب ہوگی۔

بیٹے کی طرف سے باپ کا زکوٰۃ ادا کرنا

لیکن اگر زکوٰۃ گھر کے تین افراد پر الگ الگ فرض ہے اور ان میں کوئی ایک دوسرے کو اجازت دیدے کہ میں آپ کو اجازت دیتا ہوں کہ آپ میری طرف سے زکوٰۃ ادا کر دیں، پھر وہ دوسرا شخص اس کی طرف سے زکوٰۃ ادا کر دے، چاہے اپنے پیسوں سے ادا کر دے تب بھی زکوٰۃ ادا ہو جائے گی۔ مثلاً ایک شخص کے تین بیٹے بالغ ہیں اور تینوں صاحبِ نصاب ہیں، یعنی تینوں بیٹوں کی ملکیت میں ساڑھے باون تولہ چاندی کی قیمت کے برابر قابلِ زکوٰۃ اثاثے موجود ہیں، لہٰذا تینوں بیٹوں میں سے ہر ایک پر علیحدہ علیحدہ زکوٰۃ فرض ہے اور باپ پر صاحبِ نصاب ہونے کی وجہ سے علیحدہ زکوٰۃ فرض ہے، لیکن اگر باپ اپنے بیٹوں کی طرف سے زکوٰۃ ادا کرنا چاہے تو کر سکتا ہے، بشرطیکہ بیٹوں کی طرف سے اجازت ہو، اجازت کے بعد اگر باپ ان کی طرف سے زکوٰۃ ادا کر دے تو ان کی زکوٰۃ ادا ہو جائے گی۔

بیوی کی طرف سے شوہر کا زکوٰۃ ادا کرنا

اسی طرح اگر شوہر بھی صاحبِ نصاب ہے اور بیوی بھی صاحبِ نصاب ہے، کیونکہ اس کے

پاس اتنا زیور ہے جو نصابِ زکوٰۃ کے برابر یا اس سے زیادہ ہے، لیکن بیوی کے پاس زکوٰۃ ادا کرنے کے لئے پیسے نہیں ہیں، اب وہ بیوی شوہر کو زکوٰۃ ادا کرنے پر مجبور تو نہیں کر سکتی لیکن اگر شوہر یہ کہے کہ تمہاری زکوٰۃ میں ادا کر دیتا ہوں اور بیوی اس کو اجازت دیدے اور پھر شوہر اپنے پیسوں سے اس کی زکوٰۃ ادا کر دے تو بیوی کی زکوٰۃ بھی ادا ہو جائے گی۔ البتہ اگر شوہر بخیل ہے اور بیوی کی طرف سے زکوٰۃ ادا کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا، تب بھی بیوی پر اپنے مال کی زکوٰۃ ادا کرنا فرض ہوگا، چاہے زکوٰۃ کی ادائیگی کے لئے اس کو اپنا زیور ہی کیوں نہ فروخت کرنا پڑے۔

زیور کی زکوٰۃ نہ نکالنے پر وعید

حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ حضورِ اقدس ﷺ گھر میں تشریف لائے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو دیکھا تو ان کے ہاتھ کی انگلیوں میں چاندی کی انگوٹھیاں نظر آئیں۔ آپ نے ان سے پوچھا کہ یہ انگوٹھیاں کہاں سے آئیں؟

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ! میں نے یہ کہیں سے حاصل کی ہیں، اس لئے کہ یہ مجھے اچھی لگ رہی تھیں۔

حضورِ اقدس ﷺ نے ان سے پوچھا کہ کیا تم اس کی زکوٰۃ نکالتی ہو؟

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ! میں نے اس کی زکوٰۃ نہیں نکالی۔

آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر تم یہ چاہتی ہو کہ اس کے بدلے تمہیں آخرت میں آگ کی انگوٹھیاں پہنائی جائیں تو بیشک اس کی زکوٰۃ نہ نکالو، لیکن اگر آگ کی انگوٹھیاں پہننے سے بچنا ہے تو اس کی زکوٰۃ ادا کرو۔ (۱)

حضورِ اقدس ﷺ نے زیور کی زکوٰۃ کے بارے میں اتنی تاکید فرمائی ہے، لہٰذا خواتین کو زیور کی زکوٰۃ ادا کرنے کا بہت اہتمام کرنا چاہئے بشرطیکہ وہ زیور ان کی ملکیت ہو۔

عورت کی ملکیت میں زیور ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ زیور یا تو اس نے اپنے پیسوں سے خریدا ہو یا کسی نے اس کو ہدیہ میں دیا ہو یا وہ شادی کے موقع پر اپنی ماں کے گھر سے لائی ہو یا شوہر وہ زیور مہر کے طور پر بیوی کی ملکیت میں دیدے، مثلاً مہر پچاس ہزار روپے تھا اور شادی کے موقع پر شوہر کی طرف سے زیور چڑھایا گیا، لیکن چونکہ اس وقت کوئی وضاحت شوہر نے نہیں کی تھی، اس لئے وہ زیور شوہر کی ملکیت میں تھا، اب اگر وہ شوہر یہ کہہ دے کہ میں نے شادی کے موقع پر جو زیور چڑھایا ہے، وہ میں تمہیں مہر کے طور پر دیتا ہوں، یہ تمہارا مہر کا حصہ ہے تو اس صورت میں اس زیور کے ذریعہ

(۱) سنن أبی داؤد، کتاب الزکاۃ، باب الکنز ما هو وزکاۃ الحلی، رقم: ۱۳۳۸

مہر ادا ہو جائے گا اور بیوی اس زیور کی مالک بن جائے گی، اب اس زیور کی زکوٰۃ بیوی پر فرض ہوگی، شوہر پر فرض نہیں ہوگی، اب بیوی کو اختیار ہے کہ جو چاہے کرے، چاہے خود پہنے یا فروخت کردے یا کسی کو دیدے، شوہر کو اجازت نہیں کہ وہ بیوی کو ان کاموں سے روکے، اس لئے کہ وہ زیور اب اس کی ملکیت میں آچکا ہے۔

بہرحال ہر چیز کا یہی حکم ہے کہ جو شخص جس چیز کا مالک ہے، اس کی زکوٰۃ بھی اسی پر فرض ہوگی، البتہ اگر دوسرا شخص اس کی اجازت سے رضاکارانہ طور پر اس کی طرف سے زکوٰۃ دیدے تو زکوٰۃ ادا ہو جائے گی، مثلاً بیوی کی طرف سے شوہر دیدے یا اولاد کی طرف سے باپ دیدے، بشرطیکہ اجازت ہو، بغیر اجازت کے زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی، اس لئے کہ یہ اس کا اپنا فریضہ ہے۔

آج ہمارے معاشرے میں زکوٰۃ کے مسائل سے ناواقفیت بہت پھیلی ہوئی ہے، اس کی وجہ سے یہ ہو رہا ہے کہ بہت سے لوگ زکوٰۃ ادا کرتے ہیں، لیکن بسا اوقات وہ زکوٰۃ صحیح طریقے سے ادا نہیں ہوتی اور اس کے نتیجے میں زکوٰۃ ادا نہ ہونے کا وبال سر پر رہتا ہے۔ اس لئے خدا کے لئے زکوٰۃ کے بنیادی مسائل کو سیکھ لیں۔ یہ کوئی زیادہ مشکل کام نہیں، کیونکہ انسان کے پاس جتنے اثاثے ہیں، ان میں سے صرف تین چیزوں پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے، ایک سونا چاندی پر دوسرے نقد روپے پر اور تیسرے سامانِ تجارت پر، یعنی ہر وہ چیز جو فروخت کرنے کی نیت سے خریدی گئی ہو، اس پر زکوٰۃ واجب ہے، ان کے علاوہ گھر کے اندر جو استعمال کی اشیاء ہیں مثلاً گھر کا فرنیچر، گاڑی، رہائشی مکان، استعمال کے برتن وغیرہ ان پر زکوٰۃ نہیں، البتہ گھر میں یا بینک میں جو رقم رکھی ہے یا گھر میں جو زیور اور سونا چاندی ہے یا کوئی مکان یا پلاٹ فروخت کرنے کی نیت سے خریدا ہے تو ان پر زکوٰۃ واجب ہے، لیکن اگر رہنے کے لئے مکان خریدا ہے تو اس پر زکوٰۃ واجب نہیں۔ بہرحال زکوٰۃ کی ادائیگی کا عمل آسان ہے، زیادہ مشکل نہیں ہے لیکن ذرا سمجھ لینے کی ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو دین کے اس ستون کو صحیح سمجھنے کی بھی توفیق عطا فرمائے اور اس کو ٹھیک ٹھیک ادائیگی کی بھی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.

آپ زکوٰۃ کس طرح ادا کریں؟ ☆

بعد از خطبہ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ! فَأَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ٥ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ٥
﴿وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيْمٍ ٥ يَّوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِأَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ ٥﴾ (۱)

بزرگانِ محترم اور برادرانِ عزیز! آج کا یہ اجتماع اسلام کے ایک اہم رکن یعنی زکوٰۃ کے موضوع پر منعقد کیا گیا ہے، اور رمضان کے مبارک مہینے سے چند روز پہلے یہ اس لئے رکھا گیا ہے کہ عام طور پر لوگ رمضان المبارک کے مہینے میں زکوٰۃ نکالتے ہیں۔ لہٰذا اس اجتماع کا مقصد یہ ہے کہ زکوٰۃ کی اہمیت، اس کے فضائل اور اس کے ضروری احکام اس اجتماع کے ذریعہ ہمارے علم میں آجائیں تا کہ اس کے مطابق زکوٰۃ نکالنے کا اہتمام کریں۔

زکوٰۃ نہ نکالنے پر وعید

اس مقصد کے لئے میں نے قرآن کریم کی دو آیتیں آپ حضرات کے سامنے تلاوت کی ہیں، ان آیاتِ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں پر بڑی سخت وعید بیان فرمائی ہے جو اپنے مال کی کما حقہ زکوٰۃ نہیں نکالتے، ان کے لئے بڑے سخت الفاظ میں عذاب کی خبر دی ہے۔ چنانچہ فرمایا کہ جو لوگ اپنے پاس سونا چاندی جمع کرتے ہیں اور اس کو اللہ کے راستے میں خرچ نہیں کرتے تو (اے نبی ﷺ) آپ ان کو ایک دردناک عذاب کی خبر دے دیجئے۔ یعنی جو لوگ اپنا پیسہ، اپنا روپیہ، اپنا سونا چاندی جمع کرتے جا رہے ہیں اور ان کو اللہ کے راستے میں خرچ نہیں کرتے، ان پر اللہ تعالیٰ نے جو فریضہ عائد کیا

☆ اصلاحی خطبات (۹/۱۲۶ تا ۱۵۴) ۲۸ دسمبر ۱۹۹۷ء، بعد از نماز ظہر، عالمگیر مسجد، کراچی

(۱) التوبة: ۳٤-۳٥

ہے اس کو ادا نہیں کرتے، ان کو یہ خبر سنا دیجئے کہ ایک دردناک عذاب ان کا انتظار کر رہا ہے۔ پھر دوسری آیت میں اس دردناک عذاب کی تفصیل بیان فرمائی کہ یہ دردناک عذاب اس دن ہوگا جس دن اس سونے اور چاندی کو آگ میں تپایا جائے گا اور پھر اس آدمی کی پیشانی، اس کے پہلو اور اس کی پشت کو داغا جائے گا اور اس کو یہ کہا جائے گا:

﴿هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِأَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ٥﴾

''یہ ہے وہ خزانہ جو تم نے اپنے لئے جمع کیا تھا، آج تم خزانے کا مزہ چکھو جو تم اپنے لئے جمع کر رہے تھے''

اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو اس انجام سے محفوظ رکھے۔ آمین۔

یہ ان لوگوں کا انجام بیان فرمایا جو روپیہ پیسہ جمع کر رہے ہیں لیکن اس پر اللہ تعالیٰ نے جو فرائض عائد کیے ہیں ان کو ٹھیک ٹھیک بجا نہیں لاتے۔ صرف ان آیات میں نہیں بلکہ دوسری آیات میں بھی وعیدیں بیان فرمائی گئی ہیں، چنانچہ سورۃ ہمزہ میں فرمایا:

﴿ وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةِ٥ الَّذِىْ جَمَعَ مَالاً وَّعَدَّدَهٗ٥ يَحْسَبُ أَنَّ مَالَهٗ أَخْلَدَهٗ ٥ كَلَّا لَيُنْبَذَنَّ فِى الْحُطَمَةِ ٥ وَمَآ أَدْرٰكَ مَا الْحُطَمَةُ ٥ نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ ٥ الَّتِىْ تَطَّلِعُ عَلَى الْأَفْئِدَةِ٥ ﴾(۱)

''اس شخص کے لئے دردناک عذاب ہے جو عیب نکالنے والا ہے اور طعنہ دینے والا ہے، جو مال جمع کر رہا ہے اور گن گن کر رکھ رہا ہے (ہر روز گنتا ہے کہ آج میرے مال میں کتنا اضافہ ہوگیا ہے اور اس کی گنتی کر کے خوش ہو رہا ہے) اور یہ سمجھتا ہے کہ یہ مال مجھے ہمیشہ کی زندگی عطا کر دے گا، ہرگز نہیں۔ (یاد رکھو! یہ مال جس کو وہ گن گن کر رکھ رہا ہے اور اس پر جو واجبات ہیں ان کو ادا نہیں کر رہا ہے، اس کی وجہ سے) اس کو روندنے والی آگ میں پھینک دیا جائے گا۔ تمہیں کیا پتہ کہ ''حطمۃ'' کیا چیز ہوتی ہے؟ (یہ حطمۃ جس میں اس کو ڈالا جائے گا) یہ ایسی آگ ہے جو اللہ کی سلگائی ہوئی ہے (یہ کسی انسان کی سلگائی ہوئی آگ نہیں ہے جو پانی سے بجھ جائے یا مٹی سے بجھ جائے یا جس کو فائر بریگیڈ بجھا دے بلکہ یہ اللہ کی سلگائی ہوئی آگ ہے) جو انسان کے قلب و جگر تک جھانکتی ہوگی (یعنی انسان کے قلب و جگر تک پہنچ جائے گی)

اتنی شدید وعید اللہ تعالیٰ نے بیان فرمائی ہے، اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو اس سے محفوظ رکھے۔ آمین

(۱) الهمزة: ۱-۷

یہ مال کہاں سے آرہا ہے؟

زکوٰۃ ادا نہ کرنے پر ایسی شدید وعید کیوں بیان فرمائی؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ جو کچھ مال تم اس دنیا میں حاصل کرتے ہو، چاہے تجارت کے ذریعہ حاصل کرتے ہو، چاہے ملازمت کے ذریعہ حاصل کرتے ہو، چاہے کاشت کاری کے ذریعہ حاصل کرتے ہو، یا کسی اور ذریعہ سے حاصل کرتے ہو، ذرا غور کرو کہ وہ مال کہاں سے آرہا ہے؟ کیا تمہارے اندر طاقت تھی کہ تم اپنے زورِ بازو سے وہ مال جمع کر سکتے؟ یہ تو اللہ تعالیٰ کا بنایا ہوا حکیمانہ نظام ہے، وہ اپنے اس نظام کے ذریعہ تمہیں رزق پہنچارہا ہے۔

گاہک کون بھیج رہا ہے؟

تم یہ سمجھتے ہو کہ میں نے مال جمع کرلیا اور دکان کھول کر بیٹھ گیا اور اس مال کو فروخت کردیا تو اس کے نتیجے میں مجھے پیسہ مل گیا، یہ نہ دیکھا کہ جب دکان کھول کر بیٹھ گئے تو تمہارے پاس گاہک کس نے بھیجا؟ اگر تم دکان کھول کر بیٹھے ہوتے اور کوئی گاہک نہ آتا تو اس وقت کوئی بکری ہوتی؟ کوئی آمدنی ہوتی؟ یہ کون ہے جو تمہارے پاس گاہک بھیج رہا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے نظام ہی ایسا بنایا ہے کہ ایک دوسرے کی حاجتیں، ایک دوسرے کی ضرورتیں ایک دوسرے کے ذریعہ پوری کی جاتی ہیں۔ ایک شخص کے دل میں ڈال دیا کہ تم جاکر دکان کھول کر بیٹھو اور دوسرے کے دل میں یہ ڈال دیا کہ اس دکان والے سے خریدو۔

ایک سبق آموز واقعہ

میرے ایک بڑے بھائی تھے جناب محمد ذکی کیفی رحمۃ اللہ علیہ، اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند کرے، آمین، لاہور میں ان کی دینی کتابوں کی ایک دکان "ادارۂ اسلامیات" کے نام سے تھی، اب بھی وہ دکان موجود ہے، وہ ایک مرتبہ کہنے لگے کہ تجارت میں اللہ تعالیٰ اپنی رحمت اور قدرت کے عجیب کرشمے دکھلاتا ہے، ایک دن میں صبح بیدار ہوا تو پورے شہر میں موسلا دھار بارش ہورہی تھی اور بازاروں میں کئی کئی انچ پانی کھڑا تھا، میرے دل میں خیال آیا کہ آج بارش کا دن ہے، لوگ گھر سے نکلتے ہوئے ڈر رہے ہیں، سڑکوں پر پانی کھڑا ہے، ایسے حالات میں کون کتاب خریدنے آئے گا اور کتاب بھی کوئی دنیاوی یا کورس اور نصاب کی نہیں بلکہ دینی کتاب جس کے بارے میں ہمارا حال یہ ہے کہ جب دنیا کی ساری ضرورتیں پوری ہوجائیں تب جاکر یہ خیال آتا ہے کہ چلو کوئی دینی کتاب خرید کر پڑھ لیں، ان

کتابوں سے نہ تو بھوک مٹتی ہے نہ پیاس بجھتی ہے نہ اس سے کوئی دنیا کی ضرورت پوری ہوتی ہے، اور آج کل کے حساب سے دینی کتاب ایک فالتو مد ہے، خیال یہ ہوتا ہے کہ فالتو وقت ملے گا تو دینی کتاب پڑھ لیں گے۔ تو ایسی موسلادھار بارش میں کون دینی کتاب خریدنے آئے گا، لہٰذا آج دکان پر نہ جاؤں اور چھٹی کر لیتا ہوں۔

لیکن چونکہ بزرگوں کے صحبت یافتہ تھے، حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت اُٹھائی تھی، فرمانے لگے کہ اس کے ساتھ ساتھ میرے دل میں دوسرا خیال یہ آیا کہ ٹھیک ہے کوئی شخص کتاب خریدنے آئے یا نہ آئے لیکن اللہ تعالیٰ نے میرے لئے رزق کا یہ ذریعہ مقرر فرمایا ہے، اب میرا کام یہ ہے کہ میں جاؤں، جا کر دکان کھول کر بیٹھ جاؤں، گاہک بھیجنا میرا کام نہیں، کسی اور کا کام ہے، لہٰذا مجھے اپنے کام میں کوتاہی نہ کرنی چاہئے، چاہے بارش ہو رہی ہو یا سیلاب آرہا ہو، مجھے اپنی دکان کھولنی چاہئے۔ چنانچہ یہ سوچ کر میں نے چھتری اُٹھائی اور پانی سے گزرتا ہوا چلا گیا اور بازار جا کر دکان کھول کر بیٹھ گیا اور یہ سوچا کہ آج کوئی گاہک تو آئے گا نہیں، چلو بیٹھ کر تلاوت ہی کر لیں، چنانچہ ابھی میں قرآن شریف کھول کر تلاوت کرنے بیٹھا ہی تھا کہ کیا دیکھتا ہوں کہ لوگ برساتیاں ڈال کر اور چھتریاں تان کر کتابیں خریدنے آرہے ہیں، میں حیران تھا کہ ان لوگوں کو ایسی کونسی ضرورت پیش آگئی ہے کہ اس طوفانی بارش میں اور بہتے ہوئے سیلاب میں میرے پاس آکر ایسی کتابیں خرید رہے ہیں جن کی کوئی فوری ضرورت نہیں۔ لیکن لوگ آئے اور جتنی بکری روزانہ ہوتی تھی اس دن بھی اتنی بکری ہوئی۔ اس وقت دل میں یہ بات آئی کہ یہ گاہک خود نہیں آرہے ہیں، حقیقت میں کوئی اور بھیج رہا ہے، اور یہ اس لئے بھیج رہا ہے کہ اس نے میرے لئے رزق کا سامان ان گاہکوں کو بنایا ہے۔

کاموں کی تقسیم اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے

بہر حال، یہ درحقیقت اللہ تعالیٰ جل شانہٗ کا بنایا ہوا نظام ہے جو تمہارے پاس گاہک بھیج رہا ہے، جو گاہک کے دل میں ڈال رہا ہے کہ تم اس دکان سے جا کر سامان خریدو۔ کیا کسی شخص نے یہ کانفرنس بلائی تھی اور اس کانفرنس میں یہ طے ہوا تھا کہ اتنے لوگ کپڑا فروخت کریں گے، اتنے لوگ جوتے فروخت کریں گے، اتنے لوگ چاول فروخت کریں گے، اتنے لوگ برتن فروخت کریں گے، اور اس طرح لوگوں کی ضروریات پوری کی جائیں گی۔ دنیا میں ایسی کوئی کانفرنس آج تک نہیں ہوئی بلکہ اللہ تعالیٰ نے کسی کے دل میں یہ ڈالا کہ تم کپڑا فروخت کرو، کسی کے دل میں ڈالا کہ تم جوتے فروخت کرو، کسی کے دل میں ڈالا کہ تم روٹی فروخت کرو، کسی کے دل میں یہ ڈالا کہ تم گوشت فروخت کرو، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ دنیا کی کوئی ضرورت ایسی نہیں ہے جو بازار میں نہ ملتی ہو۔ دوسری طرف

خریداروں کے دل میں یہ ڈالا کہ تم جا کر ان سے ضروریات خرید و اور ان کے لئے رزق کا سامان فراہم کرو۔ یہ اللہ تعالیٰ کا بنایا ہوا نظام ہے کہ وہ تمام انسانوں کو اس طرح سے رزق عطا کر رہا ہے۔

زمین سے اُگانے والا کون ہے؟

خواہ تجارت ہو یا زراعت ہو یا ملازمت ہو، دینے والا درحقیقت اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ زراعت کو دیکھئے! زراعت میں آدمی کا کام یہ ہے کہ زمین کو نرم کرکے اس میں بیج ڈال دے اور اس میں پانی دیدے، لیکن اس بیج کو کونپل بنانا، وہ بیج جو بالکل بے حقیقت ہے، جو گنتی میں بھی نہ آئے، جو بے وزن ہے، لیکن اتنی سخت زمین کا پیٹ پھاڑ کر نمودار ہوتا ہے اور کونپل بن جاتا ہے، پھر وہ کونپل بھی ایسی نرم اور نازک ہوتی ہے کہ اگر بچہ بھی اس کو اُنگلی سے مسل دے تو وہ ختم ہو جائے، لیکن وہی کونپل سارے موسموں کی سختیاں برداشت کرتی ہے، گرم اور سرد اور تیز ہواؤں کو سہتی ہے، پھر کونپل سے پودا بنتا ہے، پھر اس پودے سے پھول نکلتے ہیں، پھول سے پھل بنتے ہیں اور اس طرح وہ ساری دنیا کے انسانوں تک پہنچ جاتا ہے، کون ذات ہے جو یہ کام کر رہی ہے؟ اللہ جل شانہ ہی یہ سارے کام کرنے والے ہیں۔

انسان میں پیدا کرنے کی صلاحیت نہیں

لہٰذا آمدنی کا کوئی بھی ذریعہ ہو، چاہے وہ تجارت ہو یا زراعت ہو یا ملازمت ہو، حقیقت میں تو انسان ایک محدود کام کرنے کے لئے دنیا میں بھیجا گیا ہے، بس انسان وہ محدود کام کر دیتا ہے لیکن اس محدود کام کے اندر کسی چیز کو پیدا کرنے کی صلاحیت نہیں ہے۔ یہ تو اللہ تعالیٰ جل شانہ ہیں جو ضرورت کی اشیاء پیدا کرتے ہیں اور تمہیں عطا کرتے ہیں، لہٰذا جو کچھ بھی تمہارے پاس ہے وہ سب اسی کی عطا ہے:

﴿لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ﴾ (۱)

''زمین و آسمان میں جو کچھ ہے وہ اسی کی ملکیت ہے''

مالکِ حقیقی اللہ تعالیٰ ہیں

اور اللہ تعالیٰ نے وہ چیز تمہیں عطا کر کے یہ بھی کہہ دیا کہ چلو تم ہی اس کے مالک ہو۔ چنانچہ سورۃ یٰسٓ میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

(۱) البقرہ: ٢٨٤

﴿ أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّا خَلَقْنَا لَهُمْ مِمَّا عَمِلَتْ أَيْدِينَا أَنْعَامًا فَهُمْ لَهَا مَالِكُونَ ﴾ (۱)

''کیا وہ نہیں دیکھتے کہ ہم نے بنا دیئے ان کے واسطے اپنے ہاتھوں کی بنائی ہوئی چیزوں سے چوپائے، پھر وہ ان کے مالک ہیں''

مالکِ حقیقی تو ہم تھے، ہم نے تمہیں مالک بنایا۔ تو حقیقت میں وہ مال جو تمہارے پاس آیا ہے اس میں سب سے بڑا حق تو ہمارا ہے، جب ہمارا حق ہے تو پھر اس میں سے اللہ کے حکم کے مطابق خرچ کرو، اگر اس کے حکم کے مطابق خرچ کرو گے تو باقی جتنا مال تمہارے پاس ہے وہ تمہارے لئے حلال اور طیب ہے، وہ مال اللہ کا فضل ہے، اللہ کی نعمت ہے، وہ مال برکت والا ہے۔ اور اگر تم نے اس مال میں سے وہ چیز نہ نکالی جو اللہ تعالیٰ نے تم پر فرض کی ہے تو پھر یہ سارا مال تمہارے لئے آگ کے انگارے ہیں اور قیامت کے دن ان انگاروں کو دیکھ لو گے جب ان انگاروں سے تمہارے جسموں کو داغا جائے گا اور تم سے یہ کہا جائے گا کہ یہ ہے وہ خزانہ جس کو تم جمع کیا کرتے تھے۔

صرف اڑھائی فیصد ادا کرو

اگر اللہ تعالیٰ یہ فرماتے کہ یہ مال ہماری عطا کی ہوئی چیز ہے، لہٰذا اس میں سے اڑھائی فیصد تم رکھو اور ساڑھے ستانوے فیصد اللہ کی راہ میں خرچ کر دو تو بھی انصاف کے خلاف نہیں تھا، کیونکہ یہ سارا مال اسی کا دیا ہوا ہے اور اسی کی ملکیت ہے۔ لیکن اس نے اپنے بندوں پر فضل فرمایا اور یہ فرمایا کہ میں جانتا ہوں کہ تم کمزور ہو اور تمہیں اس مال کی ضرورت ہے، میں جانتا ہوں کہ تمہاری طبیعت اس مال کی طرف راغب ہے، لہٰذا چلو اس مال میں سے ساڑھے ستانوے فیصد تمہارا، صرف اڑھائی فیصد کا مطالبہ ہے، جب یہ اڑھائی فیصد اللہ کے راستے میں خرچ کرو گے تو باقی ساڑھے ستانوے فیصد تمہارے لئے حلال ہے اور طیب ہے اور برکت والا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اتنا معمولی مطالبہ کر کے سارا مال ہمارے حوالے کر دیا کہ اس کو جس طرح چاہو اپنی جائز ضروریات میں خرچ کرو۔

زکوٰۃ کی تاکید

یہ اڑھائی فیصد زکوٰۃ ہے، یہ وہ زکوٰۃ ہے جس کے بارے میں قرآن کریم میں بار بار ارشاد فرمایا:

﴿ وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ ﴾ (۲)

''نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو''

جہاں نماز کا ذکر فرمایا ہے وہاں ساتھ میں زکوٰۃ کا بھی ذکر ہے، اس زکوٰۃ کی اتنی تاکید وارد

(۱) یٰسٓ: ۷۱ (۲) البقرۃ: ۴۳

ہوئی ہے۔ جب اس زکوٰۃ کی اتنی تاکید ہے اور دوسری طرف اللہ جل شانہ نے اتنا بڑا احسان فرمایا ہے کہ ہمیں مال عطا کیا اور اس کا مالک بنایا اور پھر صرف ڈھائی فیصد کا مطالبہ کیا تو مسلمان کم از کم اتنا کرلے کہ وہ ڈھائی فیصد ٹھیک ٹھیک اللہ کے مطالبے کے مطابق ادا کردے تو اس پر کوئی آسمان نہیں ٹوٹ جائے گا، کوئی قیامت نہیں ٹوٹ پڑے گی۔

زکوٰۃ حساب کرکے نکالو

بہت سے لوگ تو وہ ہیں جو زکوٰۃ سے بالکل بے پرواہ ہیں، العیاذ باللہ، وہ تو زکوٰۃ نکالتے ہی نہیں ہیں۔ ان کی سوچ تو یہ ہے کہ یہ ڈھائی فیصد کیوں دیں؟ بس جو مال آرہا ہے وہ آئے۔ دوسری طرف بعض لوگ وہ ہیں جن کو زکوٰۃ کا کچھ نہ کچھ احساس ہے اور وہ زکوٰۃ نکالتے بھی ہیں لیکن زکوٰۃ نکالنے کا جو صحیح طریقہ ہے وہ طریقہ اختیار نہیں کرتے۔ جب ڈھائی فیصد زکوٰۃ فرض کی گئی تو اب اس کا تقاضا یہ ہے کہ ٹھیک ٹھیک حساب لگا کر زکوٰۃ نکالی جائے۔

بعض لوگ یہ سوچتے ہیں کہ کون حساب کتاب کرے، کون سارے اسٹاک کو چیک کرے، لہٰذا بس ایک اندازہ کرکے زکوٰۃ نکال دیتے ہیں، اب اس اندازے میں غلطی بھی واقع ہوسکتی ہے اور زکوٰۃ نکالنے میں کمی بھی ہوسکتی ہے۔ اگر زکوٰۃ زیادہ نکال دی جائے تو انشاء اللہ مؤاخذہ نہیں ہوگا، لیکن اگر ایک روپیہ بھی کم ہوجائے یعنی جتنی زکوٰۃ واجب ہوئی ہے اس سے ایک روپیہ کم زکوٰۃ نکالی تو یاد رکھئے! وہ ایک روپیہ جو آپ نے حرام طریقے سے اپنے پاس روک لیا ہے، وہ ایک روپیہ تمہارے سارے مال کو برباد کرنے کے لئے کافی ہے۔

وہ مال تباہی کا سبب ہے

ایک حدیث میں نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب مال میں زکوٰۃ کی رقم شامل ہوجائے یعنی پوری زکوٰۃ نہیں نکالی بلکہ کچھ زکوٰۃ نکالی اور کچھ باقی رہ گئی تو وہ مال انسان کے لئے تباہی اور ہلاکت کا سبب ہے۔

اس وجہ سے اس بات کا اہتمام کریں کہ ایک ایک پائی کا صحیح حساب کرکے زکوٰۃ نکالی جائے، اس کے بغیر زکوٰۃ کا فریضہ کماحقہٗ ادا نہیں ہوتا۔ الحمدللہ مسلمانوں کی ایک بہت بڑی تعداد وہ ہے جو زکوٰۃ ضرور نکالتی ہے لیکن اس بات کا اہتمام نہیں کرتی کہ ٹھیک ٹھیک حساب کرکے زکوٰۃ نکالے۔ اس کی وجہ سے زکوٰۃ کی رقم ان کے مال میں شامل رہتی ہے اور اس کے نتیجے میں ہلاکت اور بربادی کا سبب بن جاتی ہے۔

زکوۃ کے دنیاوی فوائد

ویسے زکوۃ اس نیت سے نکالنی چاہئے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے، اس کی رضا کا تقاضا ہے اور ایک عبادت ہے۔ اس زکوۃ نکالنے سے ہمیں کوئی منفعت حاصل ہو یا نہ ہو، کوئی فائدہ ملے یا نہ ملے، اللہ تعالیٰ کے حکم کی اطاعت بذاتِ خود مقصود ہے۔ اصل مقصد تو زکوۃ کا یہ ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کا کرم ہے کہ جب کوئی بندہ زکوۃ نکالتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو فوائد بھی عطا فرماتے ہیں۔ وہ فائدہ یہ ہے کہ اس کے مال میں برکت ہوتی ہے، چنانچہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقَاتِ﴾ (۱)

''یعنی اللہ تعالیٰ سود کو مٹاتے ہیں اور زکوۃ اور صدقات کو بڑھاتے ہیں''

ایک حدیث میں حضورِ اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب کوئی بندہ زکوۃ نکالتا ہے تو اللہ تعالیٰ کے فرشتے اس کے حق میں یہ دعا فرماتے ہیں کہ:

((أَللّٰهُمَّ أَعْطِ مُنْفِقًا خَلَفًا وَأَعْطِ مُمْسِكًا مَالًا تَلَفًا)) (۲)

''اے اللہ! جو شخص اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کر رہا ہے اس کو اور زیادہ عطا فرمائیے، اور اے اللہ! جو شخص اپنے مال کو روک کر رکھ رہا ہے اور زکوۃ ادا نہیں کر رہا ہے تو اے اللہ! اس کے مال پر ہلاکت ڈالئے''

اس لئے فرمایا:

((مَا نَقَصَتْ صَدَقَةٌ مِّنْ مَّالٍ)) (۳)

''کوئی صدقہ کسی مال میں کمی نہیں کرتا''

چنانچہ بعض اوقات یہ ہوتا ہے کہ اِدھر ایک مسلمان نے زکوۃ نکالی دوسری طرف اللہ تعالیٰ نے اس کی آمدنی کے دوسرے ذرائع پیدا کر دیئے اور اس کے ذریعہ اس زکوۃ سے زیادہ پیسہ اس کے پاس آ گیا۔ بعض اوقات یہ ہوتا ہے کہ زکوۃ نکالنے سے اگرچہ گنتی کے اعتبار سے پیسے کم ہو جاتے ہیں لیکن

---

(۱) البقرة: ۲۷٦

(۲) صحيح البخاري، كتاب الزكاة، باب قول الله تعالى فأما من أعطى...... الخ، رقم: ۱۳۵۱، صحيح مسلم، كتاب الزكاة، باب في المنفق والممسك، رقم: ۱٦۷۸، مسند أحمد، رقم: ۷۷۰۹

(۳) صحيح مسلم، كتاب البر والصلة والآداب، باب استحباب العفو والتواضع، رقم: ٤٦۸۹، سنن الترمذي، كتاب البر والصلة عن رسول الله، باب ما جاء في التواضع، رقم: ۱۹۵۲، مسند أحمد، رقم: ٦۹۰۸، مؤطا مالك، كتاب الجامع، باب ما جاء في التعفف عن المسألة، رقم: ۱۵۹۰

بقیہ مال میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسی برکت ہوتی ہے کہ اس برکت کے نتیجے میں تھوڑے مال سے زیادہ فوائد حاصل ہو جاتے ہیں۔

مال میں بے برکتی کا انجام

آج کی دنیا گنتی کی دنیا ہے۔ برکت کا مفہوم لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتا۔ برکت اس چیز کو کہتے ہیں کہ تھوڑی سی چیز میں زیادہ فائدہ حاصل ہو جائے، مثلاً آج آپ نے پیسے تو بہت کمائے لیکن جب گھر پہنچے تو پتہ چلا کہ بچہ بیمار ہے، اس کو لے کر ڈاکٹر کے پاس گئے اور ایک ہی طبی معائنہ میں وہ سارے پیسے خرچ ہو گئے، اس کا مطلب یہ ہوا کہ جو پیسے کمائے تھے اس میں برکت نہ ہوئی۔ یا مثلاً آپ پیسے کما کر گھر جا رہے تھے کہ راستہ میں ڈاکو مل گیا اور اس نے پستول دکھا کر سارے پیسے چھین لیے، اس کا مطلب یہ ہے کہ پیسے تو حاصل ہوئے لیکن اس میں برکت نہیں ہوئی۔ یا مثلاً آپ نے پیسہ کما کر کھانا کھایا اور اس کھانے کے نتیجے میں آپ کو بدہضمی ہو گئی، اس کا مطلب یہ ہے کہ اس مال میں برکت نہ ہوئی۔ یہ سب بے برکتی کی نشانیاں ہیں۔ برکت یہ ہے کہ آپ نے پیسے تو کم کمائے لیکن اللہ تعالیٰ نے ان تھوڑے پیسوں میں زیادہ کام بنا دیئے اور تمہارے بہت سے کام نکل گئے، اس کا نام ہے برکت۔ یہ برکت اللہ تعالیٰ اس کو عطا فرماتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے احکام پر عمل کرتا ہے۔ لہٰذا ہم اپنے مال کی زکوٰۃ نکالیں اور اس طرح نکالیں جس طرح اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ نے ہمیں بتایا ہے اور اس کو حساب کتاب کے ساتھ نکالیں۔ صرف اندازہ سے نہ نکالیں۔

زکوٰۃ کا نصاب

اس کی تھوڑی سی تفصیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ کا ایک نصاب مقرر کیا ہے کہ اس نصاب سے کم اگر کوئی شخص مالک ہے تو اس پر زکوٰۃ فرض نہیں، اگر اس نصاب کا مالک ہوگا تو زکوٰۃ فرض ہوگی۔ وہ نصاب یہ ہے: ساڑھے باون تولہ چاندی یا اس کی قیمت کا نقد روپیہ، یا زیور، یا سامانِ تجارت وغیرہ، جس شخص کے پاس یہ مال اتنی مقدار میں موجود ہو تو اس کو ''صاحبِ نصاب'' کہا جاتا ہے۔

ہر ہر روپے پر سال کا گزرنا ضروری نہیں

پھر اس نصاب پر ایک سال گزرنا چاہئے، یعنی ایک سال تک اگر کوئی شخص صاحبِ نصاب رہے تو اس پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے۔ اس بارے میں عام طور پر یہ غلط فہمی پائی جاتی ہے کہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہر ہر روپے پر مستقل پورا سال گزرے، تب اس پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے، یہ بات درست

نہیں۔ بلکہ جب ایک مرتبہ سال کے شروع میں ایک شخص صاحبِ نصاب بن جائے مثلاً فرض کریں کہ یکم رمضان کو اگر کوئی شخص صاحبِ نصاب بن گیا، پھر آئندہ سال جب یکم رمضان آیا تو اس وقت بھی وہ صاحبِ نصاب ہے تو ایسے شخص کو صاحبِ نصاب سمجھا جائے گا، درمیان سال میں جو رقم آتی جاتی رہی اس کا کوئی اعتبار نہیں، بس یکم رمضان کو دیکھ لو کہ تمہارے پاس کتنی رقم موجود ہے، اس رقم پر زکوٰۃ نکالی جائے گی، چاہے اس میں سے کچھ رقم صرف ایک دن پہلے ہی کیوں نہ آئی ہو۔

تاریخِ زکوٰۃ میں جو رقم ہو اس پر زکوٰۃ ہے

مثلاً فرض کریں کہ ایک شخص کے پاس یکم رمضان کو ایک لاکھ روپیہ تھا، اگلے سال یکم رمضان سے دو دن پہلے پچاس ہزار روپے اس کے پاس اور آگئے اور اس کے نتیجے میں یکم رمضان کو اس کے پاس ڈیڑھ لاکھ روپے ہوگئے، اب اس ڈیڑھ لاکھ روپے پر زکوٰۃ فرض ہوگی، یہ نہیں کہا جائے گا کہ اس میں پچاس ہزار روپے تو صرف دو دن پہلے آئے ہیں اور اس پر ایک سال نہیں گزرا، لہٰذا اس پر زکوٰۃ نہ ہونی چاہئے، یہ درست نہیں بلکہ زکوٰۃ نکالنے کی جو تاریخ ہے اور جس تاریخ کو آپ صاحبِ نصاب بنے ہیں اس تاریخ میں جتنا مال آپ کے پاس موجود ہے اس پر زکوٰۃ واجب ہے، چاہے یہ رقم پچھلے سال یکم رمضان کی رقم سے زیادہ ہو یا کم ہو، مثلاً اگر پچھلے سال ایک لاکھ روپے تھے، اب ڈیڑھ لاکھ ہیں تو ڈیڑھ لاکھ پر زکوٰۃ ادا کرو، اور اگر اس سال پچاس ہزار رہ گئے تو اب پچاس ہزار پر زکوٰۃ ادا کرو، درمیان سال میں جو رقم خرچ ہوگئی، اس کا کوئی حساب کتاب نہیں اور اس خرچ شدہ رقم پر زکوٰۃ نکالنے کی ضرورت نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے حساب کتاب کی اُلجھن سے بچانے کے لئے یہ آسان طریقہ مقرر فرمایا ہے کہ درمیان سال میں جو کچھ تم نے کھایا پیا اور وہ رقم تمہارے پاس سے چلی گئی تو اس کا کوئی حساب کتاب کرنے کی ضرورت نہیں۔ اسی طرح درمیان سال میں جو رقم آگئی اس کا الگ سے حساب رکھنے کی ضرورت نہیں کہ وہ کس تاریخ میں آئی اور کب اس پر سال پورا ہوگا؟ بلکہ زکوٰۃ نکالنے کی تاریخ میں جو رقم تمہارے پاس ہے، اس پر زکوٰۃ ادا کرو۔ سال گزرنے کا مطلب یہ ہے۔

اموالِ زکوٰۃ کون کون سے ہیں؟

یہ بھی اللہ تعالیٰ کا ہم پر فضل ہے کہ اس نے ہر ہر چیز پر زکوٰۃ فرض نہیں فرمائی، ورنہ مال کی تو بہت سی قسمیں ہیں۔ جن چیزوں پر زکوٰۃ فرض ہے وہ یہ ہیں: (۱) نقد روپیہ، چاہے وہ کسی بھی شکل میں ہو، چاہے وہ نوٹ ہوں یا سکے ہوں، (۲) سونا چاندی، چاہے وہ زیور کی شکل میں ہو، یا سکے کی شکل میں ہو، بعض لوگوں کے ذہنوں میں یہ رہتا ہے کہ جو خواتین کا استعمالی زیور ہے اس پر زکوٰۃ نہیں ہے،

یہ بات درست نہیں۔

صحیح بات یہ ہے کہ استعمالی زیور پر بھی زکوٰۃ واجب ہے البتہ صرف سونے چاندی کے زیور پر زکوٰۃ واجب ہے، لیکن اگر سونے چاندی کے علاوہ کسی اور دھات کا زیور ہے، چاہے پلاٹینم ہی کیوں نہ ہو اس پر زکوٰۃ واجب نہیں، اسی طرح ہیرے جواہرات پر زکوٰۃ نہیں جب تک تجارت کے لئے نہ ہوں بلکہ ذاتی استعمال کے لئے ہوں۔

اموالِ زکوٰۃ میں عقل نہ چلائیں

یہاں یہ بات بھی سمجھ لینا چاہئے کہ زکوٰۃ ایک عبادت ہے، اللہ تعالیٰ کا عائد کیا ہوا فریضہ ہے۔ اب بعض لوگ زکوٰۃ کے اندر اپنی عقل دوڑاتے ہیں اور یہ سوال کرتے ہیں کہ اس پر زکوٰۃ کیوں واجب ہے اور فلاں چیز پر زکوٰۃ کیوں واجب نہیں؟

یاد رکھئے کہ یہ زکوٰۃ ادا کرنا عبادت ہے اور عبادت کے معنی ہی یہ ہیں کہ چاہے وہ ہماری سمجھ میں آئے یا نہ آئے مگر اللہ کا حکم ماننا ہے۔ مثلاً کوئی شخص کہے کہ سونے چاندی پر زکوٰۃ واجب ہے تو ہیرے جواہرات پر زکوٰۃ کیوں واجب نہیں؟ اور پلاٹینم پر کیوں زکوٰۃ نہیں؟ یہ سوال بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص یہ کہے کہ حالتِ سفر میں ظہر اور عصر اور عشاء کی نماز میں قصر ہے اور چار رکعت کی بجائے دو رکعت پڑھی جاتی ہے تو پھر مغرب میں قصر کیوں نہیں؟ یا مثلاً کوئی شخص کہے کہ ایک آدمی ہوائی جہاز میں فرسٹ کلاس کے اندر سفر کرتا ہے اور اس سفر میں اس کو کوئی مشقت بھی نہیں ہوتی مگر اس کی نماز آدھی ہو جاتی ہے اور میں کراچی میں بس کے اندر بڑی مشقت کے ساتھ سفر کرتا ہوں، میری نماز آدھی کیوں نہیں ہوتی؟ ان سب کا ایک ہی جواب ہے، وہ یہ کہ یہ تو اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے عبادت کے احکام ہیں، عبادات میں ان احکام کی پابندی کرنا ضروری ہے ورنہ وہ کام عبادت نہیں رہے گا۔

عبادت کرنا اللہ کا حکم ہے

یا مثلاً کوئی شخص یہ کہے کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ ۹ ذی الحجہ ہی کو حج ہوتا ہے؟ مجھے تو آسانی یہ ہے کہ آج جا کر حج کر آؤں اور ایک دن کے بجائے میں عرفات تین دن قیام کروں گا، اب اگر وہ شخص ایک دن کے بجائے تین دن بھی وہاں بیٹھا رہے گا، تب بھی اس کا حج نہیں ہوگا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے عبادت کا جو طریقہ بتایا تھا اس کے مطابق نہیں کیا۔ یا مثلاً کوئی شخص یہ کہے کہ حج کے تین دنوں میں جمرات کی رمی کرنے میں بہت ہجوم ہوتا ہے اس لئے میں چوتھے دن اکٹھی سارے دنوں کی رمی کرلوں گا۔ یہ رمی درست نہیں ہوگی اس لئے کہ یہ عبادت ہے اور عبادت کے اندر یہ ضروری ہے کہ جو طریقہ

بتایا گیا ہے اور جس طرح بتایا گیا ہے اس کے مطابق وہ عبادت انجام دی جائے گی تو وہ عبادت درست ہوگی ورنہ درست نہ ہوگی۔ لہٰذا یہ اعتراض کرنا کہ سونے اور چاندی پر زکوٰۃ کیوں ہے اور ہیرے پر کیوں نہیں، یہ عبادت کے فلسفے کے خلاف ہے۔ بہر حال، اللہ تعالیٰ نے سونے چاندی پر زکوٰۃ رکھی ہے، چاہے وہ استعمال کا ہو، اور نقد روپیہ پر زکوٰۃ رکھی ہے۔

سامانِ تجارت کی قیمت کے تعین کا طریقہ

دوسری چیز جس پر زکوٰۃ فرض ہے وہ ہے ''سامانِ تجارت''، مثلاً کسی کی دکان میں جو سامان برائے فروخت رکھا ہوا ہے، اس سارے اسٹاک پر زکوٰۃ واجب ہے، البتہ اسٹاک کی قیمت لگاتے ہوئے اس بات کی گنجائش ہے کہ آدمی زکوٰۃ نکالتے وقت یہ حساب لگائے کہ اگر میں پورا اسٹاک اکٹھا فروخت کروں تو بازار میں اس کی کیا قیمت لگے گی۔ دیکھئے ایک ''ریٹیل پرائس'' ہوتی ہے اور دوسری ''ہول سیل پرائس'' تیسری صورت یہ ہے کہ پورا اسٹاک اکٹھا فروخت کرنے کی صورت میں کیا قیمت لگے گی، لہٰذا جب دکان کے اندر جو مال ہے اس کی زکوٰۃ کا حساب لگایا جا رہا ہو تو اس کی گنجائش ہے کہ تیسری قسم کی قیمت لگائی جائے، وہ قیمت نکال کر پھر اس کا ڈھائی فیصد زکوٰۃ میں نکالنا ہوگا، البتہ احتیاط اس میں ہے کہ عام ''ہول سیل قیمت'' سے حساب لگا کر اس پر زکوٰۃ ادا کر دی جائے۔

مالِ تجارت میں کیا کیا داخل ہے؟

اس کے علاوہ مالِ تجارت میں ہر وہ چیز شامل ہے جس کو آدمی نے بیچنے کی غرض سے خریدا ہو، لہٰذا اگر کسی شخص نے بیچنے کی غرض سے کوئی پلاٹ خریدا یا زمین خریدی یا کوئی مکان خریدا یا گاڑی خریدی اور اس مقصد سے خریدی کہ اس کو بیچ کر نفع کماؤں گا تو یہ سب چیزیں مالِ تجارت میں داخل ہیں، لہٰذا اگر کوئی پلاٹ، کوئی زمین، کوئی مکان خریدتے وقت شروع ہی میں یہ نیت تھی کہ میں اس کو فروخت کروں گا تو اس کی مالیت پر زکوٰۃ واجب ہے۔ بہت سے لوگ وہ ہوتے ہیں جو ''انوسٹمنٹ'' کی غرض سے پلاٹ خرید لیتے ہیں اور شروع ہی سے یہ نیت ہوتی ہے کہ جب اس پر اچھے پیسے ملیں گے تو اس کو فروخت کر دوں گا اور فروخت کر کے اس سے نفع کماؤں گا، تو اس پلاٹ کی مالیت پر بھی زکوٰۃ واجب ہے۔ لیکن اگر پلاٹ اس نیت سے خریدا کہ اگر موقع ہوا تو اس پر رہائش کے لئے مکان بنالیں گے، یا موقع ہوگا تو اس کو کرائے پر چڑھا دیں گے یا کبھی موقع ہوگا تو اس کو فروخت کر دیں گے، کوئی ایک واضح نیت نہیں ہے بلکہ ویسے ہی خرید کر ڈال دیا ہے، اب اس میں یہ بھی احتمال ہے کہ آئندہ کسی وقت اس کو مکان بنا کر وہاں رہائش اختیار کر لیں گے اور یہ احتمال بھی ہے کہ کرائے پر چڑھا دیں گے اور یہ

احتمال بھی ہے کہ فروخت کردیں گے تو اس صورت میں اس پلاٹ پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے، لہٰذا زکوٰۃ صرف اس صورت میں واجب ہوتی ہے جب خریدتے وقت ہی اس کو دوبارہ فروخت کرنے کی نیت ہو، یہاں تک کہ اگر پلاٹ خریدتے وقت شروع میں یہ نیت تھی کہ اس پر مکان بنا کر رہائش اختیار کریں گے، بعد میں ارادہ بدل گیا اور یہ ارادہ کرلیا کہ اب اس کو فروخت کر کے پیسے حاصل کرلیں گے تو محض نیت اور ارادہ کی تبدیلی سے فرق نہیں پڑتا، جب تک آپ اس پلاٹ کو واقعۃً فروخت نہیں کردیں گے اور اس کے پیسے آپ کے پاس نہیں آجائیں گے اس وقت تک اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔

بہر حال، ہر وہ چیز جسے خریدتے وقت ہی اس کو فروخت کرنے کی نیت ہو، وہ مالِ تجارت ہے اور اس کی مالیت پر ڈھائی فیصد کے حساب سے زکوٰۃ واجب ہے۔

کس دن کی مالیت معتبر ہوگی؟

یہ بات بھی یاد رکھیں کہ مالیت اس دن کی معتبر ہوگی جس دن آپ زکوٰۃ کا حساب کررہے ہیں، مثلاً ایک پلاٹ آپ نے ایک لاکھ روپے میں خریدا تھا اور آج اس پلاٹ کی قیمت دس لاکھ ہوگئی، اب دس لاکھ پر ڈھائی فیصد کے حساب سے زکوٰۃ نکالی جائے گی، ایک لاکھ پر نہیں نکالی جائے گی۔

کمپنیوں کے شیئرز پر زکوٰۃ کا حکم

اسی طرح کمپنیوں کے ''شیئرز'' بھی سامانِ تجارت میں داخل ہیں۔ اور ان کی دو صورتیں ہیں:

ایک صورت یہ ہے کہ آپ نے کسی کمپنی کے شیئرز اس مقصد کے لئے خریدے ہیں کہ اس کے ذریعہ کمپنی کا منافع (Dividend) حاصل کریں گے اور اس پر ہمیں سالانہ منافع کمپنی کی طرف سے ملتا رہے گا۔

دوسری صورت یہ ہے کہ آپ نے کسی کمپنی کے شیئرز ''کیپٹل گین'' کے لئے خریدے ہیں، یعنی نیت یہ ہے کہ جب بازار میں ان کی قیمت بڑھ جائے گی تو ان کو فروخت کرکے نفع کمائیں گے۔

اگر یہ دوسری صورت ہے یعنی شیئرز خریدتے وقت شروع ہی میں ان کو فروخت کرنے کی نیت تھی تو اس صورت میں پورے شیئرز کی پوری بازاری قیمت پر زکوٰۃ واجب ہوگی، مثلاً آپ نے پچاس روپے کے حساب سے شیئرز خریدے اور مقصد یہ تھا کہ جب ان کی قیمت بڑھ جائے گی تو ان کو فروخت کرکے نفع حاصل کریں گے، اس کے بعد جس دن آپ نے زکوٰۃ کا حساب نکالا، اس دن شیئرز کی قیمت ساٹھ روپے ہوگئی تو اب ساٹھ روپے کے حساب سے ان شیئرز کی مالیت نکالی جائے گی اور اس پر اڑھائی فیصد کے حساب سے زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی۔

لیکن اگر پہلی صورت ہے یعنی آپ نے کمپنی کے شیئرز اس نیت سے خریدے کہ کمپنی کی طرف سے اس پر سالانہ منافع ملتا رہے گا اور فروخت کرنے کی نیت نہیں تھی تو اس صورت میں آپ کے لئے اس بات کی گنجائش ہے کہ یہ دیکھیں کہ جس کمپنی کے یہ شیئرز ہیں اس کمپنی کے کتنے اثاثے جامد ہیں، مثلاً بلڈنگ، مشینری، کاریں وغیرہ، اور کتنے اثاثے نقد، سامانِ تجارت اور خام مال کی شکل میں ہیں، یہ معلومات کمپنی ہی سے حاصل کی جاسکتی ہیں، مثلاً فرض کریں کہ کسی کمپنی کے ساٹھ فیصد اثاثے نقد، سامانِ تجارت، خام مال، اور تیار مال کی صورت میں ہیں اور چالیس فیصد اثاثے بلڈنگ، مشینری اور کار وغیرہ کی صورت میں ہیں تو اس صورت میں آپ ان شیئرز کی بازاری قیمت لگا کر اس کی ساٹھ فیصد قیمت پر زکوٰۃ ادا کریں، مثلاً شیئرز کی بازاری قیمت ساٹھ روپے تھی اور کمپنی کے ساٹھ فیصد اثاثے قابلِ زکوٰۃ تھے اور چالیس فیصد اثاثے ناقابلِ زکوٰۃ تھے تو اس صورت میں آپ اس شیئرز کی پوری قیمت یعنی ساٹھ روپے کے بجائے =/۳۶ روپے پر زکوٰۃ ادا کریں۔ اور اگر کسی کمپنی کے اثاثوں کی تفصیل معلوم نہ ہوسکے تو اس صورت میں احتیاطاً ان شیئرز کی پوری بازاری قیمت پر زکوٰۃ ادا کردی جائے۔

شیئرز کے علاوہ اور جتنے فائنانشل انسٹرومنٹس ہیں چاہے وہ بونڈز ہوں یا سرٹیفکیٹس ہوں، یہ سب نقد کے حکم میں ہیں، ان کی اصل قیمت پر زکوٰۃ واجب ہے۔

کارخانہ کی کن اشیاء پر زکوٰۃ ہے

اگر کوئی شخص فیکٹری کا مالک ہے تو اس فیکٹری میں جو تیار شدہ مال ہے اس کی قیمت پر زکوٰۃ واجب ہے۔ اسی طرح جو مال تیاری کے مختلف مراحل میں ہے یا خام مال کی شکل میں ہے اس پر بھی زکوٰۃ واجب ہے۔ البتہ فیکٹری کی مشینری، بلڈنگ، گاڑیاں وغیرہ پر زکوٰۃ واجب نہیں۔

اس طرح اگر کسی شخص نے کسی کاروبار میں شرکت کے لئے روپیہ لگایا ہوا ہے، اور اس کاروبار کا کوئی متناسب حصہ اس کی ملکیت ہے تو جتنا حصہ اس کی ملکیت ہے اس حصے کی بازاری قیمت کے حساب سے زکوٰۃ واجب ہوگی۔

بہرحال، خلاصہ یہ کہ نقد روپیہ جس میں بینک بیلنس اور فائنانشل انسٹرومنٹس بھی داخل ہیں، ان پر زکوٰۃ واجب ہے، اور سامانِ تجارت، جس میں تیار مال، خام مال، اور جو مال تیاری کے مراحل میں ہیں وہ سب سامانِ تجارت میں داخل ہیں، اور کمپنی کے شیئرز بھی سامانِ تجارت میں داخل ہیں، اس کے علاوہ ہر چیز جو آدمی نے فروخت کرنے کی غرض سے خریدی ہو وہ بھی سامانِ تجارت میں داخل ہے، زکوٰۃ نکالتے وقت ان سب کی مجموعی مالیت نکالیں اور اس پر زکوٰۃ ادا کریں۔

واجب الوصول قرضوں پر زکوٰۃ

ان کے علاوہ بہت سی رقمیں وہ ہوتی ہیں جو دوسروں سے واجب الوصول ہوتی ہیں۔ مثلاً دوسروں کو قرض دے رکھا ہے، یا مثلاً مال اُدھار فروخت کر رکھا ہے اور اس کی قیمت ابھی وصول ہونی ہے، تو جب آپ زکوٰۃ کا حساب لگائیں اور اپنی مجموعی مالیت نکالیں تو بہتر یہ ہے کہ ان قرضوں کو اور واجب الوصول رقموں کو آج ہی آپ اپنی مجموعی مالیت میں شامل کرلیں۔ اگرچہ شرعی حکم یہ ہے کہ جو قرضے ابھی وصول نہیں ہوئے تو جب تک وہ وصول نہ ہو جائیں اس وقت تک شرعاً ان پر زکوٰۃ کی ادائیگی واجب نہیں ہوتی، لیکن جب وصول ہو جائیں تو جتنے سال گزر چکے ہیں ان تمام پچھلے سالوں کی بھی زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی۔ مثلاً فرض کریں کہ آپ نے ایک شخص کو ایک لاکھ روپیہ قرضہ دے رکھا تھا، اور پانچ سال کے بعد وہ قرضہ آپ کو واپس ملا، تو اگرچہ اس ایک لاکھ روپے پر ان پانچ سالوں کے دوران تو زکوٰۃ کی ادائیگی واجب نہیں تھی، لیکن جب وہ ایک لاکھ روپے وصول ہو گئے تو اب گزشتہ پانچ سالوں کی بھی زکوٰۃ دینی ہوگی۔ تو چونکہ گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ یک مشت ادا کرنے میں بعض اوقات دشواری ہوتی ہے لہٰذا بہتر یہ ہے کہ ہر سال اس قرض کی زکوٰۃ کی ادائیگی بھی کردی جایا کرے۔ لہٰذا جب زکوٰۃ کا حساب لگائیں تو ان قرضوں کو بھی مجموعی مالیت میں شامل کرلیا کریں۔

قرضوں کی منہائی

پھر دوسری طرف یہ دیکھیں کہ آپ کے ذمّے دوسرے لوگوں کے کتنے قرضے ہیں۔ اور پھر مجموعی مالیت میں سے ان قرضوں کو منہا کر دیں، منہا کرنے کے بعد جو باقی بچے وہ قابلِ زکوٰۃ رقم ہے۔ اس کا پھر ڈھائی فیصد نکال کر زکوٰۃ کی نیت سے ادا کر دیں۔ بہتر یہ ہے کہ جو رقم زکوٰۃ کی بنے اتنی رقم الگ نکال کر محفوظ کرلیں، پھر وقتاً فوقتاً اس کو مستحقین میں خرچ کرتے رہیں۔ بہرحال زکوٰۃ کا حساب لگانے کا یہ طریقہ ہے۔

قرضوں کی دو قسمیں

قرضوں کے سلسلے میں ایک بات اور سمجھ لینی چاہئے، وہ یہ کہ قرضوں کی دو قسمیں ہیں۔ ایک تو معمولی قرضے ہیں جن کو انسان اپنی ذاتی ضروریات اور ہنگامی ضروریات کے لئے مجبوراً لیتا ہے۔ دوسری قسم کے قرضے وہ ہیں جو بڑے بڑے سرمایہ دار پیداواری اغراض کے لئے لیتے ہیں مثلاً فیکٹریاں لگانے، یا مشینریاں خریدنے، یا مالِ تجارت امپورٹ کرنے کے لئے قرضے لیتے ہیں، یا مثلاً

ایک سرمایہ دار کے پاس پہلے سے دو فیکٹریاں موجود ہیں لیکن اس نے بینک سے قرض لے کر تیسری فیکٹری لگالی۔ اب اگر اس دوسری قسم کے قرضوں کو مجموعی مالیت سے منہا کیا جائے تو نہ صرف یہ کہ ان سرمایہ داروں پر ایک پیسے کی بھی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی بلکہ وہ لوگ اُلٹے مستحقِ زکوٰۃ بن جائیں گے، اس لئے کہ ان کے پاس جتنی مالیت کا مال موجود ہے، اس سے زیادہ مالیت کے قرضے بینک سے لے رکھے ہیں، وہ بظاہر فقیر اور مسکین نظر آ رہا ہے۔ لہٰذا ان قرضوں کے منہا کرنے میں بھی شریعت نے فرق رکھا ہے۔

تجارتی قرضے کب منہا کیے جائیں

اس میں تفصیل یہ ہے کہ پہلی قسم کے قرضے تو مجموعی مالیت سے منہا ہو جائیں گے اور ان کو منہا کرنے کے بعد زکوٰۃ ادا کی جائے گی۔ اور دوسری قسم کے قرضوں میں یہ تفصیل ہے کہ اگر کسی شخص نے تجارت کی غرض سے قرض لیا، اور اس قرض کو ایسی اشیاء خریدنے میں استعمال کیا جو قابلِ زکوٰۃ ہیں، مثلاً اس قرض سے خام مال خرید لیا، یا مالِ تجارت خرید لیا، تو اس قرض کو مجموعی مالیت سے منہا کریں گے۔ لیکن اگر اس قرض کو ایسے اثاثے خریدنے میں استعمال کیا جو نا قابلِ زکوٰۃ ہیں تو اس قرض کو مجموعی مالیت سے منہا نہیں کریں گے۔

قرض کی مثال

مثلاً ایک شخص نے بینک سے ایک کروڑ روپے قرض لیے اور اس رقم سے اس نے ایک پلانٹ (مشینری) باہر سے امپورٹ کر لیا ـــــ چونکہ یہ پلانٹ قابلِ زکوٰۃ نہیں ہے اس لئے کہ یہ مشینری ہے تو اس صورت میں یہ قرضہ منہا نہیں ہوگا۔ لیکن اگر اس نے اس قرض سے خام مال خرید لیا تو چونکہ خام مال قابلِ زکوٰۃ ہے اس لئے یہ قرض منہا کیا جائے گا، کیونکہ دوسری طرف یہ خام مال ادا کی جانے والی زکوٰۃ کی مجموعی مالیت میں پہلے سے شامل ہو چکا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ نارمل قسم کے قرض تو پورے کے پورے مجموعی مالیت سے منہا ہو جائیں گے، اور جو قرضے پیداواری اغراض کے لئے لیے گئے ہیں، اس میں یہ تفصیل ہے کہ اگر اس سے نا قابلِ زکوٰۃ اثاثے خریدے ہیں تو وہ قرض منہا نہیں ہوگا، اور اگر قابلِ زکوٰۃ اثاثے خریدے ہیں تو وہ قرض منہا ہوگا۔ یہ تو زکوٰۃ نکالنے کے بارے میں احکام تھے۔

زکوٰۃ مستحق کو ادا کریں

دوسری طرف زکوٰۃ کی ادائیگی کے بارے میں بھی شریعت نے احکام بتائے ہیں۔ میرے

والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ زکوٰۃ نکالو، نہ یہ فرمایا کہ زکوٰۃ پھینکو، بلکہ فرمایا: اٰتوا الزکاۃ، زکوٰۃ ادا کرو۔ یعنی یہ دیکھو کہ اس جگہ پر زکوٰۃ جائے جہاں شرعاً زکوٰۃ جانی چاہئے۔ بعض لوگ زکوٰۃ نکالتے تو ہیں لیکن اس کی پرواہ نہیں کرتے کہ صحیح مصرف پر خرچ ہو رہی ہے یا نہیں؟ زکوٰۃ نکال کر کسی کے حوالے کر دی اور اس کی تحقیق نہیں کی کہ یہ صحیح مصرف پر خرچ کرے گا یا نہیں؟ آج بے شمار ادارے دنیا میں کام کر رہے ہیں، ان میں بہت سے ادارے ایسے بھی ہوں گے جن میں بسا اوقات اس بات کا لحاظ نہیں ہوتا ہوگا کہ زکوٰۃ کی رقم صحیح مصرف پر خرچ ہو رہی ہے یا نہیں؟ اس لئے فرمایا کہ زکوٰۃ ادا کرو۔ یعنی جو مستحقِ زکوٰۃ ہے اس کو ادا کرو۔

مستحق کون؟

اس کے لئے شریعت نے یہ اصول مقرر فرمایا کہ زکوٰۃ صرف انہی اشخاص کو دی جاسکتی ہے جو صاحبِ نصاب نہ ہوں۔ یہاں تک کہ اگر ان کی ملکیت میں ضرورت سے زائد ایسا سامان موجود ہے جو ساڑھے باون تولہ چاندی کی قیمت تک پہنچ جاتا ہے تو بھی وہ مستحقِ زکوٰۃ نہیں رہتا۔ مستحقِ زکوٰۃ وہ ہے جس کے پاس ساڑھے باون تولہ چاندی کی مالیت کی رقم یا اتنی مالیت کا کوئی سامان ضرورت سے زائد نہ ہو۔

مستحق کو مالک بنا دیں

اس میں بھی شریعت کا یہ حکم ہے کہ اس مستحقِ زکوٰۃ کو مالک بنا دو۔ یعنی وہ مستحقِ زکوٰۃ اپنی ملکیت میں خود مختار ہو کہ جو چاہے کرے۔ اسی وجہ سے کسی بلڈنگ کی تعمیر پر زکوٰۃ نہیں لگ سکتی، کسی ادارے کے ملازمین کی تنخواہوں پر زکوٰۃ نہیں لگ سکتی۔ اس لئے کہ اگر زکوٰۃ کے ذریعہ تعمیرات کرنے اور ادارے قائم کرنے کی اجازت دیدی جاتی تو زکوٰۃ کی رقم سب لوگ کھا پی کر ختم کر جاتے، کیونکہ اداروں کے اندر تنخواہیں بے شمار ہوتی ہیں، تعمیرات پر خرچ لاکھوں کا ہوتا ہے، اس لئے یہ حکم دیا گیا کہ غیر صاحبِ نصاب کو مالک بنا کر زکوٰۃ دو، یہ زکوٰۃ فقراء اور غرباء اور کمزوروں کا حق ہے، لہٰذا یہ زکوٰۃ انہی تک پہنچنی چاہئے، جب ان کو مالک بنا کر دیدو گے تو تمہاری زکوٰۃ ادا ہو جائے گی۔

کن رشتہ داروں کو زکوٰۃ دی جاسکتی ہے

یہ زکوٰۃ ادا کرنے کا حکم انسان کے اندر یہ طلب اور جستجو خود بخود پیدا کرتا ہے کہ میرے پاس زکوٰۃ کے اتنے پیسے موجود ہیں، ان کو صحیح مصرف میں خرچ کرنا ہے۔ اس لئے وہ مستحقین کو تلاش کرتا

ہے کہ کون کون لوگ مستحقین ہیں اور ان مستحقین کی فہرست بناتا ہے، پھر ان کو زکوٰۃ پہنچاتا ہے، یہ بھی انسان کی ذمہ داری ہے۔ آپ کے محلے میں، ملنے جلنے والوں میں، عزیز واقارب اور رشتہ داروں میں، دوست احباب میں جو مستحقِ زکوٰۃ ہوں، ان کو زکوٰۃ ادا کریں۔ اور ان میں سے سب سے افضل یہ ہے کہ اپنے رشتہ داروں کو زکوٰۃ ادا کریں اس میں ڈبل ثواب ہے، زکوٰۃ ادا کرنے کا ثواب بھی ہے اور صلہ رحمی کرنے کا ثواب بھی ہے۔ اور تمام رشتہ داروں کو زکوٰۃ دے سکتے ہیں، صرف دو رشتے ایسے ہیں جن کو زکوٰۃ نہیں دی جاسکتی، ایک ولادت کا رشتہ ہے، لہٰذا باپ بیٹے کو زکوٰۃ نہیں دے سکتا اور بیٹا باپ کو زکوٰۃ نہیں دے سکتا، دوسرا نکاح کا رشتہ ہے، لہٰذا شوہر بیوی کو زکوٰۃ نہیں دے سکتا اور بیوی شوہر کو زکوٰۃ نہیں دے سکتی، ان کے علاوہ باقی تمام رشتوں میں زکوٰۃ دی جاسکتی ہے۔ مثلاً بھائی کو، بہن کو، چچا کو، خالہ کو، پھوپھی کو، ماموں کو زکوٰۃ دی جاسکتی ہے۔ البتہ یہ ضرور دیکھ لیں کہ وہ مستحقِ زکوٰۃ ہوں اور صاحبِ نصاب نہ ہو۔

بیوہ اور یتیم کو زکوٰۃ دینے کا حکم

بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اگر کوئی خاتون بیوہ ہے تو اس کو زکوٰۃ ضرور دینی چاہئے حالانکہ یہاں بھی شرط یہ ہے کہ وہ مستحقِ زکوٰۃ ہو اور صاحبِ نصاب نہ ہو۔ اگر بیوہ مستحقِ زکوٰۃ ہے تو اس کی مدد کرنا بڑی اچھی بات ہے۔ لیکن اگر ایک خاتون بیوہ ہے اور مستحقِ زکوٰۃ نہیں ہے تو محض بیوہ ہونے کی وجہ سے وہ مصرفِ زکوٰۃ نہیں بن سکتی۔ اسی طرح یتیم کو زکوٰۃ دینا اور اس کی مدد کرنا بہت اچھی بات ہے لیکن یہ دیکھ کر زکوٰۃ دینی چاہئے کہ وہ مستحقِ زکوٰۃ ہے۔ لیکن اگر کوئی یتیم ہے مگر وہ مستحقِ زکوٰۃ نہیں ہے بلکہ صاحبِ نصاب ہے تو یتیم ہونے کے باوجود اس کو زکوٰۃ نہیں دی جاسکتی۔ ان احکام کو مدنظر رکھتے ہوئے زکوٰۃ نکالنی چاہئے۔

بینکوں سے زکوٰۃ کی کٹوتی کا حکم

کچھ عرصے سے ہمارے ملک میں سرکاری سطح پر زکوٰۃ وصول کرنے کا نظام قائم ہے۔ اس کی وجہ سے بہت سے مالیاتی اداروں سے زکوٰۃ وصول کی جاتی ہے، کمپنیاں بھی زکوٰۃ کاٹ کر حکومت کو ادا کرتی ہیں۔ اس کے بارے میں تھوڑی سی تفصیل عرض کر دیتا ہوں۔

جہاں تک بینکوں اور مالیاتی اداروں سے زکوٰۃ کی کٹوتی کا تعلق ہے تو اس کٹوتی سے زکوٰۃ ادا ہو جاتی ہے، دوبارہ زکوٰۃ ادا کرنے کی ضرورت نہیں، البتہ احتیاطاً ایسا کرلیں کہ یکم رمضان آنے سے پہلے دل میں یہ نیت کرلیں کہ میری رقم سے جو زکوٰۃ کٹے گی وہ میں ادا کرتا ہوں، اس سے اس کی زکوٰۃ

ادا ہو جاتی ہے دوبارہ زکوٰۃ نکالنے کی ضرورت نہیں ۔

اس میں بعض لوگوں کو یہ شبہ رہتا ہے کہ ہماری پوری رقم پر سال نہیں گزرا جب کہ پوری رقم پر زکوٰۃ کٹ گئی ۔ اس کے بارے میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ ہر ہر رقم پر سال گزرنا ضروری نہیں ہوتا، بلکہ اگر آپ صاحبِ نصاب ہیں تو اس صورت میں سال پورا ہونے سے ایک دن پہلے بھی جو رقم آپ کے پاس آئی ہے اس پر جو زکوٰۃ کٹی ہے وہ بھی بالکل صحیح کٹی ہے کیونکہ اس پر بھی زکوٰۃ واجب ہوگئی تھی ۔

اکاؤنٹ کی رقم سے قرض کس طرح منہا کریں؟

البتہ اگر کسی شخص کا سارا اثاثہ بینک ہی میں ہے، خود اس کے پاس کچھ بھی موجود نہیں، اور دوسری طرف اس کے اُوپر لوگوں کے قرضے ہیں تو اس صورت میں بینک تو تاریخ آنے پر زکوٰۃ کاٹ لیتا ہے حالانکہ اس رقم سے قرضے منہا نہیں ہوتے، جس کے نتیجے میں زیادہ زکوٰۃ کٹ جاتی ہے ۔ اس کا ایک حل تو یہ ہے کہ یا تو آدمی وہ تاریخ آنے سے پہلے اپنی رقم بینک سے نکال لے یا کرنٹ اکاؤنٹ میں رکھ دے ۔ بلکہ ہر شخص کو چاہئے کہ وہ اپنی رقم کرنٹ اکاؤنٹ ہی میں رکھے، سیونگ اکاؤنٹ میں بالکل نہ رکھے، اس لئے کہ وہ تو سودی اکاؤنٹ ہے اور کرنٹ اکاؤنٹ میں زکوٰۃ نہیں کٹتی ۔ بہرحال زکوٰۃ کی تاریخ آنے سے پہلے وہ رقم کرنٹ اکاؤنٹ میں منتقل کر دے، جب کرنٹ اکاؤنٹ سے زکوٰۃ نہیں کٹے گی تو آپ اپنے طور پر حساب کر کے قرض منہا کر کے زکوٰۃ ادا کریں ۔ دوسرا حل یہ ہے کہ وہ شخص بینک کو لکھ کر دیدے کہ میں صاحبِ نصاب نہیں ہوں اور صاحبِ نصاب نہ ہونے کی وجہ سے میرے اُوپر زکوٰۃ واجب نہیں ہے ۔ اگر یہ لکھ کر دیدے تو قانوناً اس کی رقم سے زکوٰۃ نہیں کاٹی جائے گی ۔

کمپنی کے شیئرز کی زکوٰۃ کاٹنا

ایک مسئلہ کمپنی کے شیئرز کا ہے ۔ جب کمپنی شیئرز پر سالانہ منافع تقسیم کرتی ہے تو اس وقت وہ کمپنی زکوٰۃ کاٹ لیتی ہے، لیکن کمپنی ان شیئرز کی جو زکوٰۃ کاٹتی ہے وہ اس شیئرز کی فیس ویلیو (Face Value) کی بنیاد پر زکوٰۃ کاٹتی ہے، حالانکہ شرعاً ان شیئرز کی مارکیٹ قیمت پر زکوٰۃ واجب ہے، لہٰذا فیس ویلیو پر جو زکوٰۃ کاٹ لی گئی ہے وہ تو ادا ہوگئی البتہ فیس ویلیو اور مارکیٹ ویلیو کے درمیان جو فرق ہے، اس کا آپ کو اس بنیاد پر حساب کرنا ہوگا جس کی تفصیل شیئرز کی زکوٰۃ کے بارے میں بیان کی گئی ہے ۔ مثلاً ایک شیئر کی فیس ویلیو پچاس روپے تھی اور اس کی مارکیٹ ویلیو ساٹھ روپے ہے، تو اب کمپنی والوں نے پچاس روپے کی زکوٰۃ ادا کر دی، لہٰذا دس روپے کی زکوٰۃ آپ کو الگ سے نکالنی ہوگی ۔ کمپنی

کے شیئرز اور این آئی ٹی یونٹ دونوں کے اندر یہی صورت ہے، لہٰذا جہاں کہیں فیس ویلیو پر زکوٰۃ کٹتی ہے وہاں مارکیٹ ویلیو کا حساب کر کے دونوں کے درمیان جو فرق ہے اس کی زکوٰۃ ادا کرنا ضروری ہے۔

زکوٰۃ کی تاریخ کیا ہونی چاہئے؟

ایک بات یہ سمجھ لیں کہ زکوٰۃ کے لئے شرعاً کوئی تاریخ مقرر نہیں ہے اور نہ کوئی زمانہ مقرر ہے کہ اس زمانے میں یا اس تاریخ میں زکوٰۃ ادا کی جائے، بلکہ ہر آدمی کی زکوٰۃ کی تاریخ جدا ہوتی ہے۔ شرعاً زکوٰۃ کی اصل تاریخ وہ ہے جس تاریخ اور جس دن آدمی پہلی مرتبہ صاحبِ نصاب بنا۔ مثلاً ایک شخص یکم محرام الحرام کو پہلی مرتبہ صاحبِ نصاب بنا تو اس کی زکوٰۃ کی تاریخ یکم محرم الحرام ہوگئی، اب آئندہ ہر سال اس کو یکم محرم الحرام کو اپنی زکوٰۃ کا حساب کرنا چاہئے۔ لیکن اکثر ایسا ہوتا ہے کہ لوگوں کو یہ یاد نہیں رہتا کہ ہم کس تاریخ کو پہلی مرتبہ صاحبِ نصاب بنے تھے، اس لئے اس مجبوری کی وجہ سے وہ اپنے لئے کوئی ایسی تاریخ زکوٰۃ کے حساب کی مقرر کرلے جس میں اس کے لئے حساب لگانا آسان ہو، پھر آئندہ ہر سال اسی تاریخ کو زکوٰۃ کا حساب کر کے زکوٰۃ ادا کرے، البتہ احتیاطاً کچھ زیادہ ادا کردیں۔

کیا رمضان المبارک کی تاریخ مقرر کر سکتے ہیں؟

عام طور پر لوگ رمضان المبارک میں زکوٰۃ نکالتے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ حدیث شریف میں ہے کہ رمضان المبارک میں ایک فرض کا ثواب ستر گنا بڑھا دیا جاتا ہے۔

لہٰذا زکوٰۃ بھی چونکہ فرض ہے اگر رمضان المبارک میں ادا کریں گے تو اس کا ثواب بھی ستر گنا ملے گا۔ بات اپنی جگہ بالکل درست ہے اور یہ جذبہ بہت اچھا ہے، لیکن اگر کسی شخص کو اپنے صاحبِ نصاب بننے کی تاریخ معلوم ہے تو محض اس ثواب کی وجہ سے وہ شخص رمضان کی تاریخ مقرر نہیں کر سکتا، لہٰذا اس کو چاہئے کہ اسی تاریخ پر اپنی زکوٰۃ کا حساب کرے۔ البتہ زکوٰۃ کی ادائیگی میں یہ کر سکتا ہے کہ اگر تھوڑی تھوڑی زکوٰۃ ادا کر رہا ہے تو اس طرح ادا کرتا رہے اور باقی جو بچے اس کو رمضان المبارک میں ادا کردے۔ البتہ اگر تاریخ یاد نہیں ہے تو پھر گنجائش ہے کہ رمضان المبارک کی کوئی تاریخ مقرر کرلے، البتہ احتیاطاً زیادہ ادا کردے تاکہ اگر تاریخ کے آگے پیچھے ہونے کی وجہ سے جو فرق ہو گیا ہو وہ فرق بھی پورا ہو جائے۔

پھر جب ایک مرتبہ جو تاریخ مقرر کرلے تو پھر ہر سال اسی تاریخ کو اپنا حساب لگائے اور یہ

دیکھے کہ اس تاریخ میں میرے کیا کیا اثاثے موجود ہیں، اس تاریخ میں نقد رقم کتنی ہے، اگر سونا موجود ہے تو اسی تاریخ کی سونے کی قیمت لگائے، اگر شیئرز ہیں تو اسی تاریخ کی ان شیئرز کی قیمت لگائے، اگر اسٹاک کی قیمت لگانی ہے تو اسی تاریخ کی اسٹاک کی قیمت لگائے اور پھر ہر سال اسی تاریخ کو حساب کر کے زکوۃ ادا کرنی چاہئے، اس تاریخ سے آگے پیچھے نہیں کرنا چاہئے۔

بہرحال، زکوۃ کے بارے میں یہ تھوڑی سی تفصیل عرض کر دی۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان احکام پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.

ذکر اللہ کی اہمیت ☆

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ. وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِیْنَ. وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِهِ الْکَرِیْمِ. وَعَلٰی اٰلِهِ وَأَصْحَابِهِ أَجْمَعِیْنَ.

ہر سال رمضان المبارک میں ظہر کی نماز کے بعد حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ''انفاسِ عیسیٰ'' سے ملفوظات سنانے کا معمول ہے، لیکن اس سال اسفار کی وجہ سے یہ سلسلہ اب تک شروع نہ ہو سکا، اور اب صرف چند روز باقی ہیں، اس لئے خیال آیا کہ اس کتاب کا کوئی ایک حصہ لے لیا جائے اور اس پر کچھ بیان ہو جائے۔ میرا ذہن اس طرف گیا کہ یہ رمضان المبارک کا آخری عشرہ چل رہا ہے۔

یہ عشرہ پورے رمضان کا خلاصہ اور نچوڑ ہے، اللہ جل جلالہ نے اس عشرے میں رحمتوں کے دروازے کھولے ہوئے ہیں، ہر طرف سے رحمتوں کی بارش برس رہی ہے، طاق راتوں میں شبِ قدر ہونے کا احتمال ہے، اور حدیث شریف میں اس عشرے کو ''عِتْقٌ مِّنَ النِّیْرَانِ'' قرار دیا گیا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ اس عشرے میں بندوں کو جہنم سے رہائی کا پروانہ عطا فرماتے ہیں۔ (۱)

رمضان کے آخری عشرہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی کیفیت

حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب رمضان المبارک کا آخری عشرہ داخل ہوتا تو حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ حال ہوتا:

''شَدَّ مِیْزَرَهٗ وَأَحْیَا لَیْلَهٗ وَأَیْقَظَ أَهْلَهٗ'' (۲)

اس کے لفظی معنی یہ ہیں کہ آپ اپنی ازار باندھ لیتے تھے، لیکن اس سے ایک محاورہ کی طرف

☆ اصلاحی مجالس (۳/۳۰ تا ۴۷) بعد از نماز ظہر، رمضان المبارک، دار العلوم، کراچی، اصلاحی مواعظ (۲/۱۷ تا ۹۲)

(۱) کنز العمال، رقم: ۲۳۶۶۸ (۸/۴٦۳)، الترغیب والترهیب، رقم: ۱٤۸۳ (۲/۵۷)، مجمع الزوائد (٤/۳٦۸)

(۲) صحیح البخاری، کتاب صلاة التراویح، باب العمل فی العشر الأواخر من رمضان، رقم: ۱۸۸٤، صحیح مسلم، کتاب الاعتکاف، باب الإجتهاد فی (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

اشارہ ہے، اور وہ ہے کسی کام کے لئے کمر کس لینا، یعنی آپ کمر کس لیتے تھے، اور عبادت میں زیادہ سے زیادہ محنت اور مشقت اُٹھانے کے لئے تیار ہو جاتے تھے۔ وَأَحْيَىٰ لَيْلَهٗ، اور اپنی رات کو زندہ رکھتے، یعنی رات کے وقت جاگتے اور اللہ تعالیٰ کی عبادت میں جاگ کر رات گزارتے۔ وَأَيْقَظَ أَهْلَهٗ، اور اپنے گھر والوں کو بھی عبادت کے لئے بیدار کرتے۔

عام دنوں میں تہجد کے وقت کیفیت

عام دنوں میں حضور اقدس ﷺ کا معمول یہ تھا کہ جب رات کو تہجد کے لئے بیدار ہوتے تو اس بات کا اہتمام فرماتے کہ گھر والوں کی نیند میں خلل نہ آئے، چنانچہ حدیث شریف میں یہ الفاظ ہیں:

"قَامَ رُوَيْدًا وَفَتَحَ الْبَابَ رُوَيْدًا"(1)

جب آپ بستر سے کھڑے ہوتے تو آہستہ سے کھڑے ہوتے، کہیں ایسا نہ ہو کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی آنکھ کھل جائے، اور جب دروازہ کھولتے تو بہت آہستہ سے کھولتے تاکہ ان کی نیند میں خلل نہ آئے۔

اپنے گھر والوں کی نیند کا اتنا احساس تھا، لیکن جب رمضان المبارک کا عشرہ اخیرہ داخل ہوتا تو اپنے گھر والوں کو اہتمام سے بیدار فرماتے کہ یہ عبادت کا وقت ہے، اس وقت میں اللہ کی عبادت کرو۔

بعض روایات میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ وَكَثُرَ صَلَاتَهٗ یعنی ان ایام میں آپ ﷺ نماز کی کثرت فرماتے۔ اور عبادت کا یہ اہتمام صرف طاق راتوں میں نہیں ہوتا تھا بلکہ پورے عشرے کی تمام راتوں میں یہ اہتمام فرماتے۔

آخری عشرہ کس طرح گزارا جائے؟

بہرحال! یہ عشرہ اخیرہ اسی کام کے لئے ہے کہ اس کو اللہ تعالیٰ کے ذکر میں گزارا جائے، نماز بھی ذکر کا ایک شعبہ ہے، عبادات بھی ذکر کا شعبہ ہیں، اور مقصد یہ ہے کہ رمضان المبارک کا یہ عشرہ اخیرہ اللہ جل شانہ کی یاد میں گزرے اور ذکرِ قلبی اور ذکرِ لسانی میں یہ وقت گزرے۔

میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ اس آخری عشرہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) العشر الأواخر من شهر رمضان، رقم: ٢٠٠٨، سنن أبي داود، كتاب الصلاة، باب في قيام شهر رمضان، رقم: ١١٦٨، سنن ابن ماجه، كتاب الصيام، باب في فضل العشر الأواخر من شهر رمضان، رقم: ١٧٥٨، مسند أحمد، رقم: ٢٣٠٠١

(1) سنن النسائي، كتاب الجنائز، باب الأمر بالإستغفار المؤمنين، رقم: ٢٠١٠

کی راتوں کو جلسوں میں، تقریروں میں اور تقریبات اور دعوتوں میں ضائع کرنا بڑی خطرناک بات ہے، یہ راتیں جلسے اور تقریروں کی نہیں ہیں، بلکہ یہ محض عمل کرنے کی راتیں ہیں، بس انسان ہو اور گوشۂ تنہائی ہو، اور اپنے مالک کے ساتھ رابطہ قائم ہو، وہ ہو اور اس کا اللہ ہو، تیسرا کوئی نہ ہو، اس طریقے سے اس عشرے کو گزارو، اور ذکر میں گزارو، زبان سے ذکر ہو، دل سے ذکر ہو، چلتے پھرتے، اُٹھتے بیٹھتے، ہر حالت میں اللہ کا ذکر ہو، بلکہ بازار میں، دفتر میں، گھر کے کام کاج میں مصروف ہو، تب بھی زبان پر اور دل میں اللہ کا ذکر ہو اور یہ کیفیت ہو کہ

دل بیار دست بکار

یعنی ہاتھ تو کام کاج میں لگا ہو اور دل اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو۔

ایمان والوں سے خطاب

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًا﴾ (۱)

''اے ایمان والو! اللہ کا ذکر کثرت سے کرو''

بعض طلبہ یہ سمجھتے ہیں کہ ذکر کرنا تو صوفیوں کا کام ہے، مولویوں کو اور علماء کو ذکر سے کیا کام؟ علماء کرام کا کام تو یہ ہے کہ وہ وعظ کریں، تبلیغ کریں، تدریس کریں، سبق پڑھیں پڑھائیں، مطالعہ کریں، تکرار کریں وغیرہ، ذکر سے مولوی کا کیا کام؟ ذکر کرنا تو صوفیوں کا کام ہے، لہٰذا جب خانقاہ میں جائیں گے تو وہاں ذکر کریں گے۔ ارے بھائی! یہ آیت جو میں نے پڑھی اس میں تو تمام ایمان والوں سے خطاب ہو رہا ہے، اب یہ بتائیں کہ مولوی ایمان والوں میں داخل ہے یا نہیں؟ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا کے عموم کے اندر سب داخل ہیں، لہٰذا یہ سمجھنا کہ ہم تو طالب علم ہیں، ہم تو کتاب پڑھیں گے، مطالعہ کریں گے، تکرار کریں گے، ذکر نہیں کریں گے، یاد رکھئے! یہ بڑی خطرناک بات ہے۔

ذکر میں کثرت مطلوب ہے

اور پھر اس آیت میں فرمایا کہ اے ایمان والو! اللہ کا ذکر کثرت سے کرو، جس کا مطلب یہ ہے کہ صرف ایک دو مرتبہ ذکر کر لینا کافی نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کے نام کی رٹ لگاؤ۔ اُٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے ہر وقت تمہاری زبان پر ذکر جاری رہے۔ ایک صحابی نے حضورِ اقدس ﷺ سے سوال کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ! قیامت کے روز درجہ کے اعتبار سے افضل درجہ کس بندے کا ہوگا؟ آپ ﷺ نے

(۱) الاحزاب: ۴۱

جواب میں فرمایا:

((اَلذّٰاكِرُوْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّالذّٰاكِرَاتُ))(۱)

''جو کثرت سے اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے والے مرد اور عورتیں ہیں''

دھیان کے بغیر ذکر کرنا

بعض لوگوں کے دلوں میں یہ شبہ ہوتا ہے کہ یہ کیسا ذکر ہے کہ دل و دماغ تو کہیں اور مشغول ہیں اور زبان سے ذکر کر رہا ہے، سبحان اللہ، الحمد للہ، لا الٰہ الا اللہ کی تسبیحات پڑھ رہا ہے، لیکن دھیان کہیں، فکر کہیں، دل کہیں، دماغ کہیں، تو ایسے ذکر سے کیا فائدہ؟ یاد رکھئے! یہ شیطان کا دھوکہ ہے، ارے اگر صرف زبان کو اللہ کے ذکر کی توفیق ہو رہی ہے، چاہے دل و دماغ کہیں اور مشغول ہیں، یہ بھی اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے، یہ بھی بڑی دولت ہے۔ ارے یہ دولت کیا کم ہے کہ جسم کے تمام اعضاء میں سے ایک عضو تو ان کی یاد میں مشغول ہے۔

زبان پر ذکر ہو، دل میں خیالات ہوں

چنانچہ اس پر لوگوں کے درمیان ایک شعر مشہور ہے کہ؂

بر زبان تسبیح و در دل گاؤ خر

ایں چنیں تسبیح کے دارد اثر

یعنی زبان پر تسبیح جاری ہو اور دل میں گائے اور گدھے کا خیال آرہا ہو، ایسی تسبیح کا کیا اثر اور کیا فائدہ؟ کسی شاعر نے یہ شعر کہہ دیا، حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جس شخص نے یہ شعر کہا ہے وہ حقیقت شناس نہیں ہے، حقیقت تو یہ ہے کہ؂

بر زبان تسبیح و در دل گاؤ خر

ایں چنیں تسبیح ہم دارد اثر

یعنی اگر زبان پر تسبیح جاری ہے، اور دل میں گائے اور گدھے کا خیال آرہا ہے، اللہ کے فضل سے ایسی تسبیح بھی اپنا اثر رکھتی ہے۔ زبان کا ذکر اس راہ کی پہلی سیڑھی ہے۔ اگر زبان اللہ کے ذکر سے تر نہیں ہوگی تو پھر دل کبھی اللہ کے ذکر سے آباد نہیں ہوگا۔ جو شخص اس پہلی سیڑھی کو قطع نہیں کرے گا، اس

---

(۱) صحیح مسلم، کتاب الذکر والدعاء والتوبة والاستغفار، باب الحث علی ذکر الله تعالٰی، رقم: ٤٨٣٤، سنن الترمذی، کتاب الدعوات عن رسول الله، رقم: ٣٢٩٨، مسند أحمد، رقم: ٨٩٦٤

کے دل میں اللہ کی یاد کیسے سمائے گی؟ اس لئے زبان سے ذکر کرنا اللہ تعالیٰ کی طرف بڑھنے کا، اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق قائم کرنے کا اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ رابطہ استوار کرنے کا پہلا زینہ ہے۔ اگر زبان سے ذکر نہیں ہے تو گویا پہلی سیڑھی ہی موجود نہیں، اس لئے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ زبان سے ذکر کا کیا فائدہ جب دل ہی متوجہ نہیں ہے۔ بلکہ زبان سے ذکر کرتے رہو چاہے دل لگے یا نہ لگے، جمعیتِ خاطر پیدا ہو یا نہ ہو، لیکن تم ذکر کرتے رہو۔ تمہارا کام یہ ہے کہ اللہ کے نام کی رٹ لگاؤ۔ رفتہ رفتہ اللہ تعالیٰ اسی کے ذریعہ دل کو بھی متوجہ فرما دیں گے۔ اگر فرض کریں کہ ساری عمر دل اس طرف متوجہ نہیں ہوا، تب بھی زبان سے ذکر فائدے سے خالی نہیں۔

ذکر اللہ ایک توانائی ہے

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ یہ ذکر ایک انرجی اور توانائی ہے، لہٰذا صبح اُٹھنے کے بعد ناشتہ کرنے سے پہلے یہ انرجی اور توانائی حاصل کرلو، اس لئے کہ اللہ کا ذکر دلوں میں توانائی پیدا کرتا ہے، ارادوں میں توانائی پیدا کرتا ہے، ہمت میں طاقت عطا کرتا ہے، اور اس کے نتیجے میں انسان کے اندر شیطان اور نفس سے مقابلے کے لئے ہمت پیدا ہو جاتی ہے۔ لہٰذا نفس و شیطان کو شکست دینے میں ذکر کو بڑا دخل ہے، پھر یہ ذکر کرنے والا شیطان سے مغلوب نہیں ہوتا، اور اسی زبانی ذکر ہی کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔

اللہ کے ذکر نے گناہ سے روک دیا

جس وقت حضرت یوسف علیہ السلام کے سامنے گناہ کا موقع آیا اور تمام اسباب جمع ہو گئے، تو اس وقت اس گناہ سے ذکر نے روک دیا، اس لئے کہ جب زلیخا نے کہا: ''هَيْتَ لَكَ'' تو جواب میں انہوں نے فرمایا: ''معاذاللّٰہ'' اللہ کی پناہ۔ (۱)

اس موقع پر اللہ کی پناہ کے احساس نے یہ طاقت دی اور اتنے دلربا ماحول میں جس میں انسان کے پھسل جانے کا ننانوے فیصد احتمال موجود تھا، اس اللہ کے ذکر نے ان کو گناہ سے روک دیا۔

ذکر رگ و پے میں سرایت کر چکا تھا

اس کے بعد اگلا جملہ حضرت یوسف علیہ السلام نے یہ فرمایا:

﴿إِنَّهُ رَبِّي أَحْسَنَ مَثْوَايَ﴾ (۲)

---

(۱) یوسف:۲۳ (۲) یوسف:۲۳

حضرات مفسرین نے اس جملہ کی دو تفسیریں کی ہیں۔ بعض حضرات نے تو فرمایا کہ ''رَبی'' سے مراد عزیز مصر ہیں، زلیخا جس کی بیوی تھی، اور بعض حضرات نے فرمایا کہ ''رَبیؔ'' سے مراد ''اللہ جل شانہ'' ہیں، اور اشارہ اس جملے سے اس طرف فرمایا کہ اگرچہ تم نے دروازے بند کر دیئے ہیں اور دروازوں پر تالے ڈال دیے ہیں اس خیال سے کہ اس عمل کا کسی کو پتہ نہ چلے، لیکن میرا ایک پروردگا ہے جو مجھے اس حالت میں بھی دیکھ رہا ہے، جس نے مجھے بہترین ٹھکانہ دیا ہے۔ تو "إِنَّهُ رَبِّيْ" کا خیال ذکر کی برکت سے آرہا ہے، وہ ذکر جوان کی رگ دپے میں سرایت کر چکا تھا، اور اللہ تعالیٰ کی یاد ان کے دل و دماغ میں پیوست ہو چکی تھی، اس کے نتیجے میں وہ اس گناہ سے بچ گئے۔ بہرحال! یہ ذکر ایک توانائی اور انرجی ہے جس کو صبح کے وقت کاروبارِ زندگی میں داخل ہونے سے پہلے حاصل کر لینا چاہئے۔

ذکرِ مسنون کے لئے اجازت کی ضرورت نہیں

عام طریقہ تو یہ ہے کہ جب انسان کسی شیخ کی طرف رجوع کرتا ہے تو شیخ اس کو کچھ ذکر اور تسبیحات بتاتا ہے کہ صبح کے وقت یہ ذکر کر لیا کرو اور شام کے وقت یہ ذکر کر لیا کرو۔ لیکن بعض تسبیحات وہ ہیں جو حضورِ اقدس ﷺ نے بتادی ہیں، ان تسبیحات کو پڑھنے کے لئے کسی کی اجازت کی ضرورت نہیں، مثلاً روزانہ ایک تسبیح "سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ أَكْبَرُ" ایک تسبیح "سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَظِيْمِ" ایک تسبیح ''استغفار'' کی اور ایک تسبیح ''درود شریف'' کی۔ یہ چار تسبیحات ہر انسان روزانہ پڑھ سکتا ہے، لہٰذا جن حضرات کے معمولات میں یہ تسبیحات شامل نہیں ہیں، وہ اپنے معمولات میں ان کو شامل کر لیں۔

بہرحال! اس کتاب ''انفاسِ عیسیٰ'' میں حضرت والا نے ''ذکر'' کے بارے میں چند ملفوظات ذکر فرمائے ہیں، اس لئے خیال آیا کہ اس رمضان میں ''ذکر'' کے بارے میں ملفوظات پڑھ کر اس کی کچھ تشریح عرض کر دی جائے۔

ذکر میں مشقت خود نافع ہے

ایک شخص نے حضرت والا کو خط میں اپنا حال لکھا:

''ذکر طبیعت پر بہت بار معلوم ہوتا ہے، جب کرنے بیٹھے جی گھبرا اُٹھتا ہے''

جواب میں حضرت والا نے لکھا:

''بار'' ایک مشقت ہے، مشقت میں اگر جی نہ لگے تو سمجھ لو کہ خود مشقت بھی نفع میں جی لگنے سے کم نہیں، جس طرح سے بھی ہو حتی الوسع پورا کر لیا کیجئے، شدہ شدہ سب

دشواری مبدل بآسانی ہوجائے گی''(۱)

جب آدمی ذکر کرنا شروع کرتا ہے تو پہلے مرحلے میں اس کا دل بہت اُلجھتا ہے اور اس کو مشقت معلوم ہوتی ہے، اور جب ذکر کرنے بیٹھتا ہے تو دل گھبرانے لگتا ہے۔ بعض لوگوں کا یہ حال ہوتا ہے کہ جب ذکر کرنے بیٹھے تو دل گھبرا گیا اور طبیعت اس میں نہیں چلی اور دل نہیں لگا، تو وہ لوگ ہمت ہار بیٹھتے ہیں اور ذکر چھوڑ بیٹھتے ہیں، ایسے لوگ محروم رہ جاتے ہیں۔

ذکر میں زبردستی لگے رہو

ذکر کا طریقہ یہ ہے کہ جب ذکر کرنے بیٹھے تو اب دل لگے یا نہ لگے، دل چاہے یا نہ چاہے، دل گھبرائے یا وحشت ہو، لیکن پھر بھی ذکر میں لگا رہے، اور دل سے کہہ دے کہ چاہے تو گھبرائے یا پریشان ہو، مجھے تو یہ کام کرنا ہے۔ ہمارے حضرت والا فرمایا کرتے تھے کہ اپنے نفس سے یہ کہہ دیا کرو کہ۔

آرزوئیں خون ہوں یا حسرتیں برباد ہوں
اب تو اس دل کو بنانا ہے ترے قابل مجھے

ایک مرتبہ اس دل سے یہ کہہ دو کہ تو اس سے بھاگ رہا ہے اور گھبرا رہا ہے، مجھے کوئی پرواہ نہیں، میں تو یہ کام کروں گا۔ جس دن آدمی نے یہ عزم کرلیا تو پھر انشاء اللہ چند ہی روز میں یہ گھبراہٹ اور پریشانی ختم ہوجائے گی، لیکن اگر اس گھبراہٹ کی وجہ سے بھاگ کھڑا ہوا اور ذکر چھوڑ بیٹھا تو پھر دوبارہ ذکر کی طرف لوٹنا مشکل ہوجاتا ہے۔

دل گھبرانے کا کوئی علاج نہیں

لوگ یہ پوچھتے ہیں کہ حضرت! اس کا کوئی علاج بتایئے کہ ذکر میں دل گھبرائے نہیں اور دل ذکر میں لگ جایا کرے۔ یاد رکھئے! اس کا کوئی علاج نہیں، کوئی ایسی گولی اور سفوف نہیں ہے اور کوئی ایسا معجون نہیں ہے کہ وہ اگر کھلا دیا جائے تو اس کے نتیجے میں ذکر میں دل لگ جایا کرے۔ اس کا علاج یہی ہے کہ دل لگے یا نہ لگے، لیکن اپنی ہمت کو استعمال کرکے انسان لگا رہے۔ دیکھئے! اس ملفوظ میں حضرت والا نے ذکر میں دل نہ لگنے کے بارے میں اور ذکر میں بار محسوس ہونے کے بارے میں کیا جواب ارشاد فرمایا ہے۔

(۱) انفاسِ عیسیٰ، ص:۶۳

یہ مشقت اور بار فائدے سے خالی نہیں

فرمایا کہ "بار" ایک مشقت ہے، یعنی طبیعت پر ذکر کرنے سے جو بار ہوتا ہے وہ ایک مشقت ہے، اور مشقت میں اگر جی نہ لگے تو سمجھ لو کہ خود مشقت بھی نفع میں جی لگنے سے کم نہیں، یعنی اگر ذکر کرنے میں مشقت ہو رہی ہے اور اس میں جی نہیں لگ رہا ہے تو اس دل نہ لگنے کی صورت میں یہ سوچو کہ یہ جو مشقت ہو رہی ہے، یہ بھی فائدہ دینے میں دل لگنے سے کم نہیں۔ کیونکہ اگر ذکر میں دل لگتا اور خوب خشوع اور خضوع کے ساتھ دل لگا کر ذکر کرتے اور اس سے جو فائدہ حاصل ہوتا، اس مشقت کا فائدہ بھی اس سے کم نہیں۔

ایسے ذکر میں نورانیت زیادہ ہوتی ہے

بلکہ حضرت والا نے بعض جگہ لکھا ہے کہ اس مشقت والے ذکر کا فائدہ دل لگا کر ذکر کرنے کے فائدے سے بڑھ جاتا ہے، کیونکہ جس شخص کو ذکر میں لطف اور مزہ آ رہا ہے اور دل لگ رہا ہے، اس کے ذکر کے اندر تو یہ احتمال موجود ہے کہ شاید یہ حظِ نفس کے لئے ذکر کر رہا ہو اور مزہ اور لطف کی خاطر ذکر کر رہا ہو، بخلاف اس شخص کے جس کو ذکر کرنے میں مشقت ہو رہی ہے، اس کو ذکر کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی رضامندی کے علاوہ اور کچھ مقصود نہیں، اس لئے ہوسکتا ہے کہ مشقت کے ساتھ ذکر کرنے والا نفع اور ثواب میں دوسروں سے آگے بڑھ جائے۔ اس لئے کبھی یہ نہ سوچو کہ مشقت کے ساتھ ذکر کرنے میں کیا فائدہ؟ ارے اس میں بھی بڑا فائدہ ہے، یہ جو تم اس حال میں ذکر کر رہے ہو کہ تمہارا دل کہیں ہے اور دماغ کہیں ہے اور ذکر میں دل نہیں لگ رہا ہے پھر بھی زبردستی دل لگا رہے ہو، یہ ذکر اللہ تعالیٰ کو بہت پسند ہے۔ بعض اوقات ایسے ذکر میں نورانیت اور روحانیت کیف اور مزے والے ذکر سے زیادہ ہوتی ہے۔

روحانیت اور نورانیت کی حقیقت

ایک مرتبہ ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس بارے میں تفصیل سے بیان فرمایا کہ یہ روحانیت اور نورانیت کیا چیز ہے؟ چنانچہ فرمایا کہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اگر کوئی اچھا خواب نظر آجائے، اور کوئی کشف ہو جائے، اور عبادات میں مزہ آنے لگے تو یہ نورانیت اور روحانیت کی دلیل ہے۔ حالانکہ ان چیزوں کا نورانیت اور روحانیت سے کوئی تعلق نہیں، بلکہ نورانیت اللہ کے حکم کی اتباع میں ہے، جس دن اللہ تعالیٰ کے حکم کے آگے سر جھکا دیا، اس دن نورانیت حاصل ہوگئی، چاہے ساری عمر

نماز پڑھنے میں مزہ نہ آیا ہو، لیکن اس شخص کو نورانیت مکمل حاصل ہے۔

ان کی کوئی حقیقت نہیں

ہمارے یہاں ایک صاحب جو شیخ طریقت کہلاتے ہیں، جن کے مریدوں کی تعداد بھی بیشمار بتائی جاتی ہے، انہوں نے لکھا ہے کہ: ''جو شیخ اپنے مرید کو مسجدِ حرام میں نماز نہ پڑھوا سکے وہ شیخ بننے کے لائق نہیں'' یعنی وہ شیخ مرید کے سامنے ''مسجدِ حرام'' منکشف کرائے اور اس مرید کو اس میں نماز پڑھوادے، جو پیر ایسا نہ کر سکے وہ پیر بننے کے لائق نہیں۔ چنانچہ ان باتوں کی وجہ سے لوگوں کے ذہنوں میں یہ بات بیٹھی ہوئی ہے کہ یہ مراقبات، یہ مکاشفات وغیرہ یہ ایسی چیزیں ہیں جن کی وجہ سے انسان کو تقربِ الٰہی حاصل ہوتا ہے۔

یاد رکھئے! ان چیزوں کی کوئی حقیقت نہیں، اگر کسی کو یہ چیزیں حاصل ہو جائیں تو وہ اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے، مگر یہ بہت نازک نعمت ہے، بسا اوقات یہ ایک امتحان بھی ہوتی ہے، اس کے حاصل ہونے کے بعد گمراہی کے راستے پر پڑ جانے کا اندیشہ پیدا ہو جاتا ہے، بہت سے لوگوں کو شیطان نے انہی چیزوں سے بہکا دیا۔ اس لئے کبھی ان کے حاصل کرنے کی فکر میں نہ پڑو، یہ مقصود چیزوں میں سے نہیں، زیادہ سے زیادہ محمود ہے، طبیعت کی پسندیدہ کیفیت ہے۔

اللہ سے رابطہ استوار کرلو

اصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنا رابطہ استوار کرلو، کیا اللہ تعالیٰ وہاں حرم میں بیٹھے ہوئے ہیں؟ یا بیت اللہ شریف میں بیٹھے ہوئے ہیں؟ ارے اللہ تعالیٰ تو جس طرح حرم میں موجود ہیں، اسی طرح یہاں بھی موجود ہیں، جس دن تم نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنا رابطہ استوار کرلیا، بس اسی دن تمہیں تمہارا حرم حاصل ہو گیا۔ شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ع

ہر شب شب قدر است اگر قدر بدانی

تم شبِ قدر تلاش کرتے ہو، ارے ہر رات شبِ قدر ہے اگر تم اس کی قدر پہچانو، جس رات تم نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنا رابطہ استوار کرلیا، وہ رات تمہاری شبِ قدر ہوگئی۔

تمہیں یہاں پر ''حرم'' حاصل ہو جائے گا

اس لئے یہ سمجھنا کہ اگر ہم حرم نہ گئے اور حرم میں نماز نہ پڑھی تو ہمیں کچھ حاصل نہ ہوا، یہ بات ٹھیک نہیں۔ ارے بھائی! اگر اللہ تعالیٰ حرم لے جائے تو یہ اس کا کرم اور احسان ہے، اور اگر تم وہاں نہ

جا سکے، اس لئے کہ قانونی پیچیدگیاں ہیں یا اخراجات کا انتظام نہیں ہے یا اس کے اندر سفر کی طاقت نہیں ہے، تو کیا اس وجہ سے اللہ تعالیٰ تمہیں محروم فرما دیں گے؟ ارے وہ جذبہ جو تمہیں حرم لے کر جا رہا تھا، اگر اس جذبے کو صدق و اخلاص سے یہاں بیٹھ کر استعمال کرو تو تمہیں یہاں پر ہی حرم حاصل ہو جائے گا، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کسی صاحبِ ایمان کو محروم نہیں فرماتے۔

ہر حالت میں ذکر میں مشغول رہو

خوب سمجھ لیجئے! ان کشف و کرامات کا براہِ راست دینداری سے کوئی تعلق نہیں، حق تعالیٰ کا قرب اس پر موقوف نہیں، اصل دین یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل ہو، اسی کی تعمیل میں اس کا ذکر ہو، اور اللہ تعالیٰ سے رابطہ اور تعلق ہو، اس تعلق کو استوار کرنے کی فکر ہو۔ خواہ ذکر کرنے میں مشقت ہو، طبیعت پر بار ہو، دل نہ لگے، پھر بھی بیٹھ جاؤ اور اللہ کے ذکر میں مشغول ہو جاؤ، اس اطاعت کے نتیجے میں دیکھو کہ اللہ تعالیٰ ایسی نورانیت اور برکت عطا فرماتے ہیں کہ رفتہ رفتہ یہ ذکر و اذکار بھی سہولت سے پورے ہونے لگیں گے اور اس کا اصل فائدہ رجوع الی اللہ اور تعلق مع اللہ حاصل ہو گا۔ اللہ تعالیٰ مجھے بھی اس کی توفیق عطا فرمائے اور آپ حضرات کو بھی اس کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.

ذکر کے مختلف طریقے ☆

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ. وَالْعَاقِبَۃُ لِلْمُتَّقِیْنَ. وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِہٖ الْکَرِیْمِ. وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ. اَمَّا بَعْدُ!

مشقت کے باوجود ذکر میں لگا رہے

جیسا کہ کل عرض کیا تھا کہ جب انسان ابتداءً ذکر کرنا شروع کرتا ہے تو طبیعت پر مشقت ہوتی ہے اور بار ہوتا ہے۔ یہ کیفیت صرف ذکر کے ساتھ خاص نہیں ہے، بلکہ ہر نئے کام کو شروع کرنے کے بعد ابتداءً اس کام کو کرتے ہوئے مشقت معلوم ہوتی ہے، اسی طرح ذکر اللہ کے آغاز میں بھی جب انسان اپنے آپ کو ذکر اللہ کا عادی بنانا چاہتا ہے تو بعض اوقات ذکر کرنے سے دل اُلجھتا ہے اور طبیعت پر بار محسوس ہوتا ہے۔

لیکن اس کا علاج یہ ہے کہ اس مشقت کو برداشت کیا جائے، اس بار کو اُٹھایا جائے، اور گھبرا کر ذکر کو نہ چھوڑا جائے، بلکہ دل لگے یا نہ لگے، طبیعت اُلجھے یا سلجھے، ہر حالت میں ذکر کے اندر انسان مشغول رہے، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ رفتہ رفتہ دل لگنے لگے گا۔

نماز پڑھنے میں ابتداءً مشقت ہوتی ہے

دیکھئے! بچپن میں جب ماں باپ نے کہا تھا کہ نماز پڑھو، اور ان کے کہنے پر نماز شروع کردی تھی، کیا اس وقت نماز میں تمہارا دل لگتا تھا؟ نہیں! اس وقت تمہارا دل نہیں لگتا تھا، بلکہ دل بھاگتا تھا اور طبیعت نماز پڑھنے پر آمادہ نہیں ہوتی تھی۔ جب ماں باپ نماز پڑھنے پر اصرار کرتے تو دل میں یہ خیال آتا کہ یہ ہم پر ظلم کر رہے ہیں، تو اس وقت نماز پڑھنا مشقت معلوم ہوتا تھا، لیکن رفتہ رفتہ وہ مشقت جزوِ زندگی بن گئی، اور اب یہ حالت ہوگئی کہ اگر کوئی شخص کسی نمازی سے یہ کہے کہ تو ایک لاکھ روپے لے لے اور ایک وقت کی نماز چھوڑ دے، تو وہ نمازی ایک نماز بھی چھوڑنے پر تیار نہیں ہوگا، اب اسے نماز پڑھے بغیر چین نہیں آتا۔

☆ اصلاحی مجالس (۳/۵۰ تا ۷۱) بعد از نمازِ ظہر، رمضان المبارک، دار العلوم، کراچی

ذکر جزوِ زندگی بن جاتا ہے

اسی طرح ''ذکر'' کا حال ہے کہ ابتداءً ذکر میں مشقت ہوتی ہے، وہ بوجھ معلوم ہوتا ہے، لیکن جب رفتہ رفتہ وہ ذکر معمول کے اندر شامل ہوجاتا ہے اور اس کی عادت پڑ جاتی ہے تو وہ ذکر جزوِ زندگی بن جاتا ہے، اور اللہ تعالیٰ اس ذکر کو زندگی کا ایسا حصہ بنا دیتے ہیں کہ اس کے بغیر چین نہیں آتا۔

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ اور ذکر اللہ

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ جو جلیل القدر محدث اور عالم تھے، اور علم وفضل کا بہت اُونچا مقام رکھتے تھے اور صحیح بخاری کی شرح ''فتح الباری'' کے مصنف تھے، ان کا یہ حال تھا کہ جس وقت وہ فتح الباری لکھتے اور لکھنے کے دوران قلم پر قط لگانے کی ضرورت پیش آتی ــــ چونکہ اس زمانے میں لکڑی کے قلم ہوتے تھے، لکھتے لکھتے جب ان کی نوک خراب ہوجاتی تو چاقو سے اس پر قط لگانا پڑتا تھا ــــ تو جب حافظ ابن حجرؒ کو کتاب لکھنے کے دوران قلم پر قط لگانے کی ضرورت پیش آتی تو جتنا وقت قلم پر قط لگانے میں گزرتا، اتنا وقت بھی خالی گزارنا گوارا نہیں تھا، اس لئے اس وقت کو ذکر اللہ میں گزارتے۔ (۱)

لہٰذا جب ذکر انسان کا جزوِ زندگی بن جاتا ہے تو اس کے بغیر انسان کو چین نہیں آتا۔

ذکر کا ایک طریقہ ''ذکر جہری''

بعض حضرات صوفیاء نے اس مبتدی کے لئے جس کی طبیعت ابھی ذکر اللہ سے مشقت محسوس کر رہی ہے، ذکر کے کچھ خاص طریقے بیان فرمائے ہیں کہ اس طرح ذکر کیا کرو، اس طرح ذکر کرنے سے ذکر میں دل لگے گا اور گھبراہٹ نہیں ہوگی، ورنہ اندیشہ یہ ہے کہ گھبراہٹ کے نتیجے میں وہ ذکر کرنا چھوڑ دے گا۔

ان طریقوں میں سے ایک طریقہ ''ذکر جہری'' ہے، کیونکہ اگر وہ اکیلا چپکے چپکے ذکر کرے گا تو اس سے دل اُلجھے گا اور دل گھبرائے گا، اس لئے اس سے کہا کہ تو ذرا بلند آواز سے ذکر کرلے اور تھوڑا سا لحن بھی اس میں شامل کرلے، اس کے نتیجے میں ذکر کے اندر اس کا دل لگ جائے گا۔ مثلاً اگر آہستہ آواز میں ''لا الٰہ اِلا اللہ'' کا ذکر کرتا ہے تو اس کا دل نہیں لگتا، لیکن جب بلند آواز سے اور لحن سے ذکر کرے گا تو اس کا دل لگ جائے گا۔ دل لگانے کی خاطر بزرگوں نے یہ تجویز کیا کہ ذکر جہری کرو اور لحن سے کرو۔

---

(۱) ابن حجر العسقلانی، شاکر عبدالمنعم، ص: ۱۸۵

ذکر کا ایک طریقہ ''ضرب'' لگانا

کسی کو ''ضرب'' کا طریقہ بتادیا کہ ذکر کرتے وقت ''ضرب'' لگاؤ۔ ضرب لگانے کا مطلب ہے مارنا، چوٹ لگانا، یعنی ذکر کرتے وقت کسی جگہ پر زور ڈالنا اور اس پر چوٹ مارنا۔ عملی طور پر اس کی بہت سی شکلیں اپنے تجربات سے مفید سمجھ کر اہلِ تربیت نے اختیار کی ہیں، انہیں میں ایک یہ ہے کہ جس وقت تم "لَا اِلٰہَ" کہو، اس وقت گردن اور چہرہ کو دل کے قریب لے جاؤ، اور پھر گردن کو داہنی طرف سے پیچھے کی طرف کرو، اور اس وقت یہ تصور کرو کہ دل میں اللہ تعالیٰ کے علاوہ جتنی چیزوں کی محبت ہے، اس محبت کو دل سے نکال کر پیچھے کی طرف پھینک رہا ہوں۔ اور پھر "اِلَّا اللّٰہ" کہتے وقت گردن اور چہرے کو دوبارہ دِل کے قریب لاکر جھٹکا دو، اور اس وقت یہ تصور کرو کہ میں اللہ کی محبت کو دل میں داخل کررہا ہوں۔ یہ طریقہ بزرگوں نے اس لئے تجویز کیا کہ جب ذاکر اس ''ضرب'' کے اندر مشغول ہوگا تو اس کا دل ذکر میں لگ جائے گا، اور جب بار بار اور روزانہ یہ تصور کرکے ذکر کرے گا اور اس طرح ضرب لگائے گا تو انشاء اللہ ایک وقت آئے گا کہ دل سے غیر اللہ کی محبت نکل جائے گی اور اللہ کی محبت دل میں داخل ہوجائے گی۔

''رگِ کیماس'' پکڑ کر ذکر کرنا

بہرحال! بزرگوں اور مشائخ نے ذکر کے جو خاص طریقے تجویز کیے ہیں یہ بطور علاج کے ہیں، یہ طریقے نہ تو حضورِ اقدس ﷺ سے ثابت ہیں اور نہ ہی ثابت کرنے کی ضرورت ہے۔ بعض حضرات نے اور طریقے بھی تجویز کیے ہیں، مثلاً بعض مشائخ نے فرمایا کہ جب ذکر کرنے بیٹھو تو چار زانو ہوکر بیٹھ جاؤ، اور پھر داہنے پاؤں کے انگوٹھے اور ساتھ والی اُنگلی سے بائیں طرف کے گھٹنے کے اندر کی رگ جس کو ''رگِ کیماس'' کہتے ہیں، اس کو پکڑلو، اس رگ کو پکڑنے سے دل جمعی پیدا ہوجائے گی اور فضول خیالات اور وساوس نہیں آئیں گے۔ اب یہ بات تجربہ کی ہے اور تجربہ کی بنیاد پر یہ طریقہ بتادیا۔

ذکر کا ایک طریقہ ''پاس انفاس''

اسی طرح ذکر کا ایک خاص طریقہ ''پاس انفاس'' کہلاتا ہے، اس طریقے میں یہ ہوتا ہے کہ ہر سانس کی آمد ورفت میں ذکر اللہ کو اس طرح جذب کرلیا جاتا ہے کہ ہر سانس کے ساتھ اللہ کا ذکر زبان سے جاری ہوجاتا ہے، سانس آرہا ہے تو اللہ کا ذکر ہورہا ہے، سانس جارہا ہے تو اللہ کا ذکر ہورہا ہے، ہر

سانس کی رفتار کے ساتھ اللہ کا نام نکل رہا ہے۔ اس طریقے کی مشائخ کے یہاں مشق کرائی جاتی تھی جس کے نتیجے میں یہ چیز حاصل ہو جاتی تھی۔

ذکر کے وقت ہر چیز کے ذکر کرنے کا تصور

اسی طرح ''سلطان الاذکار'' کا نام آپ نے سنا ہوگا، یہ بھی ذکر کا ایک خاص طریقہ ہے، جس میں تمام لطائف کے ساتھ ذکر کی آواز نکلتی ہے، واللہ اعلم۔ اسی طرح حضرات صوفیاء کرام نے ایک طریقہ یہ نکالا کہ جب ذکر کرنے بیٹھو تو یہ تصور کرو کہ یہ دیوار بھی میرے ساتھ ذکر کر رہی ہے، یہ چھت بھی ذکر کر رہی ہے، یہ دروازہ بھی ذکر کر رہا ہے، یہ پنکھا بھی ذکر کر رہا ہے، یہ زمین بھی ذکر کر رہی ہے، یہ آسمان بھی ذکر کر رہا ہے، یہ ساری کائنات ذکر کر رہی ہے۔ اس تصور سے ذکر کے اندر ایک خاص نشاط اور کیفیت حاصل ہو جاتی ہے۔

حضرت داؤد علیہ السلام کے ساتھ پہاڑوں اور پرندوں کا ذکر کرنا

قرآن کریم میں حضرت داؤد علیہ السلام کے ذکر کا واقعہ آتا ہے کہ جب وہ ذکر کرتے تھے تو پہاڑ اور پرندے بھی ساتھ میں ذکر کرتے تھے، فرمایا:

﴿وَسَخَّرْنَا مَعَ دَاوٗدَ الْجِبَالَ يُسَبِّحْنَ وَالطَّيْرَ﴾ (۱)

یعنی ہم نے حضرت داؤد علیہ السلام کے ساتھ پہاڑوں اور پرندوں کو مسخر کر دیا تھا جو ان کے ساتھ ذکر کیا کرتے تھے۔ حضرت داؤد علیہ السلام جب ''سُبْحَانَ اللّٰه، سُبْحَانَ اللّٰه'' کی تسبیح پڑھتے تو پہاڑ بھی اور پرندے بھی ان کے ساتھ ''سُبْحَانَ اللّٰه، سُبْحَانَ اللّٰه'' کہتے۔

پہاڑوں اور پرندوں کے ذکر سے حضرت داؤد علیہ السلام کا فائدہ

حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے مسائل السلوک'' میں لکھا ہے کہ پہاڑوں اور پرندوں کے ذکر کرنے کو اللہ تعالیٰ نے ان انعامات میں شمار فرمایا ہے جو انعامات اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام پر فرمائے تھے، تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر پہاڑ اور پرندے ذکر کرتے تھے تو اس سے حضرت داؤد علیہ السلام کو کیا فائدہ پہنچتا ہے جس کی وجہ سے ان چیزوں کو بطور انعام کے ذکر فرمایا:

﴿وَسَخَّرْنَا مَعَ دَاوٗدَ الْجِبَالَ يُسَبِّحْنَ وَالطَّيْرَ﴾

پھر خود ہی اس کا جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ یوں تو ذکر بڑی نعمت ہے، چاہے وہ ذکر کسی

---

(۱) الانبیاء: ۷۹

حالت میں بھی ہو، چاہے تنہائی میں ذکر ہو، لیکن اگر ذکر کرنے والے کے ساتھ کوئی جماعت بھی ذکر کرنے میں شامل ہو جائے تو اس کے ذکر میں نشاط پیدا ہو جاتا ہے، کیف پیدا ہو جاتا ہے، جس کے نتیجے میں اس کا دل ذکر میں خوب لگنے لگتا ہے۔ لہٰذا یہ جو پہاڑوں اور پرندوں کو مسخر کر دیا گیا اور ان سے یہ کہہ دیا گیا کہ تم بھی حضرت داؤد علیہ السلام کے ساتھ ذکر کرو، اس میں حضرت داؤد علیہ السلام پر انعام یہ ہے کہ ان کو ذکر میں نشاط پیدا ہو جائے۔ اسی لئے صوفیاء کرام نے حضرت داؤد علیہ السلام کے اس واقعے سے ذکر کا ایک طریقہ یہ نکالا کہ جب تم ذکر کرو تو یہ تصور کرو کہ یہ در و دیوار، یہ پہاڑ، یہ پرندے، یہ درخت بھی میرے ساتھ ذکر کر رہے ہیں اور اس تصور کی مشق کرو، اور مشق کی کثرت کے بعد یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ واقعۃً یہ سب چیزیں میرے ساتھ ذکر کر رہی ہیں، اس کے نتیجے میں اپنی طبیعت ذکر کی طرف مائل ہو جاتی ہے۔

ذکر کے یہ طریقے علاج ہیں

بہر حال! حضرات صوفیاء کرام نے ذکر کے جو خاص طریقے بیان فرمائے ہیں، ان کا مقصد یہ تھا کہ ذکر میں انسان کا دل لگ جائے، اور یہ طریقے بطور علاج کے بیان فرمائے ہیں۔ اس لئے یاد رکھئے کہ یہ خاص طریقے نہ مقصود ہیں، نہ مسنون ہیں، اور نہ ان طریقوں کو مسنون سمجھنا جائز ہے، مثلاً ہمارے تمام مشائخ کے یہاں دوازدہ تسبیح (بارہ تسبیح) بہت معروف ہے، یہ دوازدہ تسبیح ضرب لگا کر کی جاتی ہے، مگر یہ خاص طریقہ نہ مقصود ہے اور نہ مسنون ہے، اگر کوئی شخص اس کو مسنون سمجھ لے تو یہ طریقہ بدعت ہو جائے گا، بلکہ اس کے جائز ہونے کی شرط یہی ہے کہ اس کے بارے میں یہ تصور رکھا جائے کہ یہ طریقہ مبتدی کو صرف علاج کے طور پر بتایا جاتا ہے، تاکہ اس کا دل ذکر میں لگ جائے اور خیالات میں یکسوئی پیدا ہو جائے۔

''ضرب'' لگا کر ذکر کرنے پر اعتراض

آج کل لوگ افراط و تفریط میں مبتلا ہیں، چنانچہ بعض لوگ ضرب لگا کر ذکر کرنے کو بدعت کہتے ہیں، اور یہ کہتے ہیں کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ کہیں ثابت نہیں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح ضرب لگا کر ذکر فرمایا ہو اور نہ کسی صحابی سے ضرب لگا کر ذکر کرنا ثابت ہے، اور جب ایسا ذکر ثابت نہیں ہے اور تم لوگ ایسا ذکر کر رہے ہو، لہٰذا یہ ذکر بدعت ہے۔

پھر جوشاندہ پینا بدعت ہوگا

چنانچہ ایک صاحب مجھ سے کہنے لگے کہ آپ کے تمام مشائخ بدعتی ہیں (معاذ اللہ) اس لئے کہ یہ مشائخ ضرب لگا کر ذکر کرنے کی تلقین کرتے ہیں، اور اس طرح ذکر کرنا حضور اقدس ﷺ سے ثابت نہیں۔ میں نے ان صاحب سے پوچھا کہ جب تمہیں نزلہ زکام ہوتا ہے تو تم ''جوشاندہ'' پیتے ہو؟ کہنے لگے کہ ہاں پیتا ہوں، میں نے پوچھا کہ کیا حضور اقدس ﷺ سے جوشاندہ پینا ثابت ہے؟ یا حضور اقدس ﷺ نے کبھی جوشاندہ پیا؟ یا کسی صحابی رضی اللہ عنہ سے جوشاندہ پینا ثابت ہے؟ کہنے لگے کہ جوشاندہ پینا تو ثابت نہیں، میں نے کہا کہ جب ثابت نہیں تو آپ کا جوشاندہ پینا بدعت ہو گیا، اس لئے کہ آپ کا دعویٰ اس کے بغیر ثابت نہیں ہوسکتا کہ یوں کہا جائے کہ جو چیز حضور اقدس ﷺ سے ثابت نہ ہو وہ بدعت ہے، تو چونکہ جوشاندہ پینا بھی ثابت نہیں، لہٰذا یہ بھی بدعت ہے۔

درحقیقت صحیح بات یہ ہے کہ ذکر کرنے کے یہ سارے طریقے، علاج ہیں، یعنی جس شخص کا ذکر میں دل نہیں لگتا اور ذکر میں اس کی طبیعت مائل نہیں ہوتی، تو اس کے علاج کے لئے یہ طریقہ بتایا گیا کہ تم اس طریقے سے ذکر کرلو، تاکہ ذکر میں تمہارا دل لگ جائے، گویا کہ جوشاندہ پلایا جارہا ہے۔

یہ طریقے بدعت ہوجائیں گے

ہاں! اگر کوئی شخص ذکر کے کسی خاص طریقے کے بارے میں یہ کہہ دے کہ یہ طریقہ سنت ہے، یا یہ طریقہ مستحب ہے، یا یہ طریقہ زیادہ افضل ہے تو پھر وہ طریقہ بدعت ہوجائے گا، کیونکہ افضلیت کا مدار، استحباب کا مدار، اور سنیت کا مدار حضور اقدس ﷺ سے ثبوت پر ہے، جو چیز حضور اقدس ﷺ سے ثابت نہیں، وہ سنت نہیں ہوسکتی، وہ افضل نہیں ہوسکتی، البتہ نافع ہوسکتی ہے۔

افضل طریقہ صرف سنت کا طریقہ ہے

یعنی جو چیز حضور اقدس ﷺ سے ثابت نہیں، وہ ''نافع'' ہوسکتی ہے، اور ''انفع'' بھی ہوسکتی ہے، لیکن جو چیز حضور اقدس ﷺ سے ثابت نہیں وہ ''افضل'' نہیں ہوسکتی، ہمارے بزرگوں نے افراط اور تفریط سے ہمیشہ احتراز کیا ہے۔ اس لئے ذکر کے ان خاص طریقوں کے بارے میں نہ تو یہ کہا کہ یہ بدعت ہیں، ان کو اختیار نہ کرو، اور نہ یہ کہا کہ یہ طریقہ ''افضل'' ہے۔

ذکر خفی افضل ہے

یاد رکھئے! ذکر کے اندر افضل طریقہ ہمیشہ ہر حالت میں قیامِ قیامت تک ذکر خفی ہے، اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں، ذکر جتنا آہستہ آواز سے ہوگا اتنا ہی افضل ہوگا۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے:

﴿اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً﴾ (۱)

''اپنے رب کو عاجزی سے اور چپکے چپکے پکارو''

دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

﴿وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّخِيْفَةً وَّدُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ﴾ (۲)

''اپنے رب کو اپنے دل میں پکارو، عاجزی کے ساتھ اور ڈرتے ہوئے، اور زور کی آواز کی نسبت کم آواز کے ساتھ''

اس سے معلوم ہوا کہ زیادہ زور سے ذکر کرنا پسندیدہ نہیں، پسندیدہ ذکر وہ ہے جو آہستہ آواز کے ساتھ ہو۔

ذکر جہری جائز ہے افضل نہیں

یہ اصول ہمیشہ کا ہے، ابدی ہے اور قیامِ قیامت تک کبھی نہیں ٹوٹ سکتا کہ افضل ذکر ''ذکر خفی'' ہے، ذکر جتنا آہستہ کیا جائے گا اتنا ہی زیادہ ثواب ملے گا، البتہ ''ذکر جہری'' جائز ہے، ناجائز نہیں۔ لہٰذا ''ذکر جہری'' کبھی ''ذکر خفی'' سے افضل نہیں ہوسکتا، البتہ علاج کے طور پر ذکر جہری کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ لیکن اگر کوئی شخص ذکر جہری کو افضل سمجھنے لگے یا کوئی شخص ذکر جہری کو مقصود سمجھ لے، یا ذکر جہری کو مسنون سمجھ لے، یا ذکر جہری نہ کرنے والے پر نکیر کرنے لگے، تو پھر یہی چیز بدعت بن جاتی ہے، اسی کا نام بدعت ہے۔ اس راستے میں اسی افراط اور تفریط سے بچ کر گزرنا ہے، اس لئے ہمارے اس آخری دور کے بزرگ ذکر جہری کی زیادہ ہمت افزائی نہیں کرتے بلکہ ذکر خفی کی تلقین فرماتے ہیں۔

یہ احداث فی الدین اور بدعت ہے

بات دراصل یہ ہے کہ جب کام آگے بڑھتا ہے تو اپنی حد پر نہیں رہتا، اب ذکر کے مندرجہ بالا طریقے صوفیاء کرام نے بطور علاج بتائے تھے، لیکن رفتہ رفتہ یہ طریقے خود مقصود بن گئے، اب ہر سلسلہ

---

(۱) الاعراف: ۵۵ (۲) الاعراف: ۲۰۵

والوں نے اپنے لئے ذکر کا ایک طریقہ مقرر کرلیا ہے کہ فلاں سلسلے میں ''پاس انفاس'' کے طریقے سے ذکر ہوتا ہے اور فلاں سلسلے میں ''سلطان الاذکار'' ہوتا ہے، اور فلاں سلسلے میں فلاں طریقے سے ذکر ہوتا ہے، یہ اس سلسلے کی خصوصیات بن گئیں، اب اس سلسلے سے وابستہ لوگ باہر کے لوگوں کو یہ باور کراتے ہیں کہ آپ جس طریقے سے ذکر کرتے ہیں وہ طریقہ صحیح نہیں یا افضل نہیں، صحیح اور افضل طریقہ وہ ہے جو ہمارے شیخ نے بتایا ہے۔ اس طرح سے جو چیز مقصود نہیں تھی وہ مقصود قرار پا گئی، اسی کا نام ''احداث فی الدین'' ہے، اسی کا نام ''بدعت'' ہے، اس کی جڑ کاٹنی ہے۔

ذکر میں ضرب لگانا مقصود نہیں

چنانچہ حضرت والا نے ارشاد فرمایا:

''طریقِ خاص سے ضرب نہ مقصود ہے اور نہ موقوف علیہ مقصود، جس طرح بے تکلف بن جائے کافی ہے''(۱)

یعنی ضرب لگا کر ذکر کرنے کا جو طریقہ ہے، یہ نہ تو خود مقصود ہے اور نہ ہی ذکر کا جو مقصود ہے وہ اس ضرب پر موقوف ہے کہ اس ضرب کے بغیر وہ مقصود حاصل نہ ہوتا ہو، بلکہ ضرب کے بغیر بھی مقصود حاصل ہو جاتا ہے۔ ارے مقصود تو ان کا ذکر ہے اور ان کا نام لینا ہے جس طرح بھی بن پڑے، چاہے ضرب سے ہو یا بغیر ضرب کے ہو، لہٰذا ان قیود میں زیادہ پڑنے کی ضرورت نہیں۔

اصل مقصود ان کا نام لینا ہے

ایک صاحب میرے شیخ حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس آئے اور کہا کہ حضرت! تسبیحات تو پڑھتا ہوں، لیکن دوازدہ تسبیح نہیں ہو پاتیں، اس کو اس خاص طریقے سے پڑھنے کا وقت نہیں ملتا۔ حضرت نے ان صاحب سے پوچھا کہ طریقہ مقصود ہے یا ذکر مقصود ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ حضرت! اصل مقصد تو ذکر ہے، طریقہ مقصود نہیں، آپ نے فرمایا کہ تم دوازدہ تسبیح خاص طریقے کے بغیر پڑھا کرو۔ پھر فرمایا کہ میں بعض اوقات خاص طریقہ کے بغیر دوازدہ تسبیح پڑھ لیتا ہوں جو اطمینان سے ۱۵ منٹ میں پوری ہو جاتی ہے، اس لئے کہ اگر خاص طریقے سے ضرب لگا کر پڑھا جائے تو اس کے لئے چالیس منٹ چاہئیں۔ بہر حال! ضرب لگا کر ذکر کرنا نہ تو مقصود ہے نہ مسنون ہے، اگر موقع ہو تو کرلو ورنہ سیدھے سادھے طریقے سے جس طرح بن پڑے ذکر کرلو اور اللہ کا نام لو، اس لئے اصل مقصود تو ان کا نام لینا ہے۔

---

(۱) انفاس عیسیٰ، ص: ۶۳

ایک قوم ان طریقوں کو بدعت کہتی ہے

یہ تفصیل اس لئے عرض کر دی کہ ہمارے دور میں افراط و تفریط چل رہی ہے، ایک قوم وہ ہے جو صوفیاء کرام کے ان طریقوں کو علی الاطلاق بدعت کہتی ہے، ان کا کہنا یہ ہے کہ یہ تصوف بھی بدعت ہے اور یہ خانقاہیں بھی بدعت ہیں اور یہ چلہ کشی بھی بدعت ہے اور ذکر کرنے کے یہ خاص طریقے بھی بدعت ہیں۔

دوسری انتہا

دوسری طرف ایک گروہ ایسا پیدا ہوگیا ہے جس نے ذکر کے ان خاص طریقوں کو ہی مقصود بالذات بنا دیا، چنانچہ یہ جاہل پیر اپنی خانقاہیں بھی کھول کر بیٹھ گئے ہیں، ان کا کہنا یہ ہے کہ جس نے ''پاس انفاس'' کے طریقے سے ذکر نہیں کیا وہ تصوف کے حروفِ ابجد سے بھی واقف نہیں، گویا کہ ''پاس انفاس'' ہی مقصود بالذات ہے۔ یہ دوسری انتہا ہے۔

ہمارے بزرگوں نے تو اللہ کے فضل و کرم سے ہمیں اعتدال کا راستہ دکھا دیا اور اس پر ہمیں چلا دیا، اس اعتدال کے راستے میں نہ افراط ہے اور نہ تفریط ہے۔ اور یہ بتا دیا کہ یہ راستہ جائز ہے لیکن بذاتِ خود مقصود نہیں، اس پر عمل کرو۔

فکر سے اُنس ہو جانا ذکر ہی کی برکت ہے

ایک شخص نے حضرت والا کو اپنا حال لکھا:

''دل چاہتا ہے کہ ذکر چھوڑ دوں اور بیٹھ کر سوچتا رہوں، اور ذکر میں طبیعت کم لگتی ہے''

حضرت والا نے جواب میں لکھا:

''یہ جو لکھا ہے کہ ذکر چھوڑ دوں اور بیٹھ کر سوچتا رہوں، سو یہ برکت ذکر ہی کی ہے کہ ''فکر'' سے اُنس ہوگیا، ذکر کو ہرگز نہ چھوڑنا ورنہ بناء کے انہدام سے مبنیٰ کا انہدام ہو جائے گا، خواہ دل لگے یا نہ لگے، معمولات پر استقامت رکھیں''(۱)

فکر ذکر کا نتیجہ ہے

''ذکر'' ہی کا ایک نتیجہ ''فکر'' ہے، جیسے قرآن کریم میں فرمایا:

---

(۱) انفاس عیسیٰ، ص:۶۳

﴿اَلَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ قِیٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِہِمْ وَیَتَفَکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾(۱)

وہ لوگ جو کھڑے اور بیٹھے اور پہلو کے بل لیٹنے کی حالت میں اللہ کا ذکر کرتے ہیں، اور آسمان وزمین کے پیدا کرنے میں فکر کرتے رہتے ہیں۔ اس آیت میں نیک لوگوں کی ایک صفت ''ذکر'' بیان فرمائی اور دوسری صفت ''فکر'' بیان فرمائی، جس سے اس طرف اشارہ فرمادیا کہ ''ذکر'' کے ساتھ ساتھ فکر بھی ہونی چاہئے، ذکر کا لازمی نتیجہ ''فکر'' ہونی چاہئے، یعنی کثرتِ ذکر کے نتیجے میں انسان اللہ جل شانہ کی عظمت، اس کی قدرت، اس کے جلال اور اس کی محبت کے خیالات میں گم ہو جاتا ہے، اسی کا نام ''فکر'' ہے، یہ ''فکر'' ذکر کا ثمرہ اور نتیجہ ہوتا ہے۔

حضرت والا نے فرمایا کہ تمہیں جو یہ خیال آرہا ہے کہ ذکر چھوڑ دوں اور بیٹھ کر سوچتا رہوں، یہ بھی درحقیقت ذکر ہی کی برکت ہے کہ اس ذکر کے نتیجے میں اللہ جل شانہ کی عظمت کا، اس کے جلال کا، اس کی قدرت کا اور اس کی محبت کا جو خیال دل میں پیدا ہوگیا، یہ ذکر ہی کا ثمرہ ہے، لیکن چونکہ یہ برکت ذکر ہی کی ہے، اس لئے ذکر کو ہرگز نہ چھوڑنا، ورنہ بناء یعنی بنیاد کے انہدام سے مبنیٰ کا یعنی اس بنیاد پر قائم عمارت کا انہدام ہو جائے گا۔

ذکر مت چھوڑنا

یعنی دل میں یہ جو خیال آرہا ہے کہ دن رات بیٹھے بیٹھے اللہ تعالیٰ کی قدرت اور جلال اور محبت کو سوچتا رہوں اور یہ حالت ہو جائے کہ ؂

دل ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن
بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کیے ہوئے

یہ کیفیت بڑی اچھی ہے، لیکن یہ کیفیت ''ذکر'' ہی کی برکت سے حاصل ہوئی ہے، اب اگر تم نے ذکر چھوڑ دیا تو رفتہ رفتہ ''فکر'' کی یہ کیفیت بھی ختم ہو جائے گی۔ لہٰذا یہ مت سوچنا کہ میں چونکہ ''فکر'' کی کیفیت تک پہنچ گیا ہوں، اس لئے اب ذکر کی ضرورت نہیں، اس کو چھوڑ دوں

ذکر قلبی کے باوجود ذکر لسانی نہ چھوڑے

دوسرے الفاظ میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ ''ذکر'' سے مراد ''ذکر لسانی'' ہے اور ''فکر'' سے مراد ''ذکر قلبی'' ہے، جب انسان اللہ جل جلالہ کی قدرت، اس کی عظمتِ شان اور اس کے جلال میں گم ہوتا

(۱) آل عمران: ۱۹۱

ہے تو اسی کا نام ذکر قلبی ہے، گویا کہ دل سے اللہ تعالیٰ کا ذکر کر رہا ہے۔ بعض لوگوں کو یہ دھوکہ ہوتا ہے کہ جب ذکر لسانی کرتے کرتے دل میں اللہ تعالیٰ کا خیال جم گیا اور اللہ تعالیٰ کی قدرت، عظمت اور محبت کا خیال دل میں جم گیا تو مقصود حاصل ہو گیا، اور مقصود کے حاصل کرنے کا جو زینہ اور ذریعہ تھا یعنی ذکر لسانی، اب اس کی ضرورت نہ رہی، لہٰذا انہوں نے ذکر لسانی چھوڑ دیا۔ یاد رکھئے! یہ شیطان کا دھوکہ ہے، کیونکہ جب ذکر لسانی چھوڑ دیا تو رفتہ رفتہ ذکر قلبی بھی چھوٹ جائے گا، اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضرت والا نے فرمایا کہ "بناء کے انہدام سے مبنیٰ کا انہدام ہو جائے گا۔"

جاہل پیروں کا یہ خیال گمراہی ہے

چنانچہ جاہل پیروں کا ایک طبقہ ہے جو یہ کہتا ہے کہ ہم تو اب درویش اور فقیر ہو گئے ہیں اور اب تو ہم ہر وقت اللہ تعالیٰ کی یاد میں گم ہیں، لہٰذا اب ہمیں نہ نماز کی ضرورت، نہ روزے کی ضرورت، نہ تلاوت کی ضرورت، نہ تسبیحات کی ضرورت۔ اس لئے کہ نماز کا مقصود تو "وصول اِلی اللہ" تھا، یعنی اللہ تعالیٰ تک پہنچ جانا، اب جب ہمارے دل میں اللہ تعالیٰ کا ذکر اور اللہ تعالیٰ کا خیال جم گیا، تو اب ہمیں نماز کی ضرورت نہیں، اب ہم مسجد جائیں یا نہ جائیں، نماز پڑھیں یا نہ پڑھیں، کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یاد رکھئے! یہ گمراہی ہے، اور یہ گمراہی یہاں سے پیدا ہوئی کہ "ذکر قلبی" کو اس درجہ کا مقصود قرار دیدیا کہ اس کے نتیجے میں ظاہری عبادات کو بیکار سمجھا جانے لگا، یہی گمراہی ہے۔

شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ میں نے اپنے شیخ حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب قدس اللہ سرہ سے بارہا سنا، انہوں نے یہ واقعہ حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے سنا تھا، وہ یہ کہ ایک مرتبہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ تہجد کی نماز پڑھ رہے تھے، اس دوران کمرے میں ایک زبردست قسم کا نور چمکا، اور اس نور نے حضرت کو اور آس پاس کی تمام اشیاء اور پورے کمرے کو اپنے گھیرے میں لے لیا، اور اس نور میں سے آواز آئی کہ اے عبدالقادر! تو ہمارے ساتھ تعلق کے اس مقام تک پہنچ گیا کہ اب تیرے ذمے نہ نماز فرض ہے اور نہ روزہ فرض ہے، اب تو جو چاہے کر، اب تو ہمارے قرب کے مقام تک پہنچ گیا۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے جواب میں فرمایا کہ مردود دور ہو جا، ہمارے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم قرب کے اعلیٰ مقام تک پہنچنے کے باوجود ان سے تو نماز ساقط نہیں ہوئی، مجھ سے کیسے ساقط ہو جائے گی؟ اس سے پتہ چلا کہ تو شیطان ہے اور مجھے بہکانے آیا ہے۔ بس یہ کہنا تھا کہ وہ نور غائب ہو گیا۔

اس کے بعد دوسرا نور ظاہر ہوا، اس میں سے آواز آئی: اے عبدالقادر! آج تجھے تیرے علم نے بچالیا، ورنہ یہ وہ داؤ ہے جس کے ذریعہ میں نے بڑے بڑے صوفیاء کو شکست دیدی اور ان کو گمراہ کردیا۔ شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: مردود! دور ہوجا، مجھے میرے علم نے نہیں بچایا بلکہ مجھے میرے اللہ نے بچایا ہے، مجھے پھر دھوکہ دیتا ہے۔ یہ دوسرا داؤ پہلے داؤ سے زیادہ خطرناک اور نازک تھا، اس لئے کہ اس کے ذریعہ ان کو اپنے علم پر ناز میں مبتلا کرنا مقصود تھا، لیکن آپ اس داؤ سے بچ گئے، اور آپ نے فرمایا کہ مجھے اللہ کے فضل و کرم نے بچایا ہے۔

ذکر لسانی کو جاری رکھنا چاہیئے

بہرحال! یہ بات کہ چونکہ ذکر قلبی ہمارے دل و دماغ میں پیوست ہوچکا ہے، لہٰذا اب ذکر لسانی سے مستغنی ہوگئے، اب ہم نماز سے مستغنی ہوگئے، یہ سب گمراہی ہے۔ اسی لئے حضرت والا نے فرمایا کہ یہ تو بڑی اچھی بات ہے کہ ہر وقت دل میں فکر رہنے لگی، اللہ جل شانہ کی طرف دھیان رہنے لگا، جس کو صوفیاء کرام "تعلق مع اللہ" اور "نسبت" اور "ملکہ یادداشت" سے تعبیر کرتے ہیں، لیکن یہ سب چیزیں ذکر لسانی کے نتیجے میں حاصل ہوتی ہیں، اس لئے یہ نہ ہو کہ اب ذکر لسانی چھوڑ بیٹھو، بلکہ ذکر لسانی کو ہرگز مت چھوڑنا، ورنہ بناء کے انہدام سے مبنیٰ کا انہدام ہوجائے گا، خواہ دل لگے یا نہ لگے، لیکن پھر بھی زبردستی بیٹھ کر ذکر کرتے رہو اور معمولات پر استقامت رکھو۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.

ذکر الٰہی کے چند آداب ☆

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ. وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ. وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ. وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ. اَمَّا بَعْدُ!

باوضو ذکر کرنا

حضرت والا نے ارشاد فرمایا:

''باوضو ذکر کرنے سے برکت زیادہ ضرور ہوتی ہے لیکن وضو رکھنا ضروری نہیں، اس لئے کہ اگر کسی کا وضو نہ ٹھیرتا ہو اور بار بار وضو کرنے سے تکلیف ہو تو تیمم کر لیا کرے، مگر اس تیمم سے نماز و مسِّ مصحف جائز نہیں''(۱)

اس ملفوظ میں کئی باتیں ارشاد فرمائی ہیں۔ پہلی بات یہ ارشاد فرمائی کہ مسئلہ یہ ہے کہ بغیر وضو کے ذکر کرنا جائز ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنے ذکر کے لئے کوئی شرط اور کوئی قید نہیں لگائی، اس کو اتنا آسان کر دیا کہ انسان جب بھی اور جس حالت میں بھی اللہ تعالیٰ کا نام لینا چاہے تو اس کو نام لینے کی اجازت ہے، ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ کا نام لینے کی اجازت ہی نہ ہوتی، وضو کر کے کیا، اگر اپنے منہ کو مشک و عنبر سے بھی دھو لیتے تب بھی اجازت نہ ہوتی۔

ہزار بار بشویم دہن ز مشک و گلاب
ہنوز نامِ تو گفتن کمالِ بے ادبی ست

''اگر میں ہزار بار بھی اپنے منہ کو مشک و گلاب سے دھولوں، پھر بھی آپ کا نام لینا بے ادبی اور گستاخی ہے''

اصل بات تو یہ ہے، لیکن ان کا کرم یہ ہے کہ نام لینے کی نہ صرف اجازت دیدی بلکہ اس کے ساتھ کوئی قید و شرط بھی نہیں لگائی، نہ مسجد میں آنے کی قید، نہ مصلّے پر بیٹھنے کی قید، نہ وضو کرنا ضروری، نہ غسل کرنا ضروری، حتیٰ کہ اگر انسان ناپاکی کی حالت میں ہے یا کوئی عورت حیض و نفاس کی حالت میں

☆ اصلاحی مجالس (۳/۱۱۶ تا ۱۳۰) بعد از نماز ظہر، رمضان المبارک، دار العلوم کراچی

(۱) انفاس عیسیٰ، ص: ۶۴

ہے تو اگر چہ نماز پڑھنے اور تلاوت کرنے کی اس حالت میں اجازت نہیں ہے لیکن ذکر کی اس حالت میں بھی اجازت ہے۔ قرآن کریم میں فرمایا:

﴿الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ﴾ (۱)

''کھڑے ہونے کی حالت میں، بیٹھنے کی حالت میں، اور بستر پر لیٹے ہونے کی حالت میں اللہ کا ذکر کرتے ہیں''

تم کھڑے ہو یا لیٹے ہو یا بیٹھے ہو، جس حالت میں بھی ہو، ہمیں پکار لو، اتنا آسان فرما دیا۔ لہٰذا ذکر کے لئے وضو کرنا کوئی شرط تو نہیں لیکن محبت کا تقاضا تو ہے، جب انسان اس ذات کا ذکر کرے تو باوضو ہو کر کرے، اس لئے کہ باوضو ہو کر ذکر کرنے میں برکت زیادہ ہوگی، اس میں انوار زیادہ ہوں گے، اس کا فائدہ زیادہ ہوگا، اس لئے حتی الامکان وضو کر کے ذکر کرے۔

ذکر کے لئے تیمّم بھی کر سکتے ہیں

ہاں البتہ اگر کوئی عذر ہے اور اس عذر کی وجہ سے وضو نہیں ٹھیرتا، تو ایسے شخص کے لئے حضرت فرماتے ہیں کہ وضو نہ ٹھیرنے کی وجہ سے ذکر کو نہ چھوڑے بلکہ ذکر کرتا رہے، البتہ چونکہ باوضو ذکر کرنے سے انوار و برکات زیادہ ہوتے ہیں، اس لئے جب وضو ٹوٹ جائے دوبارہ کر لے، پھر ٹوٹ جائے تو پھر وضو کر لے، اور اگر بار بار وضو کرنے میں تکلیف ہوتی ہو تو ذکر کرنے کے لئے تیمم کر لے، لیکن ایسے تیمّم سے نماز پڑھنا اور قرآن شریف چھونا جائز نہیں ہوگا۔

کن اعمال میں تیمّم کرنا جائز ہے

یہاں یہ بات اچھی طرح سمجھ لیں کہ وہ اعمال جن کو بلا وضو ادا کرنا جائز ہے، لیکن ادب کے خیال سے وہ اعمال وضو کے ساتھ کیے جاتے ہیں، ان اعمال میں اگر انسان کسی وجہ سے بجائے وضو کے تیمّم کر لے تو انشاء اللہ وضو کے بجائے تیمم بھی کافی ہو جائے گا۔ مثلاً آپ درسی کتاب کا سبق پڑھتے ہیں تو قرآن کریم کے علاوہ دوسری کتاب کا سبق بلا وضو پڑھنا اصلاً جائز ہے اور ان کتابوں کو چھونا بھی جائز ہے، لیکن ادب کا تقاضا یہ ہے کہ تمام درسی کتابوں کا سبق بھی وضو کے ساتھ پڑھے، اور اگر کسی وقت وضو کا موقع نہیں ہے تو اس کے لئے تیمّم کر لے تو یہ تیمّم بھی انشاء اللہ کافی ہو جائے گا۔ البتہ اگر کوئی یہ چاہے کہ میں اس تیمّم سے نماز پڑھ لوں، تو یاد رکھئے کہ اس تیمّم سے نماز نہیں ہوگی۔ یہی معاملہ ذکر کا ہے کہ اگر بار بار وضو ٹوٹ رہا ہے اور وضو کرنے میں تکلیف ہو رہی ہے تو ذکر کرنے کے لئے تیمّم

(۱) آل عمران: ۱۹۱

کرلے، اس لئے کہ بار بار تیمم کرنے میں کوئی مشقت نہیں ہے، البتہ اس تیمم سے نماز پڑھنا اور قرآن شریف چھونا جائز نہیں ہوگا۔

نماز سے جی چرانے کا علاج

ایک شخص نے حضرت والا کو لکھا:

''نماز پڑھنے میں جی بہت جان چراتا ہے''

یعنی دل نہیں مانتا اور دل نماز پڑھنا نہیں چاہتا۔ جواب میں حضرت والا نے لکھا:

''اس کا تو کچھ حرج نہیں مگر جی چرانے پر عمل نہ کیا جائے، نفس کی مخالفت کر کے نماز کو اہتمام سے پڑھا جائے اور کچھ نوافل بھی معمول کرلیا جائے۔ جتنے میں کسی ضروری کام کا حرج نہ ہو''(۱)

یعنی جی چرانے میں تو کوئی حرج نہیں، وہ تو اسی کام کے لئے ہے کہ ہر اچھے عمل سے جان چرائے، اور غلط کاموں کی طرف انسان کو مائل کرے، اس لئے اس میں تو کچھ حرج نہیں، باقی اس کے جی چرانے پر عمل نہ کیا جائے، بلکہ نفس کی مخالفت کر کے نماز کو اہتمام سے پڑھے، جی لگنے کی زیادہ فکر میں نہ پڑے۔

ذکر کے وقت اللہ تعالیٰ کا تصور کرے

ایک ملفوظ میں حضرت والا نے فرمایا:

''تسبیح کے وقت اَولیٰ تو تصور مذکور کا ہے یعنی حق تعالیٰ شانہ کا، لیکن اگر یہ خیال نہ جمے تو پھر ذکر کرے اس طرح سے کہ یہ قلب سے ادا ہو رہا ہے''(۲)

اس ملفوظ میں ذکر کا طریقہ بیان فرمایا کہ جب انسان ذکر کرے تو اصل تو یہ ہے کہ ذکر کے وقت اس ذات کا تصور کرے جس کا ذکر کر رہا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کا، جیسا کہ حدیث شریف میں حضور اقدس ﷺ نے فرمایا:

((أَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ فَإِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَإِنَّهُ يَرَاكَ))(۳)

---

(۱) انفاس عیسیٰ، ص:۶۴ (۲) انفاس عیسیٰ، ص:۶۴

(۳) صحيح البخاري، كتاب الايمان، باب سؤال جبريل النبي الخ، رقم: ٤٨، صحيح مسلم، كتاب الايمان، باب بيان الإيمان والإسلام والإحسان، رقم: ٩، سنن الترمذي، كتاب الإيمان، باب ما جاء في وصف جبريل الخ، رقم: ٢٥٣٥، سنن النسائي، كتاب الإيمان وشرائعه، باب نعت الإسلام، رقم: ٤٩٠٤، سنن أبي داود، كتاب السنة، باب في القدر، رقم: ٤٠٧٥

یعنی اس طرح ذکر کرے گویا کہ وہ اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہا ہے، اور اگر یہ تصور نہ آسکے تو کم از کم یہ تصور جمائے کہ وہ ذات جس کا میں ذکر کر رہا ہوں، وہ ذات مجھے دیکھ رہی ہے۔

تو اصل یہ ہے کہ جس کا ذکر ہو رہا ہے یعنی اللہ جل شانہ، اس کا تصور جمائے، جب ''اللہ، اللہ'' کہہ رہے ہو تو اس وقت ذہن اللہ تعالیٰ کی طرف ہو، جب ''سبحان اللہ'' کہہ رہے ہو تو توجہ اللہ تعالیٰ کی طرف ہو، جب ''الحمد للہ'' کہہ رہے ہو تو اس وقت اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا تصور ہو۔

ابتداءً ذکر کے الفاظ کا تصور بھی کر سکتے ہیں

لیکن ابتداء میں ہم جیسے مبتدیوں کے لئے اللہ تعالیٰ کا یہ تصور جمانا بسا اوقات مشکل ہوتا ہے، اور اللہ تعالیٰ کا تصور کیسے جم سکتا ہے جب کہ وہ ذات ''لَا یُحَدُّ وَلَا یُتَصَوَّرُ'' ہے، وہ ذات تو تصور میں آ ہی نہیں سکتی، اس لئے شروع شروع میں ذکر کرتے وقت اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا اور اس کی قدرت کا اور اس کی عظمت کا تصور بھی نہیں جمتا۔

اس لئے حضرت والا فرما رہے ہیں کہ شروع میں مبتدی کو چاہئے کہ وہ ''ذکر'' ہی کا تصور کرے، یعنی جو الفاظ زبان سے نکال رہا ہے، ان الفاظ کی طرف دھیان لگائے۔ مثلاً جب وہ ''اللہ اللہ، سبحان اللہ سبحان اللہ'' زبان سے نکال رہا ہے تو اس کو یہ پتہ ہو کہ میں یہ الفاظ زبان سے نکال رہا ہوں۔ جب ابتداء میں وہ ''ذکر'' کے الفاظ کا تصور قائم کرے گا تو رفتہ رفتہ بالآخر ان شاء اللہ ''مذکور'' یعنی اللہ تعالیٰ کا تصور بھی قائم ہو جائے گا۔

ذکر کے وقت دوسرے تصورات

بعض صوفیاء کرام نے بعض اذکار کے ساتھ علیحدہ علیحدہ تصورات قائم فرمائے ہیں، جیسے دوازدہ تسبیح میں بزرگوں سے منقول ہے کہ ''اِلا اللہ'' کی چار تسبیحات اس طرح پڑھے کہ پہلی تسبیح میں ''لَا مَعْبُوْدَ اِلَّا اللّٰہ'' کا تصور کرے، اور دوسری تسبیح میں ''لَا مَحْبُوْبَ اِلَّا اللّٰہُ'' کا تصور کرے۔ تیسری تسبیح میں ''لَا مَقْصُوْدَ اِلَّا اللّٰہُ'' کا تصور کرے، اور چوتھی تسبیح میں ''لَا مَوْجُوْدَ اِلَّا اللّٰہُ'' کا تصور کرے۔

لیکن ان کے بارے میں ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحیٔ صاحب عارفی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ کوئی کرلے تو ٹھیک ہے، لیکن ان تصورات کا زیادہ اہتمام کرنے کی ضرورت نہیں، ان تصورات کے بغیر بھی تسبیح پڑھ لی جائے تب بھی کافی ہے، اصل مقصود یہ ہے کہ جب انسان ذکر کرے تو ذرا دھیان سے ذکر کرے، اس سے ان شاء اللہ رفتہ رفتہ مقصود حاصل ہو جائے گا۔

ذکر میں لذت نہ آنا زیادہ نافع ہے

حضرت والا نے ارشاد فرمایا:

''ذکر میں لطف و لذت کا حاصل ہونا ایک نعمت ہے، اور نہ ہونا دوسری نعمت ہے، جس کا نام ''مجاہدہ'' ہے، یہ دوسری نعمت ''انفع'' ہے گو ''الذ'' نہ ہو''(۱)

یعنی اگر ذکر کے دوران آدمی کو لذت حاصل ہو رہی ہے تو یہ نعمت ہے، اگرچہ مقصود نہیں ہے، اور اگر لذت حاصل نہیں ہو رہی ہے تو یہ دوسری نعمت ہے، اس کا نام ''مجاہدہ'' ہے، یہ بھی ایک نعمت ہے، بلکہ یہ نعمت زیادہ نافع ہے، اس لئے کہ جب مزہ نہیں آ رہا ہے اور اس کے باوجود ذکر کر رہا ہے، تو اس کے نتیجے میں وہ مشقت اُٹھا رہا ہے، اس لئے اس کو ذکر کا ثواب الگ مل رہا ہے اور ''مجاہدہ'' کا فائدہ الگ ہو رہا ہے، کیونکہ نفس کے تقاضے کے خلاف کوئی کام کرنا ''مجاہدہ'' ہے، اور نفس کے تقاضے کے خلاف کام کرنے کی عادت ڈالنے سے انسان کو اپنے نفس پر قابو حاصل ہوتا ہے۔ لہٰذا جب مزے کے بغیر ذکر کرنے میں یہ تین فائدے ہیں تو یہ ذکر زیادہ نافع ہے، لہٰذا ایسے ذکر کو بیکار نہیں سمجھنا چاہئے، ذکر میں مزہ اور لطف آئے تو نعمت، نہ آئے تو نعمت۔

ذکر کے فوائد دو چیزوں پر موقوف ہیں

حضرت والا نے ارشاد فرمایا:

''ذکر کا اثر موقوف ہے تقلیلِ کلام، تقلیلِ اختلاط مع الانام و قلتِ التفات الی التعلقات پر۔ ان چیزوں کے حصول کے لئے مواعظ کا مطالعہ اور مثنوی کا مطالعہ (گو سمجھ میں نہ آئے) کرنا چاہئے''(۲)

حضرت فرما رہے ہیں کہ ''ذکر'' کے جو فوائد اور ثمرات بزرگ بتاتے ہیں، وہ اس وقت حاصل ہوتے ہیں جب انسان ''ذکر'' کے ساتھ ساتھ دو کام اور کرے، ایک تقلیلِ کلام، یعنی گفتگو کم کرے اور فضول باتوں سے اجتناب کرے، ضرورت کے مطابق بولے، زیادہ نہ بولے۔ اور بعض مرتبہ اسی سے نفس کی آزادروش کا علاج ہو جاتا ہے۔

بولنے پر پابندی کے ذریعہ ایک صاحب کا علاج

مجھے یاد ہے کہ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس ایک صاحب آیا کرتے تھے، جو بہت

---

(۱) انفاس عیسیٰ، ص: ۶۵ (۲) انفاس عیسیٰ، ص: ۶۵

بولتے تھے، جب باتیں شروع کردیں تو اب رکنے کا نام نہیں ہے، ایک سوال کے بعد دوسرا سوال کرلیا، پھر تیسرا سوال کرلیا، مسلسل بولتے رہتے تھے۔ حضرت والد صاحب چونکہ بہت متواضع اور مسکین آدمی تھے، اسلئے بہت زیادہ روک ٹوک نہیں کرتے تھے، چنانچہ ان صاحب کی باتوں کو برداشت کرتے تھے۔

ایک مرتبہ ان صاحب نے حضرت والد صاحب سے بیعت اور اصلاحی تعلق قائم کرنے کی درخواست کردی کہ حضرت! میرا دل چاہتا ہے کہ آپ سے اصلاحی تعلق قائم کرلوں اور آپ سے بیعت ہوجاؤں، اور آپ مجھے کچھ ذکر اور نوافل بتادیا کریں۔ حضرت والد صاحب نے ان سے فرمایا کہ اگر تم تعلق قائم کرنا چاہتے ہو تو ٹھیک ہے، لیکن تمہارے لئے نفل اور ذکر وغیرہ کچھ نہیں ہے۔ انہوں نے پوچھا کہ پھر میں کیا کروں؟ حضرت والد صاحب نے فرمایا کہ تمہارا کام یہ ہے کہ تم اپنی زبان پر تالہ ڈال لو، یہ تمہاری زبان جو ہر وقت قینچی کی طرح چلتی رہتی ہے، اس کو بند کرو، اور ضرورت کے مطابق بات کرو، ضرورت سے زائد ایک لفظ بھی زبان سے نہ نکالو، یہی تمہارا علاج ہے، یہی تمہارا وظیفہ ہے، اور یہی تمہاری تسبیح ہے۔ بس ان صاحب پر یہ پابندی لگنی تھی کہ ان پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ اس لئے کہ جو شخص ساری عمر زیادہ بولنے کا عادی رہا ہو، اس پر ایک دم سے بریک لگادیا جائے تو اس کے لئے یہ بڑا سخت مجاہدہ ہوگا۔

چنانچہ اس شخص کے لئے تنہا کم بولنے کا یہی ''مجاہدہ'' کام کرگیا۔ لہٰذا اس راہ میں ''تقلیلِ کلام'' کی بڑی سخت ضرورت ہے۔

حدیث شریف میں حضورِ اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((إِنَّ مِنْ حُسْنِ إِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْكُهُ مَا لَا يَعْنِيهِ)) (۱)

''انسان کے اسلام کے حسن میں سے ہے کہ وہ لایعنی اور فضول باتوں سے بچے''

بس بوقتِ ضرورت بولے۔

فرمایا کہ جب تک ذکر کے ساتھ ''تقلیلِ کلام'' کی صفت نہیں ہوگی، اس وقت تک دنیا میں ذکر کے فوائد کما حقہ حاصل نہیں ہوں گے، البتہ آخرت کا اجر انشاء اللہ مل جائے گا۔

تعلقات کم کرو

دوسری چیز ہے ''تقلیلِ اختلاط مع الأنام'' یعنی لوگوں سے تعلقات کم کرے۔ لوگوں سے بہت

(۱) سنن الترمذی، کتاب الزهد عن رسول الله، باب فيمن تكلم بكلمة يضحك بها الناس، رقم: ۲۲۴۰، سنن ابن ماجه، كتاب الفتن، باب كف اللسان في الفتنة، رقم: ۳۹۶۶، مسند أحمد، رقم: ۱۶۴۲، مؤطا مالك، كتاب الجامع، باب ما جاء في حسن الخلق، رقم: ۱۴۰۲

زیادہ تعلقات بڑھانا، لوگوں کے ساتھ مجلس آرائی کرنا، ہر وقت ان کے ساتھ اُٹھنا بیٹھنا، جو آج کل ایک مستقل فن بن گیا ہے، جس کو "پبلک ریلیشن" کہا جاتا ہے، اس فن میں یہ بتایا جاتا ہے کہ لوگوں سے کس طرح زیادہ سے زیادہ تعلقات بڑھائے جائیں؟ لیکن اصلاحِ اعمال و اخلاق کی اس راہ میں لوگوں سے تعلقات بڑھانا مضر ہے، بالخصوص ضبطِ نفس کی مشق کے ابتدائی دور میں۔

ہاں! اگر کسی سے تعلق ہو تو وہ صرف اللہ کے لئے ہو، گھر والوں سے تعلق ہو تو وہ اللہ کے لئے ہو، دوستوں سے تعلق ہو تو وہ اللہ کے لئے ہو، عام مسلمانوں سے تعلق ہو تو وہ اللہ کے لئے ہو، باقی اپنے ذاتی مفاد کے لئے لوگوں سے زیادہ تعلق بڑھانے سے اور ان سے میل جول رکھنے سے ذکر کے فوائد کما حقہ حاصل نہیں ہوتے۔

آنکھ، کان، زبان بند کرلو

مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

چشم بند و گوش بند و لب ببند گر نہ بینی نور حق بر من بخند

یعنی تین کام کرلو، ایک یہ کہ آنکھ کو بند کرلو، کس چیز سے بند کرلو؟ ناجائز جگہ پر نظر پڑنے سے بند کرلو، اور دوسرے یہ کہ کان کو بند کرلو، کس چیز سے؟ ناجائز، حرام اور فضول باتیں سننے سے بند کرلو۔ اور تیسرے یہ کہ ہونٹ یعنی زبان کو بند کرلو، کس چیز سے؟ فضول اور ناجائز باتیں کرنے سے بند کرلو۔ اس کے بعد بھی اگر نورِ حق نظر نہ آئے تو میرے اُوپر ہنس دینا، یعنی ان تین چیزوں کے بند کرنے کے نتیجے میں لازماً نورِ حق نظر آئے گا۔

بہر حال! ذکر کے جو فوائد ہیں، مثلاً نورِ حق کا نظر آنا، یہ اس لئے حاصل نہ ہوا کہ ذکر کے ساتھ جو کام کرنا چاہئے تھا یعنی "تقلیلِ کلام" اور "تقلیلِ اختلاط مع الانام" وہ نہیں ہوا، اس کے نتیجے میں ذکر کے فوائد بھی حاصل نہ ہوئے۔ اس لئے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرما رہے ہیں کہ اگر ذکر کے فوائد حاصل کرنے ہیں تو ذکر کے ساتھ ساتھ ان چیزوں پر بھی عمل کرنا ہوگا۔

تعلقات کی طرف التفات زیادہ نہ ہو

تیسری چیز ہے "قلۃ التفات الی التعلقات"، یعنی ایک طرف تو لوگوں سے تعلقات ہی کم رکھو، اور اگر کسی سے تعلق ہو بھی تو اس تعلق کی طرف التفات زیادہ نہ ہو، مثلاً یہ نہ سوچے کہ اس کام کو کرنے سے فلاں ناراض ہو جائے گا، یا فلاں راضی ہو جائے گا، اس فکر میں مت پڑو، ارے مخلوق کے راضی ہونے یا ناراض ہونے کی فکر میں مت پڑو، فکر اس کی کرو کہ خالق راضی ہو جائے۔ اگر یہ تین باتیں

حاصل ہو جائیں تو پھر انشاء اللہ ذکر کے فوائد حاصل ہو جائیں گے۔

ان تین چیزوں کو حاصل کرنے کا طریقہ

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ تین چیزیں، یعنی ''تقلیلِ کلام'' (کم گوئی) اور ''تقلیلِ اختلاط مع الأنام'' (کم آمیزی) اور ''قلۃ التفات الی التعلقات'' (تعلقات سے قدرے بے توجہی) یہ سب چیزیں کس طرح حاصل ہوں گی؟ اس کے حاصل کرنے کا طریقہ یہ بیان فرمایا کہ مواعظ کا مطالعہ کیا جائے اور مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ کی ''مثنوی'' کا مطالعہ کیا جائے، ساتھ میں یہ بھی فرما دیا کہ چاہے وہ ''مثنوی'' سمجھ میں بھی نہ آئے، تب بھی اس کا مطالعہ کیا جائے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ بعض بندوں کے کلام میں تاثیر رکھ دیتے ہیں۔

''مثنوی'' کلام وہبی ہے

کہا جاتا ہے کہ مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ کا شعر و شاعری سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ کے شیخ خواجہ شمس الدین تبریزی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مرتبہ اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ یا اللہ! آپ نے میرے دل پر جو علوم وارد فرمائے ہیں، اس کے لئے کوئی زبان عطا فرمایئے، چنانچہ اس دعا کے نتیجے میں مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ ان کے مرید ہوئے، اور پھر ان کی زبان پر اللہ تعالیٰ نے ''مثنوی'' جاری فرمادی۔ حالانکہ اس سے پہلے کبھی شعر نہیں کہے تھے لیکن شیخ کی دعا کے بعد ان کی زبان پر یہ اشعار جاری ہو گئے اور مثنوی کے دفتر کے دفتر لکھ دیئے، اور جب اللہ تعالیٰ کو منظور نہ ہوا شعر آنا بند ہو گئے، یہاں تک کہ آخر میں انہوں نے ایک حکایت لکھنی شروع کی تھی، وہ حکایت بھی پوری نہیں ہوئی، اور درمیان میں ہی شعر آنا بند ہو گئے، اور اس حکایت کو ادھورا ہی چھوڑ کر چلے گئے۔ پھر کئی صدیوں کے بعد ہندوستان کے مفتی الٰہی بخش صاحب کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ کی زبان پر اللہ تعالیٰ نے یہ اشعار جاری فرمادیئے۔ چنانچہ اسی جگہ سے آگے انہوں نے اشعار کہنا شروع کیے، اور اس آخری دفتر کو پورا فرمایا، اسی وجہ سے وہ ''خاتمِ مثنوی'' کہلاتے ہیں۔ لہٰذا جب اللہ تعالیٰ نے اس کلام کو ان کی زبان پر جاری فرمایا تو جاری ہو گیا اور جب بند کیا تو بند ہو گیا۔ بہرحال یہ الفاظ بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا ہیں، اس میں ایک خاص برکت اور اثر ہے، یہ تاثیر بھی اللہ تعالیٰ ہی ڈالتے ہیں۔ اس لئے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ مثنوی کا مطالعہ کرو، چاہے سمجھ میں آئے یا نہ آئے، کیونکہ اس کو پڑھنا فائدے سے خالی نہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان باتوں پر عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.

تبلیغ و دعوت کے اصول ☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

"أَمَّا بَعْدُ! فَأَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ○ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ○
﴿وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ يَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَيُطِيعُونَ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ أُولٰئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللّٰهُ إِنَّ اللّٰهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ﴾ (۱)

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے درجات

اس آیت کا تعلق "امر بالمعروف اور نہی عن المنکر" سے ہے۔ نیک بندوں کا وصف بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ وہ لوگ دوسروں کو نیکی کا حکم دیتے ہیں اور برائیوں سے روکتے ہیں۔ "امر" کے معنی ہیں "حکم دینا" اور "معروف" کے معنی ہیں "نیکی"، "نہی" کے معنی ہیں "روکنا" اور "منکر" کے معنی ہیں "برائی"۔

فقہاء کرام رحمہم اللہ نے لکھا ہے کہ جس طرح ہر مسلمان پر نماز روزہ فرضِ عین ہے، اسی طرح یہ بھی فرضِ عین ہے کہ اگر وہ دوسرے کو کسی برائی میں مبتلا دیکھے تو اپنی استطاعت کے مطابق اس کو روکے اور منع کرے کہ یہ کام گناہ ہے اس کو نہ کرو۔ لوگوں کو اتنی بات تو معلوم ہے کہ "امر بالمعروف اور نہی عن المنکر" فرضِ عین ہے، لیکن عام طور پر اس کی تفصیل معلوم نہیں کہ یہ کس وقت فرض ہے اور کس وقت فرض نہیں۔ اور معلوم نہ ہونے کا نتیجہ یہ ہے کہ بہت سے لوگ تو اس فریضہ سے ہی بالکل غافل ہیں۔ وہ لوگ اپنی آنکھوں سے اپنے بیوی بچوں کو اور اپنے دوستوں کو دیکھ رہے ہیں کہ وہ حرام کاموں میں مبتلا ہیں، لیکن اس کے باوجود ان کو روکنے کی توفیق نہیں ہوتی۔ ان کو دیکھ رہے ہیں کہ وہ فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی کر رہے ہیں، لیکن ان کو کہنے کی توفیق نہیں ہوتی۔ اور بعض لوگ اس حکم کو اتنا عام سمجھتے ہیں کہ صبح سے لے کر شام تک انہوں نے دوسروں کو روکنے ٹوکنے کو اپنا مشغلہ بنا رکھا ہے۔ اس طرح

☆ اصلاحی خطبات (۸/۲۶ تا ۵۳) بعد از نماز عصر، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی

(۱) التوبة: ۷۱

اس آیت پر عمل کرنے میں لوگ افراط و تفریط میں مبتلا ہیں۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ اس آیت کا صحیح مطلب معلوم نہیں، اس لئے اس کی تفصیل سمجھنا ضروری ہے۔

دعوت و تبلیغ کے دو طریقے

پہلی بات یہ سمجھ لیں کہ دعوت و تبلیغ کرنے اور دین کی بات دوسروں تک پہنچانے کے دو طریقے ہیں۔

(۱) انفرادی دعوت و تبلیغ (۲) اجتماعی دعوت و تبلیغ

انفرادی دعوت و تبلیغ کا مطلب یہ ہے کہ ایک شخص اپنی آنکھوں سے دوسرے شخص کو دیکھ رہا ہے کہ وہ فلاں گناہ اور فلاں برائی کے اندر مبتلا ہے، یا وہ شخص فلاں فرض واجب کی ادائیگی میں کوتاہی کر رہا ہے۔ اب انفرادی طور پر اس شخص کو اس طرف متوجہ کرنا کہ وہ اس برائی کو چھوڑ دے، اور نیکی پر عمل کرے، اس کو انفرادی تبلیغ و دعوت کہتے ہیں۔

دوسری اجتماعی دعوت اور تبلیغ ہوتی ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص ایک بڑے مجمع کے سامنے دین کی بات کہے، ان کے سامنے وعظ و تقریر کرے، یا ان کو درس دے، یا اس بات کا ارادہ کرے کہ میں کسی فوری سبب کے بغیر دوسروں کے پاس جا جا کر ان کو دین کی بات سناؤں گا، اور دین پھیلاؤں گا، جیسے ماشاء اللہ ہمارے تبلیغی جماعت کے حضرات کرتے ہیں کہ لوگوں کے پاس ان کے گھروں پر ان کی دکانوں پر جا کر ان کو دین کی بات پہنچاتے ہیں۔ یہ اجتماعی تبلیغ ہے۔ دعوت و تبلیغ کے ان دونوں طریقوں کے احکام الگ الگ ہیں اور دونوں کے آداب الگ الگ ہیں۔

اجتماعی تبلیغ فرضِ کفایہ ہے

''اجتماعی تبلیغ'' فرضِ عین نہیں ہے، بلکہ فرضِ کفایہ ہے، لہٰذا ہر ہر مسلمان پر فرض نہیں ہے کہ دوسروں کے پاس جا کر وعظ کہے، یا دوسروں کے گھر پر جا کر تبلیغ کرے، کیونکہ یہ فرضِ کفایہ ہے، اور فرضِ کفایہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اگر کچھ لوگ وہ کام کر رہے ہوں تو باقی لوگوں سے وہ فریضہ ساقط ہو جاتا ہے، اور اگر کوئی شخص بھی انجام نہ دے تو سب گناہگار ہوں گے۔ جیسے نمازِ جنازہ فرضِ کفایہ ہے، اب ہر شخص کے ذمے ضروری نہیں ہے کہ وہ نمازِ جنازہ میں شامل ہو، اگر شامل ہوگا تو ثواب ملے گا، اور اگر شامل نہیں ہوگا تو گناہ نہیں ہوگا، جب تک کہ کچھ پڑھنے والے لوگ موجود ہوں، لیکن اگر ایک بھی شخص پڑھنے والا نہیں ہوگا تو اس وقت سب مسلمان گناہ گار ہوں گے، اس کو فرضِ کفایہ کہا جاتا ہے، اسی طرح یہ اجتماعی دعوت فرضِ کفایہ ہے، فرضِ عین نہیں ہے۔

انفرادی تبلیغ فرضِ عین ہے

''انفرادی دعوت وتبلیغ'' یہ ہے کہ ہم اپنی آنکھوں سے ایک برائی ہوتی ہوئی دیکھ رہے ہیں، یا ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ کوئی شخص کسی فرض کو چھوڑ رہا ہے تو اس وقت اپنی استطاعت کی حد تک اس برائی کو روکنا فرضِ کفایہ نہیں، بلکہ فرضِ عین ہے، اور فرضِ عین ہونے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی یہ سوچ کر نہ بیٹھ جائے کہ یہ کام دوسرے لوگ کرلیں گے، یا یہ تو مولویوں کا کام ہے، یا تبلیغی جماعت والوں کے کرنے کا کام ہے، یہ درست نہیں، اس حدیث کی رو سے یہ کام ہر ہر مسلمان کے ذمے فرضِ عین ہے۔ لہٰذا یہ انفرادی دعوت وتبلیغ فرضِ عین ہے۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر فرضِ عین ہے

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے بیشمار آیتوں میں نیک بندوں کے بنیادی اوصاف بیان کرتے ہوئے فرمایا:

﴿ يَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ﴾(۱)

''وہ نیک بندے دوسروں کو نیکی کا حکم دیتے ہیں، اور برائی سے لوگوں کو منع کرتے ہیں''

لہٰذا یہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہر مسلمان کے ذمے فرضِ عین ہے۔ آج ہم لوگ اس کی فرضیت ہی سے غافل ہیں، اپنی آنکھوں سے اپنی اولاد کو اپنے گھر والوں کو غلط راستے پر جاتے ہوئے دیکھ رہے ہیں، اپنے ملنے جلنے والوں کو غلط کام کرتا ہوا دیکھتے ہیں، لیکن پھر بھی اس برائی پر ان کو متنبہ کرنے کا کوئی جذبہ اور کوئی داعیہ ہمارے دلوں میں پیدا نہیں ہوتا۔ حالانکہ یہ ایک مستقل فریضہ کی ادائیگی میں کوتاہی کرنا ہے۔ جس طرح ہر مسلمان پر پانچ وقت کی نماز فرض ہے، جس طرح رمضان کے روزے ہر مسلمان پر فرض ہیں، زکوٰۃ اور حج فرض ہے، بالکل اسی طرح امر بالمعروف اور نہی عن المنکر بھی فرض ہے، اس لئے سب سے پہلے اس کام کی اہمیت کو سمجھنا چاہئے۔ اگر کسی نے ساری عمر نیکیوں میں گزار دی، ایک نماز نہیں چھوڑی، روزہ ایک بھی نہیں چھوڑا، زکوٰۃ اور حج ادا کرتا رہا، اور اپنی طرف سے کسی گناہِ کبیرہ کا ارتکاب نہیں کیا، لیکن اس شخص نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا کام بھی انجام نہیں دیا، اور دوسروں کو برائیوں سے بچانے کی فکر بھی نہیں کی، یاد رکھئے، اپنی ذاتی نیکیوں کے باوجود آخرت میں اس شخص کی پکڑ ہوجائے گی کہ تمہاری آنکھوں کے سامنے یہ برائیاں ہورہی تھیں، اور ان

---

(۱) التوبۃ: ۷۱

منکرات کا سیلاب اُمڈ رہا تھا، تم نے اس کو روکنے کا کیا اقدام کیا؟ لہٰذا اپنے آپ کو سدھار لینا کافی نہیں، بلکہ دوسروں کی فکر کرنا بھی ضروری ہے۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کب فرض ہے؟

دوسری بات یہ سمجھ لیجئے کہ عبادات کی دو قسمیں ہیں:

ایک عبادت وہ ہے جو فرض یا واجب ہے، جیسے نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج وغیرہ۔

دوسری عبادت وہ ہے جو سنت یا مستحب ہے، جیسے مسواک کرنا، کھانا کھانے سے پہلے بسم اللہ پڑھنا، تین سانس میں پانی پینا وغیرہ، اس میں حضورِ اقدس ﷺ کی تمام سنتیں داخل ہیں۔

اسی طرح برائیوں کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک برائی وہ ہے جو حرام اور گناہ ہے اور قطعی طور پر شریعت میں ممنوع ہے۔ دوسری برائی وہ ہے جو حرام اور ناجائز نہیں، بلکہ خلافِ سنت ہے۔ یا خلافِ اولیٰ ہے۔ یا ادب کے خلاف ہے۔

اگر کوئی شخص فرائض یا واجبات کو چھوڑ رہا ہو یا حرام اور ناجائز کام کا ارتکاب کر رہا ہو تو وہاں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر فرضِ عین ہے۔ مثلاً کوئی شخص شراب پی رہا ہے، یا بدکاری کے اندر مبتلا ہے، یا غیبت کر رہا ہے، یا جھوٹ بول رہا ہے، چونکہ یہ سب صریح گناہ ہیں، یہاں نہی عن المنکر فرض ہے۔ یا مثلاً کوئی شخص فرض نماز چھوڑ رہا ہے، یا زکوٰۃ نہیں دے رہا ہے، رمضان کے روزے نہیں رکھ رہا ہے تو اس کو اس کی ادائیگی کے لئے کہنا فرض ہے۔

کس وقت نہی عن المنکر فرض نہیں

اور پھر اس میں بھی تفصیل ہے۔ وہ یہ ہے کہ یہ اس وقت فرض ہوتا ہے جب اس کو بتانے یا اس کو روکنے کے نتیجے میں اس کے مان لینے کا احتمال ہو۔ اور اس کو بتانے کے نتیجے میں بتانے والے کو کوئی تکلیف پہنچنے کا اندیشہ نہ ہو۔ لہٰذا اگر کوئی شخص گناہ کے اندر مبتلا ہے، اور آپ کو یہ خیال ہے کہ اگر میں اس کو اس گناہ سے روکوں گا تو یقین ہے کہ یہ شخص مانے گا نہیں، بلکہ یہ شخص اُلٹا شریعت کے حکم کا مذاق اُڑائے گا، اور اس کی توہین کرے گا، اور اس توہین کے نتیجے میں یہ اندیشہ ہے کہ کہیں کفر میں مبتلا نہ ہو جائے، اس لئے کہ شریعت کے کسی حکم کی توہین کرنا صرف گناہ نہیں، بلکہ یہ عمل انسان کو اسلام سے خارج کر دیتا ہے اور کافر بنا دیتا ہے، لہٰذا اگر اس بات کا غالب گمان ہو کہ اگر میں اس شخص کو اس وقت اس گناہ سے روکوں گا تو یہ شریعت کے حکم کی توہین کرے گا تو ایسی صورت میں اس وقت نہی عن المنکر کا فریضہ ساقط ہو جاتا ہے۔ اس لئے ایسے موقع پر اس کو اس گناہ سے نہیں روکنا چاہئے، بلکہ اپنے آپ کو

اس گناہ کے کام سے الگ کر لینا چاہئے۔ اور اس شخص کے حق میں دعا کرنا چاہئے کہ یا اللہ! آپ کا یہ بندہ ایک بیماری میں مبتلا ہے، اپنے فضل و کرم سے اس کو اس بیماری سے نکال دیجئے۔

گناہ میں مبتلا شخص کو موقع پر روکنا

ایک شخص پورے ذوق و شوق کے ساتھ کسی گناہ کی طرف متوجہ ہے، اس وقت اس بات کا دور دور تک کوئی احتمال نہیں ہے کہ وہ کسی کی بات سنے گا اور مان لے گا۔ اب عین اس وقت ایک شخص اس کے پاس تبلیغ کے لئے اور امر بالمعروف کے لئے پہنچ گیا، اور یہ نہیں سوچا کہ اس وقت تبلیغ کرنے کا نتیجہ کیا ہوگا؟ چنانچہ اس نے تبلیغ کی، اس نے سامنے سے شریعت کے اس حکم کا مذاق اُڑا دیا اور اس کے نتیجے میں کفر کے اندر مبتلا ہو گیا۔ اس کے کفر میں مبتلا ہونے کا سبب یہ شخص بنا جس نے جا کر اس کو تبلیغ کی۔ لہٰذا عین اس وقت جب کوئی شخص گناہ کے اندر مبتلا ہو، اس وقت روکنا ٹوکنا بعض اوقات نقصان دہ ہوتا ہے۔ اس لئے اس وقت روکنا ٹوکنا ٹھیک نہیں، بلکہ بعد میں مناسب موقع پر اس کو بتا دینا اور سمجھا دینا چاہئے کہ جو عمل تم کر رہے تھے وہ درست نہیں تھا۔

اگر ماننے اور نہ ماننے کے احتمال برابر ہوں

اور اگر دونوں احتمال برابر ہوں یعنی یہ احتمال بھی ہو کہ شاید یہ میری بات سن کر مان لے اور اس گناہ سے باز آ جائے، اور یہ احتمال بھی ہو کہ شاید یہ میری بات نہ مانے، تو ایسے موقع میں بات کہہ دینا ضروری ہے۔ اس لئے کہ کیا پتہ کہ تمہارے کہنے کی برکت سے اللہ تعالیٰ اس کے دل میں یہ بات اُتار دے اور اس کے نتیجے میں اس کی اصلاح ہو جائے، اور اگر تمہارے کہنے کے نتیجے میں اس کی اصلاح ہو گئی تو پھر اس کی آئندہ ساری عمر کی نیکیاں تمہارے نامۂ اعمال میں لکھی جائیں گی۔

اگر تکلیف پہنچنے کا اندیشہ ہو

اور اگر یہ خیال ہے کہ یہ شخص جو گناہ کے اندر مبتلا ہے، اگر میں اس کو روکوں گا تو یہ شخص اگرچہ شریعت کے حکم کی توہین تو نہیں کرے گا، لیکن مجھے تکلیف پہنچائے گا، تو اس صورت میں اپنے آپ کو اس تکلیف سے بچانے کے لئے اس کو گناہ سے نہ روکنا جائز ہے، اور اس وقت امر بالمعروف اور نہی عن المنکر فرض نہیں رہے گا۔ البتہ افضل پھر بھی یہ ہے کہ اس سے کہہ دے، اور یہ سوچے کہ اگرچہ مجھے تکلیف پہنچائے گا اور میرے پیچھے پڑ جائے گا، لیکن میں حق بات اس کو کہہ دوں۔ لہٰذا اس وقت بات کہہ دینا افضل ہے، اور جو تکلیف پہنچے اس کو برداشت کرنا چاہئے۔ بہر حال، مندرجہ بالا تین صورتیں یاد

رکھنے کی ہیں۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ جس جگہ یہ اندیشہ ہو کہ سامنے والا شخص میری بات سننے اور ماننے کے بجائے شریعت کے حکم کی توہین کرے گا، وہاں امر بالمعروف نہ کرے، بلکہ خاموش رہے۔ اور جس جگہ دونوں احتمال برابر ہوں کہ شاید میری بات مان لے گا، یا شاید توہین پر اُتر آئے گا، اس جگہ پر بات کہنا ضروری ہے۔ اور جس جگہ یہ اندیشہ ہو کہ وہ مجھے تکلیف پہنچائے گا تو وہاں شریعت کی بات کہنا ضروری نہیں، البتہ افضل یہ ہے کہ شریعت کی بات کہہ دے اور اس تکلیف کو برداشت کرے۔ یہ خلاصہ ہے جسے ہر شخص کو یاد رکھنا چاہئے۔

ٹوکتے وقت نیت درست ہونی چاہئے

پھر شریعت کی بات کہتے وقت ہمیشہ نیت درست رکھنی چاہئے۔ اور یہ سمجھنا نہیں چاہئے کہ ہم مصلح اور بڑے ہیں۔ اور ہم دیندار اور متقی ہیں، دوسرا شخص فاسق اور فاجر ہے، اور ہم اس کی اصلاح کے لئے کھڑے ہوئے ہیں، ہم خدائی فوجدار اور داروغہ ہیں۔ اس لئے کہ اس نیت کے ساتھ اگر شریعت کی بات کہی جائے گی تو اس کا فائدہ نہ سننے والے کو پہنچے گا اور نہ تمہیں فائدہ ہوگا، اس لئے کہ اس نیت کے ساتھ تمہارے دل میں تکبر اور عجب پیدا ہوگیا جس کے نتیجے میں یہ عمل اللہ تعالیٰ کے پاس مقبول نہیں رہا اور تمہارا یہ عمل بیکار اور اکارت ہوگیا اور ساری محنت ضائع ہوگئی۔ اور سننے والے کے دل میں بھی تمہاری بات کہنے کا اثر نہیں ہوگا۔ اس لئے روکتے وقت نیت کا درست ہونا ضروری ہے۔

بات کہنے کا طریقہ درست ہونا چاہئے

اسی طرح جب بھی دوسرے سے شریعت کی بات کہنی ہو تو صحیح طریقے سے بات کہو۔ پیار و محبت اور خیر خواہی کے ساتھ بات کہو، تاکہ اس کی دل شکنی کم سے کم ہو۔ اور اس انداز سے بات کہو کہ اس کی سبکی نہ ہو، اور لوگوں کے سامنے اس کی بے عزتی نہ ہو۔ شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ ایک جملہ فرمایا کرتے تھے جو میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے کئی بار ہم نے سنا، وہ یہ کہ حق بات حق طریقے اور حق نیت سے جب بھی کہی جائے گی وہ کبھی نقصان دہ نہیں ہوگی، لہٰذا جب بھی تم یہ دیکھو کہ حق بات کہنے کے نتیجے میں کہیں لڑائی جھگڑا ہوگیا یا نقصان ہوگیا یا فساد ہوگیا تو سمجھ لو کہ ان تین باتوں میں سے ضرور کوئی بات ہوگی۔ یا تو بات حق نہیں تھی اور خواہ مخواہ اس کو حق سمجھ لیا تھا، یا بات تو حق تھی لیکن نیت درست نہیں تھی اور بات کہنے کا مقصد دوسرے کی اصلاح نہیں تھی بلکہ اپنی بڑائی جتانی مقصود تھا، یا دوسرے کو ذلیل کرنا مقصود تھا جس کی وجہ سے بات کے اندر اثر نہیں تھا، یا یہ کہ بات بھی حق تھی، نیت بھی درست تھی لیکن طریقہ حق نہیں تھا، اور بات ایسے طریقے سے کہی جیسے

دوسرے کولٹھ ماردیا۔ کلمۂ حق کوئی لٹھ نہیں ہے کہ اٹھا کر کسی کو ماردو، بلکہ حق کلمہ کہنا محبت اور خیر خواہی والا کام ہے جو حق طریقے سے انجام پائے گا۔ جب خیر خواہی میں کمی ہو جاتی ہے تو پھر حق بات سے بھی نقصان پہنچ جاتا ہے۔

نرمی سے سمجھانا چاہئے

میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کو فرعون کی اصلاح کے لئے بھیجا اور فرعون کون تھا؟ خدائی کا دعویدار تھا، جو یہ کہتا تھا:

﴿أَنَا رَبُّكُمُ الْأَعْلَى﴾ (۱)

''میں تمہارا بڑا پروردگار ہوں''

گویا کہ وہ فرعون بدترین کافر تھا۔ لیکن جب یہ دونوں پیغمبر فرعون کے پاس جانے لگے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿فَقُولَا لَهُ قَوْلًا لَيِّنًا لَعَلَّهُ يَتَذَكَّرُ أَوْ يَخْشَى﴾ (۲)

''تم دونوں فرعون کے پاس جا کر نرم بات کہنا، شاید کہ وہ نصیحت مان لے یا ڈر جائے''

یہ واقعہ سنانے کے بعد والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ آج تم حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بڑے مصلح نہیں ہو سکتے، اور تمہارا مقابل فرعون سے بڑا گمراہ نہیں ہو سکتا، چاہے وہ کتنا ہی بڑا فاسق و فاجر اور مشرک ہو، اس لئے کہ وہ تو خدائی کا دعویدار تھا۔ اس کے باوجود حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام سے فرمایا جا رہا ہے کہ جب فرعون کے پاس جاؤ تو ذرا نرمی سے بات کرنا۔ سختی سے بات مت کرنا۔ اس کے ذریعہ ہمارے لئے قیامت تک یہ پیغمبرانہ طریقہ کار مقرر فرما دیا کہ جب بھی کسی سے دین کی بات کہیں تو نرمی سے کہیں، سختی سے نہ کہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سمجھانے کا انداز

ایک مرتبہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم مسجدِ نبوی میں تشریف فرما تھے۔ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی موجود تھے۔ اتنے میں ایک دیہاتی شخص مسجدِ نبوی میں داخل ہوا، اور آکر جلدی جلدی اس نے نماز پڑھی اور نماز کے بعد عجیب وغریب دعا کی:

''اَللّٰهُمَّ ارْحَمْنِيْ وَمُحَمَّدًا وَّلَا تَرْحَمْ مَعَنَا أَحَدًا''

''اے اللہ! مجھ پر رحم فرما اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر رحم فرما اور ہمارے علاوہ کسی پر رحم نہ فرما''

(۱) النازعات: ۲٤ (۲) طٰہٰ: ٤٤

جب حضورِ اقدس ﷺ نے اس کی یہ دعا سنی تو فرمایا کہ تم نے اللہ تعالیٰ کی رحمت کو بہت تنگ اور محدود کر دیا کہ صرف دو آدمیوں پر رحم فرما، اور کسی پر رحم نہ فرما، حالانکہ اللہ تعالیٰ کی رحمت بہت وسیع ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد اسی دیہاتی نے مسجد کے صحن میں بیٹھ کر پیشاب کر دیا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جب یہ دیکھا کہ وہ مسجد میں پیشاب کر رہا ہے تو صحابہ کرام جلدی سے اس کی طرف دوڑے، اور قریب تھا کہ اس پر ڈانٹ ڈپٹ شروع کر دیتے، اتنے میں حضورِ اقدس ﷺ نے فرمایا:

((لَا تُزْرِمُوْهُ))

''اس کا پیشاب بند مت کرو''

جو کام کرنا تھا، وہ اس نے کر لیا۔ اور پورا پیشاب کرنے دو، اس کو مت ڈانٹو۔ اور فرمایا:

((إِنَّمَا بُعِثْتُمْ مُيَسِّرِيْنَ وَلَمْ تُبْعَثُوْا مُعَسِّرِيْنَ))

''تمہیں لوگوں کے لئے خیر خواہی کرنے والا اور آسانی کرنے والا بنا کر بھیجا گیا ہے، دشواری کرنے والا بنا کر نہیں بھیجا گیا''

لہٰذا اب جا کر مسجد کو پانی کے ذریعہ صاف کر دو۔ پھر آپ نے اس کو بلا کر سمجھایا کہ یہ مسجد اللہ کا گھر ہے، اس قسم کے کاموں کے لئے نہیں ہے۔ لہٰذا تمہارا یہ عمل درست نہیں، آئندہ ایسا مت کرنا۔ (۱)

انبیاء علیہم السلام کا اندازِ تبلیغ

اگر ہمارے سامنے کوئی شخص اس طرح مسجد میں پیشاب کر دے تو شاید ہم لوگ تو اس کی تکہ بوٹی کر دیں۔ لیکن حضورِ اقدس ﷺ نے دیکھا کہ یہ شخص دیہاتی ہے اور ناواقف ہے، لاعلمی اور ناواقفی کی وجہ سے اس نے یہ حرکت کی ہے، لہٰذا اس کو ڈانٹنے کا یہ موقع نہیں ہے بلکہ نرمی سے سمجھانے کا موقع ہے۔ چنانچہ آپ نے نرمی سے اس کو سمجھا دیا۔ انبیاء علیہم السلام کی یہی تعلیم ہے۔ اگر کوئی مخالف گالی بھی دیتا ہے تو انبیاء علیہم السلام اس کے جواب میں گالی نہیں دیتے۔ قرآن کریم میں مشرکین کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ انہوں نے انبیاء علیہم السلام سے مخاطب ہو کر کہا:

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب الأدب، باب رحمة الناس والبهائم، رقم: ۵۵۵۱، سنن الترمذی، کتاب الطهارة عن رسول الله، باب ما جاء فی البول یصیب الأرض، رقم: ۱۳۷، سنن النسائی، کتاب السهو، باب الکلام فی الصلاة، رقم: ۱۲۰۱، سنن أبی داؤد، کتاب الطهارة، باب الأرض یصیبها البول، رقم: ۳۲۴، سنن ابن ماجه، کتاب الطهارة وسننها، باب الأرض یصیبها البول کیف تغسل، رقم: ۵۲۳

﴿إِنَّا لَنَرٰكَ فِیْ سَفَاهَةٍ وَإِنَّا لَنَظُنُّكَ مِنَ الْكٰذِبِیْنَ﴾ (۱)

یعنی ہم آپ کو دیکھ رہے ہیں کہ آپ بیوقوف ہیں اور ہمارے خیال میں آپ جھوٹے ہیں۔ آج اگر کوئی شخص کسی عالم یا مقرر یا خطیب کو یہ کہہ دے کہ تم بیوقوف اور جھوٹے ہو، تو جواب میں اس کو یہ کہہ دے گا کہ تو بیوقوف، تیرا باپ بیوقوف، لیکن پیغمبر نے جواب میں فرمایا:

﴿یٰقَوْمِ لَیْسَ بِیْ سَفَاهَةٌ وَّلٰكِنِّیْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴾ (۲)

اے میری قوم، میں بیوقوف نہیں ہوں، بلکہ میں تو رب العالمین کا پیغمبر ہوں۔

دیکھئے! گالی کا جواب گالی سے نہیں دیا جارہا ہے، بلکہ محبت اور پیار کا برتاؤ کیا جارہا ہے۔ ایک اور قوم نے اپنے پیغمبر سے کہا:

﴿إِنَّا لَنَرٰكَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ﴾ (۳)

تم تو کھلے گمراہ نظر آرہے ہو۔ جواب میں وہ پیغمبر فرماتے ہیں: اے میری قوم! میں گمراہ نہیں ہوں، بلکہ میں تو اللہ کا رسول ہوں۔

یہ پیغمبروں کی اصلاح و دعوت کا طریقہ ہے۔ لہٰذا ہماری باتیں جو بے اثر ہو رہی ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ یا تو بات حق نہیں ہے یا طریقہ حق نہیں ہے یا نیت حق نہیں ہے۔ اور اس کی وجہ سے یہ ساری خرابیاں پیدا ہو رہی ہیں۔

حضرت شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ

حضرت شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ ان بزرگوں میں سے ہیں جنہوں نے اس پر عمل کر کے دکھا دیا ہے۔ ان کا واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ آپ دہلی کی جامع مسجد میں وعظ کہہ رہے تھے، وعظ کے دوران ایک شخص کھڑا ہوا اور اس نے کہا: مولانا! میرے ایک سوال کا جواب دیدیں۔ حضرت شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ نے پوچھا: کیا سوال ہے؟ اس نے کہا: میں نے سنا ہے کہ آپ حرام زادے ہیں۔ العیاذ باللہ۔ عین وعظ کے دوران بھرے مجمع میں یہ بات اس نے ایسے شخص سے کہی جو نہ صرف یہ کہ بڑے عالم تھے بلکہ شاہی خاندان کے شہزادے تھے۔ ہم جیسا کوئی ہوتا تو فوراً غصہ آجاتا اور نہ جانے اس کا کیا حشر کرتا۔ اور ہم نہ کرتے تو ہمارے معتقدین اس کی تکہ بوٹی کر ڈالتے کہ یہ ہمارے شیخ کو ایسا کہتا ہے۔ لیکن حضرت مولانا شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ نے جواب میں فرمایا کہ بھائی! آپ کو غلط اطلاع ملی ہے، میری والدہ کے نکاح کے گواہ تو اب بھی دہلی میں موجود ہیں۔ اس کی گالی کا اس طرح جواب دیا اور اس کو مسئلہ نہیں بنایا۔

---

(۱) الاعراف: ٦٦ (۲) الأعراف: ٦٧ (۳) الاعراف: ٦٠

بات میں تاثیر کیسے پیدا ہو؟

لہٰذا جب کوئی اللہ کا بندہ اپنی نفسانیت کو فنا کر کے اپنے آپ کو مٹا کر اللہ کے لئے بات کرتا ہے اور اس وقت دنیا والوں کو یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اس کے سامنے اس کا اپنا کوئی مفاد نہیں ہے اور یہ جو کچھ کہہ رہا ہے اللہ کے لئے کہہ رہا ہے تو پھر اس کی بات میں اثر ہوتا ہے۔ چنانچہ حضرت شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کے ایک ایک وعظ میں ہزارہا افراد ان کے ہاتھ پر توبہ کرتے تھے۔ آج ہم لوگوں نے اول تو تبلیغ و دعوت چھوڑ دی، اور اگر کوئی کرتا بھی ہے تو ایسے طریقے سے کرتا ہے جو لوگوں کو برانگیختہ کرنے کا ہوتا ہے، جس سے صحیح معنی میں فائدہ نہیں پہنچتا۔ اس لئے یہ تین باتیں یاد رکھنی چاہئیں۔ اول بات حق ہو۔ دوسرے نیت حق ہو۔ تیسرے طریقہ حق ہو۔ لہٰذا حق بات حق طریقے سے حق نیت سے کہی جائے گی تو وہ کبھی نقصان دہ نہیں ہوگی، بلکہ اس کا فائدہ ہی پہنچے گا۔

اجتماعی تبلیغ کا حق کس کو ہے؟

تبلیغ کی دوسری قسم ہے "اجتماعی تبلیغ"، یعنی لوگوں کو جمع کر کے کوئی وعظ کرنا، تقریر کرنا، یا ان کو نصیحت کرنا۔ اس کو اجتماعی دعوت وتبلیغ کہتے ہیں۔ یہ اجتماعی تبلیغ و دعوت فرضِ عین نہیں ہے، بلکہ فرضِ کفایہ ہے، لہٰذا اگر کچھ لوگ اس فریضہ کی ادائیگی کے لئے کام کریں تو باقی لوگوں سے یہ فریضہ ساقط ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ "اجتماعی تبلیغ" کرنا ہر آدمی کا کام نہیں ہے کہ جس کا دل چاہے کھڑا ہو جائے، اور وعظ کرنا شروع کر دے، بلکہ اس کے لئے مطلوب علم کی ضرورت ہے۔ اگر اتنا علم نہیں ہے تو اس صورت میں اجتماعی تبلیغ کا انسان مکلّف نہیں ہے۔ اور کم از کم اتنا علم ہونا ضروری ہے، جس کے نتیجے میں وعظ کے دوران غلط بات کہنے کا اندیشہ نہ ہو، تب وعظ کہنے کی اجازت ہے، ورنہ اجازت نہیں۔ یہ وعظ وتبلیغ کا معاملہ بڑا نازک ہے۔ جب آدمی یہ دیکھتا ہے کہ اتنے سارے لوگ بیٹھ کر میری باتیں سن رہے ہیں تو خود اس کے دماغ میں بڑائی آجاتی ہے۔ اب خود ہی تقریر اور وعظ کے ذریعہ لوگوں کو دھوکہ دیتا ہے۔ اس کے نتیجے میں لوگ اس دھوکہ میں آجاتے ہیں کہ یہ شخص علم جاننے والا ہے اور بڑا نیک آدمی ہے۔ اور جب لوگ دھوکے میں آگئے اب خود بھی دھوکے میں آگیا کہ اتنی ساری مخلوق، اتنے سارے لوگ مجھے عالم کہہ رہے ہیں، اور مجھے اچھا اور نیک کہہ رہے ہیں، تو ضرور میں کچھ ہوں گا، تبھی تو یہ ایسا کہہ رہے ہیں ورنہ یہ سارے لوگ پاگل تو نہیں ہیں۔ بہر حال، وعظ اور تقریر کے نتیجے میں آدمی اس فتنہ میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

اس لئے ہر شخص کو تقریر اور وعظ نہیں کرنا چاہئے۔ ہاں اگر وعظ کہنے کے لئے کوئی بڑا کسی جگہ

بٹھادے تو اس وقت بڑوں کی سرپرستی میں اگر کام کرے، اور اللہ تعالیٰ سے مدد بھی مانگتا رہے تو پھر اللہ تعالیٰ اس فتنے سے محفوظ رکھتے ہیں۔

درسِ قرآن اور درسِ حدیث دینا

وعظ اور تقریر پھر بھی ذرا ہلکی بات ہے، لیکن اب تو درسِ قرآن اور درسِ حدیث دینے تک نوبت پہنچ گئی ہے۔ جس کے دل میں بھی درسِ قرآن دینے کا خیال آیا، بس اس نے درسِ قرآن دینا شروع کر دیا۔ حالانکہ قرآن کریم وہ چیز ہے جس کے بارے میں حضورِ اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((مَنْ قَالَ فِي الْقُرْاٰنِ بِغَيْرِ عِلْمٍ فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهٗ مِنَ النَّارِ)) (۱)

''جو شخص قرآن کریم کی تفسیر میں علم کے بغیر کوئی بات کہے تو وہ شخص اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالے''

ایک دوسری حدیث میں آپ نے فرمایا:

((مَنْ قَالَ فِيْ كِتَابِ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ بِرَأْيِهٖ فَاَصَابَ فَقَدْ اَخْطَأَ)) (۲)

''جو شخص اللہ جل شانہ کی کتاب میں اپنی رائے سے تفسیر کرے، اگر صحیح بھی کرے تو بھی اس نے غلط کام کیا''

اتنی سنگین وعید حضور ﷺ نے بیان فرمائی ہے اس کے باوجود آج یہ حال ہے کہ اگر کسی شخص کو کتابوں کے مطالعے کے ذریعہ دین کی کچھ باتیں معلوم ہوگئیں تو اب وہ عالم بن گیا، اور اس نے درسِ قرآن دینا شروع کر دیا، حالانکہ یہ درسِ قرآن اور درسِ حدیث ایسا عمل ہے کہ بڑے بڑے علماء اس سے کانپتے ہیں کہ چہ جائیکہ عام آدمی قرآن کریم کا درس دے اور اس کی تفسیر بیان کرے۔

حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور تفسیرِ قرآنِ کریم

میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے عمر کے ستر پچھتر سال دین کے علوم پڑھنے پڑھانے میں گزارے، آخر عمر میں جاکر ''معارف القرآن'' کے نام سے تفسیر تالیف فرمائی، اس کے بارے میں آپ مجھ سے بار بار فرماتے تھے کہ معلوم نہیں کہ میں اس قابل تھا کہ تفسیر پر

(۱) سنن الترمذی، کتاب تفسیر القرآن عن رسول الله، باب ما جاء فی الذی یفسر القرآن برأیه، رقم: ۲۸۷۴، مسند أحمد، من سند بنی هاشم، بدایة مسند عبدالله بن العباس، رقم: ۱۹۶۵

(۲) سنن أبی داؤد، کتاب العلم، باب الکلام فی کتاب الله بغیر علم، رقم: ۳۱۶۷، سنن الترمزی، کتاب تفسیر القرآن عن رسول الله، رقم: ۲۸۷۶

قلم اُٹھاتا، میں تو حقیقت میں تفسیر کا اہل نہیں ہوں۔ لیکن حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر کو میں نے آسان الفاظ میں تعبیر کر دیا ہے ـــــ ساری عمر یہ فرماتے رہے، بڑے بڑے علماء تفسیر پر کلام کرتے ہوئے تھراتے رہے۔

امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ اور تشریحِ حدیث

حضرت امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ، جنہوں نے "صحیح مسلم" کے نام سے صحیح احادیث کا ایک مجموعہ جمع فرما دیا ہے، اس کتاب میں صحیح احادیث تو جمع کر دیں، لیکن حدیث کی تشریح میں ایک لفظ کہنا بھی گوارہ نہیں کیا، حتیٰ کہ اپنی کتاب میں "باب" بھی نہیں قائم کیے، جیسے دوسرے محدثین نے "نماز کا باب"، "طہارت کا باب" وغیرہ کے عنوان سے باب قائم فرمائے ہیں۔ صرف اس خیال سے باب قائم نہیں فرمائے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کی تشریح میں کوئی بات کہہ دوں، اس میں مجھ سے کوئی غلطی ہو جائے، پھر اللہ تعالیٰ کے یہاں اس پر میری پکڑ ہو جائے۔ بس یہ فرما دیا کہ میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں جمع کر رہا ہوں۔ اب علماء ان احادیث سے جو مسئلے چاہیں مستنبط کر لیں ـــــ اس سے اندازہ لگائیے کہ یہ کتنا نازک کام ہے، لیکن آج کل جس کا دل چاہتا ہے درس دینا شروع کر دیتا ہے۔ معلوم ہوا کہ فلاں جگہ فلاں صاحب نے درسِ قرآن دینا شروع کر دیا ہے۔ فلاں صاحب نے درسِ حدیث دینا شروع کر دیا۔ حالانکہ نہ علم ہے، اور نہ درس دینے کی شرائط ہیں۔ اسی کا نتیجہ یہ ہے کہ آج طرح طرح کے فتنے پھیل رہے ہیں، فتنوں کا بازار گرم ہے۔

لہٰذا کسی کے درسِ قرآن اور درسِ حدیث میں شریک ہونے سے پہلے اس بات کا اطمینان کر لینا چاہئے کہ جو شخص درس دے رہا ہے وہ واقعۃً درس دینے کا اہل ہے یا نہیں؟ اس کے پاس علم مکمل ہے یا نہیں؟ اس لئے کہ درس دینا ہر ایک کے بس کا کام نہیں۔ بہر حال، میں یہ عرض کر رہا تھا کہ جس شخص کے پاس کما حقہ علم نہ ہو، اس کو اجتماعی تبلیغ اور وعظ و تقریر نہیں کرنی چاہئے، البتہ ایسے شخص کو انفرادی تبلیغ میں حصہ لینا چاہئے۔

کیا بے عمل شخص وعظ و نصیحت نہ کرے؟

ایک یہ بات مشہور ہے کہ اگر کوئی شخص خود کسی غلطی کے اندر مبتلا ہے تو اس کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ دوسروں کو اس غلطی سے روکے۔ مثلاً ایک شخص نماز باجماعت کا پوری طرح پابند نہیں ہے تو یہ کہا جاتا ہے کہ ایسا شخص دوسروں کو بھی نماز باجماعت کی تلقین نہ کرے، جب تک کہ خود نماز باجماعت کا پابند نہ ہو جائے۔ یہ بات درست نہیں ـــــ بلکہ حقیقت میں بات اُلٹی ہے، وہ یہ کہ جو شخص دوسروں کو نماز

باجماعت کی تلقین کرتا ہے اس کو چاہئے کہ وہ خود بھی نماز باجماعت کی پابندی کرے، نہ یہ کہ جو شخص نماز باجماعت کا پابند نہیں، وہ دوسروں کو بھی تلقین نہ کرے۔ عام طور پر لوگوں میں یہ آیت مشہور ہے:

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ﴾ (۱)

''اے ایمان والو، وہ بات کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں ہو''

بعض لوگ اس آیت کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ اگر کوئی شخص کوئی کام نہیں کرتا تو وہ شخص دوسروں کو بھی اس کی تلقین نہ کرے۔ مثلاً ایک شخص صدقہ نہیں دیتا تو وہ دوسروں کو بھی صدقہ کی تلقین نہ کرے۔ یا مثلاً ایک شخص سچ نہیں بولتا تو وہ دوسروں کو بھی سچ بولنے کی تلقین نہ کرے۔ آیت کا یہ مطلب لینا درست نہیں۔ بلکہ اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ جو بات اور جو چیز تمہارے اندر موجود نہیں ہے، تم اس کا دعویٰ مت کرو کہ یہ بات میرے اندر موجود ہے۔ مثلاً اگر تم نماز باجماعت کے پابند نہیں ہو تو دوسروں سے یہ مت کہو کہ میں نماز باجماعت کا پابند ہوں۔ یا تم اگر نیک اور متقی نہیں ہو تو دوسروں کے سامنے یہ دعویٰ مت کرو کہ میں نیک اور متقی ہوں۔ یا مثلاً تم نے حج نہیں کیا تو یہ مت کہو کہ میں نے حج کرلیا ہے۔ اس آیت کے یہ معنی ہیں۔ یعنی جو کام تم کرتے نہیں ہو، دوسروں کے سامنے اس کا دعویٰ کیوں کرتے ہو؟ آیت کے یہ معنی نہیں ہیں کہ جو کام تم نہیں کرتے تو دوسروں سے اس کی تلقین بھی مت کرو، اس لئے کہ بعض اوقات دوسروں کو کہنے سے انسان کو خود فائدہ ہو جاتا ہے، جب انسان دوسروں کو کہتا ہے، اور خود عمل نہیں کرتا تو انسان کو شرم آتی ہے، اور اس شرم کی وجہ سے انسان خود بھی عمل کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

دوسروں کو نصیحت کرنے والا خود بھی عمل کرے

قرآن کریم کی ایک دوسری آیت ہے، جس میں اللہ تعالیٰ نے یہودی علماء سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

﴿اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ﴾ (۲)

''کیا تم دوسروں کو تو نیکی کی تلقین کرتے ہو، اور اپنے آپ کو بھول جاتے ہو''

اور خود اس نصیحت پر عمل نہیں کرتے، لہٰذا جب تم دوسروں کو کسی عمل کی نصیحت کر رہے ہو تو خود بھی عمل کرو، نہ یہ کہ چونکہ خود عمل نہیں کر رہے ہو، لہٰذا دوسروں کو بھی نصیحت نہ کرو، یہ مطلب نہیں ہے، بہر حال، دوسروں کو نصیحت کرنے میں اس بات کی رکاوٹ نہیں ہونی چاہئے کہ میں خود اس پر کاربند نہیں ہوں، بلکہ بزرگوں نے تو یہ فرمایا ہے کہ: من نکردم شما حذر بکنید، میں نے پرہیز نہیں کیا، لیکن تم پرہیز کرلو۔

(۱) الصف: ۲ (۲) البقرۃ: ٤٤

حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ بعض اوقات جب مجھے اپنے اندر کوئی عیب محسوس ہوتا ہے تو میں اس عیب کے بارے میں وعظ کہہ دیتا ہوں، اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ میری اصلاح فرما دیتے ہیں۔

البتہ یہ بات ضرور ہے کہ ایک شخص وہ ہے جو خود تو عمل نہیں کرتا، لیکن دوسروں کو نصیحت کرتا ہے، اور ایک آدمی وہ ہے جو خود بھی عمل کرتا ہے، اور دوسروں کو بھی اس کی نصیحت کرتا ہے، دونوں کی نصیحت کی تاثیر میں فرق ہے،، جو شخص عمل کر کے نصیحت کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کی بات میں اثر پیدا فرما دیتے ہیں، وہ بات دلوں میں اُتر جاتی ہے، اس سے انسانوں کی زندگیوں میں انقلاب آتا ہے، اور بے عملی کے ساتھ جو نصیحت کی جاتی ہے، اس کا اثر سننے والوں پر بھی کما حقہ نہیں ہوتا، زبان سے بات نکلتی ہے، اور کانوں سے ٹکرا کر واپس آجاتی ہے، دلوں میں نہیں اُترتی، لہٰذا عمل کی کوشش ضرور کرنی چاہئے، مگر یہ چیز نصیحت کی بات کہنے سے مانع نہیں ہونی چاہئے۔

مستحب کے ترک پر نکیر درست نہیں

بہرحال، اگر کوئی شخص فرائض اور واجبات میں کوتاہی کر رہا ہو، یا کسی واضح گناہ میں مبتلا ہو تو اس کو تبلیغ کرنا اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنا فرض ہے۔ جس کی تفصیل اُوپر عرض کر دی۔ شریعت کے بعض احکام ایسے ہیں جو فرض و واجب نہیں ہیں، بلکہ مستحب ہیں۔ مستحب کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی اس کو کرے گا تو ثواب ملے گا، نہیں کرے گا تو کوئی گناہ نہیں۔ یا شریعت کے آداب ہیں جو علماء کرامؒ بتاتے ہیں۔ ان مستحبات اور آداب کے بارے میں حکم یہ ہے کہ لوگوں کو ان کی ترغیب تو دی جائے گی کہ اس طرح کر لو تو اچھی بات ہے، لیکن اس کے نہ کرنے پر نکیر نہیں کی جائے گی۔ اگر کوئی شخص اس مستحب کو انجام نہیں دے رہا ہے تو آپ کے لئے اس کو طعنہ دینے یا ملامت کرنے کا کوئی جواز نہیں کہ تم نے یہ کام کیوں نہیں کیا؟ ہاں! اگر کوئی تمہارا شاگرد ہے، یا بیٹا ہے، یا تمہارے زیرِ تربیت ہے مثلاً تمہارا مرید ہے تو بیشک اس کو کہہ دینا چاہئے کہ فلاں وقت میں تم نے فلاں مستحب عمل چھوڑ دیا تھا، یا فلاں ادب کا لحاظ نہیں کیا تھا، اس کو کرنا چاہئے۔ لیکن اگر ایک عام آدمی کوئی مستحب عمل چھوڑ رہا ہے تو اس صورت میں آپ کو اس پر اعتراض کرنے کا کوئی حق نہیں۔ بعض لوگ مستحبات کو واجبات کا درجہ دے کر لوگوں پر اعتراض شروع کر دیتے ہیں کہ تم نے یہ کام کیوں چھوڑا؟ حالانکہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ تو یہ نہیں پوچھیں گے کہ تم نے فلاں مستحب کام کیوں نہیں کیا تھا؟ نہ فرشتے سوال کریں گے، لیکن تم خدائی فوجدار بن کر اعتراض کر دیتے ہو کہ یہ مستحب کام تم نے کیوں چھوڑ دیا؟ یہ عمل کسی طرح بھی درست نہیں۔

اذان کے بعد دعا پڑھنا

نبی پاک ﷺ نے اذان کے بعد پڑھنے کے لئے یہ دعا سکھائی ہے:

((اَللّٰهُمَّ رَبَّ هٰذِهِ الدَّعْوَةِ التَّامَّةِ وَالصَّلٰوةِ الْقَائِمَةِ اٰتِ مُحَمَّدَا نِ الْوَسِيْلَةَ وَالْفَضِيْلَةَ وَابْعَثْهُ مَقَامًا مَّحْمُوْدَا نِ الَّذِىْ وَعَدْتَّهٗ اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيْعَاد)) (۱)

حضورِ اقدس ﷺ کی طرف سے اس دعا کی ترغیب ہے کہ ہر مسلمان کو اذان کے بعد یہ دعا پڑھنی چاہئے۔ یہ بڑی برکت کی دعا ہے۔ اس لئے اپنے بچوں کو اور اپنے گھر والوں کو اس کی تعلیم دینی چاہئے کہ یہ دعا پڑھا کریں۔ اسی طرح دوسرے مسلمانوں کو بھی اس دعا کے پڑھنے کی ترغیب دینی چاہئے۔ لیکن اگر ایک شخص نے اذان کے بعد یہ دعا نہیں پڑھی، اب آپ اس پر اعتراض شروع کر دیں کہ تم نے یہ دعا کیوں نہیں پڑھی؟ اور اس پر نکیر شروع کر دیں، یہ درست نہیں۔ اس لئے کہ نکیر ہمیشہ فرض کے چھوڑنے پر یا گناہ کے ارتکاب پر کی جاتی ہے، مستحب کام کے ترک پر کوئی نکیر نہیں ہو سکتی۔

آداب کے ترک پر نکیر جائز نہیں

بعض اعمال ایسے ہیں جو شرعی اعتبار سے مستحب بھی نہیں ہیں، اور قرآن وحدیث میں ان کو مستحب قرار نہیں دیا گیا۔ البتہ بعض علماء نے اس کو آداب میں شمار کیا ہے۔ مثلاً بعض علماء نے یہ ادب بتایا ہے کہ جب کھانا کھانے کے لئے ہاتھ دھوئے جائیں تو ان کو تولیہ یا رومال وغیرہ سے پونچھا نہ جائے۔ اسی طرح یہ ادب بتایا کہ دستر خوان پر پہلے تم بیٹھ جاؤ، کھانا بعد میں رکھا جائے، اگر کھانا پہلے لگا دیا گیا، تم بعد میں پہنچے تو یہ کھانے کے ادب کے خلاف ہے۔ قرآن وحدیث میں یہ آداب کہیں بھی موجود نہیں ہیں، لیکن علماء کرامؒ نے یہ کھانے کے آداب بتائے ہیں، ان کو مستحب کہنا بھی مشکل ہے۔ اب اگر ایک شخص نے ان آداب کا لحاظ نہ کیا مثلاً اس نے کھانے کے لئے ہاتھ دھو کر تولیہ سے پونچھ لیے، یا دستر خوان پر کھانا پہلے لگا دیا گیا اور وہ شخص بعد میں جا کر بیٹھا تو اب اس شخص پر اعتراض کرنا اور

(۱) صحيح البخاري، كتاب الأذان، باب الدعاء عند الأذان، رقم: ٥٧٩، سنن الترمذي، كتاب الصلاة، باب منه آخر، رقم: ١٩٥، سنن النسائي، كتاب الأذان، باب الدعاء عند الأذان، رقم: ٦٧٣، سنن أبي داؤد، كتاب الصلاة، باب ما جاء في الدعاء عند الأذان، رقم: ٤٤٥، سنن ابن ماجه، كتاب الأذان والسنة فيه، باب ما يقال اذا أذن المؤذن، رقم: ٧١٤، مسند أحمد، مسند جابر بن عبدالله، رقم: ١٤٠٩٢، دعا کا ترجمہ یہ ہے: ''اے اللہ! اس مکمل دعوت اور اس کے بعد کھڑی ہونے والی نماز کے رب تو حضرت محمد ﷺ کو وسیلہ اور فضیلت اور بلند درجہ عطا فرما اور انہیں اس مقام محمود پر پہنچا دے جس کا تو ان سے وعدہ فرمایا ہے اور بے شک تو اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرتا''

اس کو یہ کہنا کہ تم نے شریعت کے خلاف یا سنت کے خلاف کام کیا، یہ بات درست نہیں۔ اس لئے کہ یہ آداب نہ تو شرعاً سنت ہیں اور نہ مستحب ہیں۔ اس لئے ان آداب کے ترک کرنے والے پر اعتراض اور نکیر کرنا درست نہیں۔ ان معاملات کے اندر ہمارے معاشرے میں بہت افراط اور تفریط پائی جاتی ہے اور بعض اوقات چھوٹی چھوٹی بات پر بڑی نکیر کی جاتی ہے جو کسی طرح بھی درست نہیں۔

چارزانو بیٹھ کر کھانا بھی جائز ہے

کھانے کے وقت چارزانو ہو کر بیٹھنا بھی جائز ہے، ناجائز نہیں، اس میں کوئی گناہ نہیں، لیکن یہ نشست تواضع کے اتنے قریب نہیں ہے، جتنی دوزانو بیٹھ کر کھانے یا ایک ٹانگ کھڑی کر کے کھانے کی نشست تواضع کے قریب ہے۔ لہٰذا عادت تو اس بات کی ڈالنی چاہئے کہ آدمی دوزانو بیٹھ کر کھائے، یا ایک ٹانگ کھڑی کر کے کھائے، چارزانو نہ بیٹھے، لیکن اگر کسی سے اس طرح نہیں بیٹھا جاتا، یا کوئی شخص اپنے آرام کے لئے چارزانو بیٹھ کر کھانا کھاتا ہے تو یہ کوئی گناہ نہیں۔ یہ جو لوگوں میں مشہور ہے کہ چارزانو بیٹھ کر کھانا ناجائز ہے، یہ خیال درست نہیں۔ لہٰذا جب چارزانو بیٹھ کر کھانا جائز ہے تو اس طرح بیٹھ کر کھانے والے پر نکیر کرنا بھی درست نہیں۔

میز کرسی پر بیٹھ کر کھانا بھی جائز ہے

میز کرسی پر کھانا بھی کوئی گناہ اور ناجائز نہیں۔ لیکن زمین پر بیٹھ کر کھانے میں سنت کی اتباع کا ثواب بھی ہے، اور سنت سے زیادہ قریب بھی ہے۔ اس لئے حتی الامکان انسان کو اس بات کی کوشش کرنی چاہئے کہ وہ زمین پر بیٹھ کر کھانا کھائے۔ اس لئے کہ جتنا سنت سے زیادہ قریب ہوگا اتنی ہی برکت زیادہ ہوگی اور اتنا ہی ثواب زیادہ ملے گا۔ اتنے ہی فوائد زیادہ حاصل ہوں گے۔ بہرحال، میز کرسی پر بیٹھ کر کھانا بھی جائز ہے، گناہ نہیں ہے۔ لہٰذا میز کرسی پر بیٹھ کر کھانے والے پر نکیر کرنا درست نہیں۔

زمین پر بیٹھ کر کھانا سنت ہے

حضورِ اقدس ﷺ دو وجہ سے زمین پر بیٹھ کر کھانا کھاتے تھے، ایک تو یہ کہ اس زمانہ میں زندگی سادہ تھی، میز کرسی کا رواج ہی نہیں تھا۔ اس لئے نیچے بیٹھا کرتے تھے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ نیچے بیٹھ کر کھانے میں تواضع زیادہ ہے، اور کھانے کی توقیر بھی زیادہ ہے۔ آپ اس کا تجربہ کر کے دیکھ لیجئے کہ میز کرسی پر بیٹھ کر کھانے میں دل کی کیفیت اور ہوگی اور زمین پر بیٹھ کر کھانے میں دل کی کیفیت اور ہوگی،

دونوں میں زمین آسمان کا فرق محسوس ہوگا۔ اس لئے کہ زمین پر بیٹھ کر کھانے کی صورت میں طبیعت کے اندر تواضع زیادہ ہوگی، عاجزی ہوگی، مسکنت ہوگی، عبدیت ہوگی۔ اور میز کرسی پر بیٹھ کر کھانے کی صورت میں یہ باتیں پیدا نہیں ہوتیں۔ اس لئے حتی الامکان اس بات کی کوشش کرنی چاہئے کہ آدمی زمین پر بیٹھ کر کھانا کھائے۔ لیکن اگر کہیں میز کرسی پر بیٹھ کر کھانے کا موقع آجائے تو اس طرح کھانے میں کوئی حرج اور گناہ بھی نہیں ہے۔ لہٰذا اس پر اتنا تشدد کرنا بھی ٹھیک نہیں، جیسا کہ بعض لوگ میز کرسی پر بیٹھ کر کھانے کو حرام اور ناجائز ہی سمجھتے ہیں اور اس پر بہت زیادہ نکیر کرتے ہیں۔ یہ عمل بھی درست نہیں۔

بشرطیکہ اس سنت کا مذاق نہ اُڑایا جائے

اور یہ جو میں نے کہا کہ زمین پر بیٹھ کر کھانا سنت سے زیادہ قریب ہے اور زیادہ افضل ہے اور زیادہ ثواب کا باعث ہے، یہ بھی اس وقت ہے جب اس سنت کو معاذ اللہ مذاق نہ بنایا جائے، لہٰذا اگر کسی جگہ پر اس بات کا اندیشہ ہو کہ اگر نیچے زمین پر بیٹھ کر کھانا کھایا گیا تو لوگ اس سنت کا مذاق اُڑائیں گے تو ایسی جگہ زمین پر کھانے کا اصرار بھی درست نہیں۔

ہوٹل میں زمین پر کھانا کھانا

حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ایک دن سبق میں ہمیں ایک واقعہ سنایا کہ ایک دن میں اور میرے کچھ رفقاء دیوبند سے دہلی گئے۔ جب دہلی پہنچے تو وہاں کھانا کھانے کی ضرورت پیش آئی۔ چونکہ کوئی اور جگہ کھانے کی نہیں تھی اسلئے ایک ہوٹل میں کھانے کے لئے چلے گئے۔ اب ظاہر ہے کہ ہوٹل میں میز کرسی پر کھانے کا انتظام ہوتا ہے، اسلئے ہمارے دو ساتھیوں نے کہا کہ ہم تو میز کرسی پر بیٹھ کر کھانا نہیں کھائیں گے، کیونکہ زمین پر بیٹھ کر کھانا سنت ہے۔ چنانچہ انہوں نے یہ چاہا کہ ہوٹل کے اندر زمین پر اپنا رومال بچھا کر وہاں بیرے سے کھانا منگوائیں۔ حضرت والد صاحب فرماتے ہیں کہ میں نے ان کو منع کیا کہ ایسا نہ کریں بلکہ میز کرسی ہی پر بیٹھ کر کھانا کھالیں۔ انہوں نے کہا کہ ہم میز کرسی پر کھانا کیوں کھائیں؟ جب زمین پر بیٹھ کر کھانا سنت کے زیادہ قریب ہے تو پھر زمین پر بیٹھ کر کھانے سے کیوں ڈریں اور کیوں شرمائیں۔ حضرت والد صاحب نے فرمایا کہ شرمانے اور ڈرنے کی بات نہیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ جب تم لوگ یہاں اس طرح زمین پر اپنا رومال بچھا کر بیٹھو گے تو لوگوں کے سامنے اس سنت کا تم مذاق بناؤ گے، اور لوگ اس سنت کی توہین کے مرتکب ہوں گے۔ اور سنت کی توہین کا ارتکاب کرنا صرف گناہ ہی نہیں بلکہ بعض اوقات انسان کو کفر تک پہنچا دیتا ہے ـــــ اللہ تعالیٰ بچائے۔

ایک سبق آموز واقعہ

پھر حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ان سے فرمایا کہ میں تم کو ایک قصہ سناتا ہوں۔ ایک بہت بڑے محدث اور بزرگ گزرے ہیں، جو "سلیمان اعمش" کے نام سے مشہور ہیں۔ اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے استاذ بھی ہیں۔ تمام احادیث کی کتابیں ان کی روایتوں سے بھری ہوئی ہیں۔ عربی زبان میں "اعمش" چندھے کو کہا جاتا ہے، جس کی آنکھوں میں چندھیاہٹ ہو، جس میں پلکیں گر جاتی ہیں اور روشنی کی وجہ سے اس کی آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں۔ چونکہ ان کی آنکھیں چندھیائی ہوئی تھیں، اس وجہ سے "اعمش" کے لقب سے مشہور تھے۔ ان کے پاس ایک شاگرد آ گئے۔ وہ شاگرد اعرج یعنی لنگڑے تھے، پاؤں سے معذور تھے۔ شاگرد بھی ایسے تھے جو ہر وقت استاذ سے چمٹے رہنے والے تھے۔ جیسے بعض شاگردوں کی عادت ہوتی ہے کہ ہر وقت استاذ سے چمٹے رہتے ہیں۔ جہاں استاذ جا رہے ہیں وہاں شاگرد بھی ساتھ ساتھ جا رہے ہیں، یہ بھی ایسے تھے۔ چنانچہ امام اعمش رحمۃ اللہ علیہ جب بازار جاتے تو یہ "اعرج" شاگرد بھی ساتھ ہو جاتے، بازار میں لوگ فقرے کستے کہ دیکھو استاذ "چندھا" ہے اور شاگرد "لنگڑا" ہے، چنانچہ امام اعمش رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے شاگرد سے فرمایا کہ جب ہم بازار جایا کریں تو تم ہمارے ساتھ مت جایا کرو۔ شاگرد نے کہا: کیوں؟ میں آپ کا ساتھ کیوں چھوڑ دوں؟ امام اعمش رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ جب ہم بازار جاتے ہیں تو لوگ ہمارا مذاق اُڑاتے ہیں کہ استاذ چندھا ہے اور شاگرد لنگڑا ہے۔ شاگرد نے کہا:

"مَا لَنَا نُوْجَرُ وَيَأْثَمُوْنَ"

حضرت! جو لوگ مذاق اُڑاتے ہیں، ان کو مذاق اُڑانے دیں۔ اس لئے کہ اس مذاق اُڑانے کے نتیجے میں ہمیں ثواب ملتا ہے اور ان کو گناہ ہوتا ہے۔ اس میں ہمارا تو کوئی نقصان نہیں بلکہ فائدہ ہے۔ حضرت امام اعمش رحمۃ اللہ علیہ نے جواب میں فرمایا:

"نَسْلَمُ وَيَسْلَمُوْنَ خَيْرًا مِنْ اَنْ نُوْجَرَ وَيَأْثَمُوْنَ"

ارے بھائی! وہ بھی گناہ سے بچ جائیں اور ہم بھی گناہ سے بچ جائیں، یہ بہتر ہے اس سے کہ ہمیں ثواب ملے اور ان کو گناہ ہو۔ میرے ساتھ جانا کوئی فرض و واجب تو ہے نہیں، اور نہ جانے میں کوئی نقصان بھی نہیں، البتہ فائدہ یہ ہے کہ لوگ اس گناہ سے بچ جائیں گے۔ اس لئے آئندہ میرے ساتھ بازار مت جایا کرو۔

یہ ہے دین کی فہم، اب بظاہر تو شاگرد کی بات صحیح معلوم ہو رہی تھی کہ اگر لوگ مذاق اُڑاتے ہیں تو اُڑایا کریں لیکن جس شخص کی مخلوقِ خدا پر شفقت کی نگاہ ہوتی ہے، وہ مخلوق کی غلطیوں پر اتنی نظر

نہیں ڈالتا، بلکہ وہ یہ سوچتا ہے کہ جتنا ہو سکے میں مخلوق کو گناہ سے بچالوں، یہ بہتر ہے، اس لئے انہوں نے بازار جانا چھوڑ دیا۔ بہر حال، جس جگہ یہ اندیشہ ہو کہ لوگ اور زیادہ ڈھٹائی کا مظاہرہ کریں گے تو اس صورت میں کچھ نہ کہنا بہتر ہوتا ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ارشاد

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ ارشاد یاد رکھنے کے لائق ہے، آپ نے فرمایا:

"كَلِّمُوا النَّاسَ بِمَا يَعْرِفُوْنَ، أَتُحِبُّوْنَ أَنْ يُكَذَّبَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ"(۱)

یعنی جب لوگوں کے سامنے دین کی بات کہو تو ایسے انداز سے کہو جس سے لوگوں کے اندر بغاوت پیدا نہ ہو، کیا تم اس بات کو پسند کرتے ہو کہ اللہ اور اس کے رسول کی تکذیب کی جائے؟ مثلاً دین کی کوئی بات بے موقع کہہ دی جس کے نتیجے میں تکذیب کی نوبت آگئی، ایسے موقع پر دین کی بات کہنا ٹھیک نہیں۔

مولانا الیاس رحمۃ اللہ علیہ کا ایک واقعہ

حضرت مولانا الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ذات سے آج کونسا مسلمان ناواقف ہوگا، اللہ تبارک وتعالیٰ نے تبلیغ اور دین کی دعوت کا جذبہ آگ کی طرح ان کے سینے میں بھر دیا تھا، جہاں بیٹھتے بس دین کی بات شروع کر دیتے، اور دین کا پیغام پہنچاتے ـــــ ان کا واقعہ کسی نے سنایا کہ ایک صاحب ان کی خدمت میں آیا کرتے تھے، کافی دن تک آتے رہے، ان صاحب کی ڈاڑھی نہیں تھی، جب ان کو آتے ہوئے کافی دن ہوگئے تو حضرت مولانا الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے سوچا کہ اب یہ مانوس ہوگئے ہیں، چنانچہ ایک دن حضرت نے ان سے کہہ دیا کہ بھائی صاحب، ہمارا دل چاہتا ہے کہ تم بھی اس داڑھی کی سنت پر عمل کرلو، وہ صاحب ان کی یہ بات سن کر کچھ شرمندہ سے ہوگئے، اور دوسرے دن سے آنا چھوڑ دیا، جب کئی دن گزر گئے تو حضرت مولانا الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے لوگوں سے ان کے بارے پوچھا تو لوگوں نے بتایا کہ انہوں نے آنا چھوڑ دیا ہے۔ حضرت مولانا الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو بہت افسوس ہوا، اور لوگوں سے فرمایا کہ مجھ سے بڑی سخت غلطی ہوگئی، کہ میں نے کچے توے پر روٹی ڈال دی، یعنی ابھی توا گرم نہیں ہوا تھا، اور اس قابل نہیں ہوا تھا کہ اس پر روٹی ڈالی جائے، میں نے پہلے ہی روٹی ڈال

(۱) المرتضی، ص: ۲۸۷، بحوالۂ نہج البلاغہ، بعض کتابوں میں اس جملہ کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف بھی منسوب کیا گیا ہے، ملاحظہ ہو: احیاء العلوم للغزالی (۱/۳۹)، روح المعانی (۲۲/۱۶۰)، مناھل العرفان (۲/۶۶)

دی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان صاحب نے آنا ہی چھوڑ دیا۔ اگر وہ آتے رہتے تو کم از کم دین کی باتیں کان میں پڑتی رہتیں، اور اس کا فائدہ ہوتا۔ اب ایک ظاہر بین آدمی تو یہ کہے گا کہ اگر ایک شخص غلط کام کے اندر مبتلا ہے تو اس سے زبان سے کہہ دو، اس لئے کہ حضورِ اقدس ﷺ کا ارشاد ہے کہ اگر ہاتھ سے برائی کو نہیں روک سکتے تو کم از کم زبان سے کہہ دو[1] لیکن آپ نے دیکھا کہ زبان سے کہنا اُلٹا مضر اور نقصان دہ ہو گیا۔ کیونکہ ابھی تک ذہن اس کے لئے سازگار اور تیار نہیں تھا، یہ باتیں حکمت کی ہوتی ہیں کہ کس وقت کیا بات کہنی ہے، اور کس انداز سے کہنی ہے، اور کتنی بات کہنی ہے۔ دین کی بات کوئی پتھر نہیں ہے کہ اس کو اُٹھا کر پھینک دیا جائے، یا ایسا فریضہ نہیں ہے کہ اس کو سر سے ٹال دیا جائے، بلکہ یہ دیکھو اس بات کے کہنے سے کیا نتیجہ برآمد ہو گا؟ اس کا نتیجہ خراب تو نہیں ہو گا؟ اگر بات کہنے سے خراب اور برا نتیجہ نکلنے کا اندیشہ ہو تو اس وقت دین کی بات کہنے سے رک جانا چاہئے، اس وقت بات نہیں کہنی چاہئے۔ یہ بات بھی استطاعت نہ ہونے میں داخل ہے۔

خلاصہ

بہر حال، یہ بات کہ کس موقع پر کیا طرزِ عمل اختیار کیا جائے؟ کس موقع پر آدمی سختی کرے؟ اور کس موقع پر نرمی کرے؟ یہ بات صحبت کے بغیر صرف کتابیں پڑھنے سے حاصل نہیں ہو سکتی، جب تک کسی اللہ والے متقی بزرگ کے ساتھ رہ کر انسان نے رگڑے نہ کھائے ہوں، لہٰذا دوسرا انسان جب کوئی غلطی کرے تو اس کو ضرور ٹوکنا اور بتانا تو چاہئے لیکن اس کا لحاظ رکھنا اور جاننا ضروری ہے کہ کس موقع پر ٹوکنا فرض ہے اور کس موقع پر فرض نہیں؟ اور کس موقع پر کس طرح بات کرنی چاہئے؟ یہ سارے تبلیغ و دعوت کے احکام کا خلاصہ ہے، اللہ تعالیٰ ہمیں اس کی صحیح فہم عطا فرمائے۔ اور اس کے ذریعہ ہماری اور سب مسلمان بہن بھائیوں کی اصلاح فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.

---

(۱) صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب کون النهی عن المنکر من الایمان، رقم: ۷۰، سنن ابن ماجه، کتاب الفتن، باب الأمر بالمعروف والنهی عن المنکر، رقم: ٤٠٠٣، مسند أحمد، رقم: ١٠٦٥١

جہاد اور دعوت و تبلیغ ☆

جہاد کی تعریف

''جہاد'' کے لفظی معنی تو اگرچہ کوشش اور ''محنت'' کے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے دین کے لئے جو کوئی محنت اور کوشش کی جائے وہ سب لغت کے اعتبار سے ''جہاد'' میں داخل ہے۔ لیکن اصطلاح میں ''جہاد'' اس عمل کو کہا جاتا ہے جس میں کسی دشمن یا کافر کا مقابلہ کیا جائے، چاہے مقابلے کی یہ صورت ہو کہ دشمن نے ہم پر حملہ کر دیا اور ہم اس کے حملے کا دفاع کر رہے ہیں یا ہم خود کسی دشمن پر جا کر حملہ آور ہو رہے ہیں۔ دونوں صورتیں جہاد میں داخل ہیں اور یہ دونوں صورتیں مشروع ہیں۔

عیسائیوں کو شکستِ فاش

آپ کو معلوم ہے کہ ایک عرصہ دراز تک عیسائی دنیا مسلمانوں سے برسرِ پیکار رہی ہے۔ جب مسلمان عرب سے باہر نکلے تو ان کا سب سے پہلا مقابلہ قیصرِ روم سے ہوا، اور روم کی سلطنت کو مسلمانوں کے ہاتھوں بڑا نقصان پہنچا، جس کے نتیجے میں یہ عیسائی مسلمانوں کے دشمن ہو گئے اور اس کے نتیجے میں مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان صلیبی جنگیں ہوتی رہیں۔ چنانچہ سلطان صلاح الدین ایوبی، نورالدین زنگی اور عمادالدین زنگی رحمہم اللہ ان سب نے عیسائیوں کو مار مار کر ان کو شکست دی۔

صلیبی جنگیں

ہمارے ہاں ''جہاد'' ایک عبادت ہے۔ اور جہاد میں شہید ہونے یا اس جہاد میں شریک ہونے پر قرآن و حدیث میں اجر و ثواب کا وعدہ کیا گیا ہے۔ اس عظیم اجر و ثواب کے حصول کے لئے مسلمان عیسائیوں سے مقابلے کے لئے کھڑے ہو جاتے تھے۔ لیکن عیسائیوں کے ہاں جہاد کی کوئی عبادت نہیں تھی بلکہ ان کے ہاں انجیل میں جو تعلیم دی گئی ہے وہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص تمہارے ایک گال پر طمانچہ مارے تو تم اپنا دوسرا گال بھی اس کے سامنے پیش کر دو، اس لئے ان کے مذہب میں جہاد اور لڑائی کا کوئی تصور نہیں تھا، لیکن جب مسلمانوں کے ساتھ مقابلہ پیش آیا تو انہوں نے بھی اپنے یہاں جہاد کے

☆ تقریر ترمذی (۲/۱۹۹تا۲۱۶)

مقابلے میں ''کروسیٹ'' یعنی ''صلیبی جنگ'' اور ''مقدس جنگ'' کی اصطلاح مقرر کر لی۔ چنانچہ عیسائیوں کے مذہبی رہنما ''پوپ'' نے عیسائی دنیا میں یہ اعلان کرایا کہ اب تک تو ہم یہ کہتے رہے ہیں کہ اگر کوئی شخص ایک گال پر تھپڑ مارے تو دوسرا گال پیش کر دو لیکن اب مسلمانوں کے مقابلے میں جو جنگ لڑیں گے وہ بھی مذہبی اور مقدس جنگ ہوگی اور ساتھ اس نے یہ اعلان کر دیا کہ جو شخص اس جنگ میں شرکت کرے گا وہ تو مقدس ہوگا ہی، لیکن اگر کوئی شخص اس جنگ میں چندہ دے گا تو چندے کی صندوقچی میں اس کا سکہ گرنے سے پہلے وہ جنت کا مستحق ہو جائے گا۔ اس قسم کے اعلانات کے بعد صلیبی جنگوں کا سلسلہ شروع ہوا اور عرصہ دراز تک انہوں نے مسلمانوں پر حملے کیے۔ لیکن کبھی کھلے میدان میں انہوں نے نمایاں کامیابی حاصل نہیں کی بلکہ جب کبھی مقابلے پر آئے تو ہمیشہ شکست کھائی۔

بایزید یلدرم کا عجیب واقعہ

انہی صلیبی جنگوں کے زمانے کا ایک واقعہ لکھا ہے کہ ترکی کا ایک بادشاہ بایزید یلدرم تھا۔ ترکی زبان میں یلدرم ''صاعقہ'' اور ''بجلی'' کو کہتے ہیں اور وہ واقعی دشمنوں کے لئے صاعقۂ آسمانی سے کم نہیں تھا۔ ایک مرتبہ اس پر یورپ کی ساٹھ ریاستوں نے متحد ہو کر حملہ کر دیا اور جن ساٹھ ریاستوں نے حملہ کیا تھا ہر ریاست کے بادشاہ نے اس جنگ میں اپنا شہزادہ بھیجا تھا، گویا یورپ کے ساٹھ شہزادے اپنا اپنا لشکر لے کر اس کے مقابلے پر آئے اور بایزید یلدرم پر حملہ کر دیا۔ بایزید یلدرم نے نہ صرف یہ کہ ان کو شکست دی بلکہ ساٹھوں شہزادوں کو زندہ قید کر لیا اور پھر ان شہزادوں کو اعزاز و اکرام کے ساتھ خیموں میں رکھا۔ چند روز کے بعد ان کو بلا کر پوچھا کہ بتاؤ میں تمہارے ساتھ کیا معاملہ کروں۔ انہوں نے کہا کہ ہم آپ کی قید میں ہیں، آپ فاتح ہیں ہم مفتوح ہیں، آپ کو اختیار ہے کہ جو چاہیں کریں، چاہیں قتل کریں، چاہیں غلام بنالیں۔ بایزید یلدرم نے کہا کہ میں تمہیں ایک شرط پر چھوڑ دوں گا، وہ شرط یہ ہے کہ تم مجھ سے وعدہ کرو کہ تم سب اپنے وطن واپس جا کر پورے سال جنگ کی تیاری کرو گے اور پھر آئندہ سال تم سب دوبارہ مجھ پر حملہ کرو گے۔ اگر تم یہ وعدہ کرتے ہو تو میں تم کو چھوڑتا ہوں، ورنہ نہیں چھوڑوں گا۔

بایزید یلدرم کی گرفتاری اور انتقال

یہ ایسا مجاہد آدمی تھا اور اس نے یورپ کے عیسائیوں کے دانت کھٹے کر رکھے تھے۔ یہی وہ شخص ہے جس نے بہت مؤثر طریقے سے قسطنطنیہ کو فتح کرنے کے لئے محاصرہ ڈال دیا تھا اور قریب تھا کہ یہ قسطنطنیہ فتح کر لے لیکن پیچھے سے تیمور لنگ آ گیا جس کے نتیجے میں اس کو قسطنطنیہ کا محاصرہ اُٹھانا پڑا اور تیمور لنگ نے حملہ کر کے بایزید یلدرم کو شکست دی اور اس کو گرفتار کر کے پنجرے میں بند کر کے لے گیا

اور بالآخر اسی پنجرے میں بایزید کا انتقال ہو گیا۔

مسلمانوں نے میدانِ جنگ میں کبھی شکست نہیں کھائی

بہر حال، ان صلیبی جنگوں کے نتیجے میں ان عیسائیوں نے مسلمانوں کے ہاتھوں بہت مار کھائی اور بہت نقصان اُٹھایا۔ اس کے نتیجے میں ان کو مسلمانوں سے زبردست دشمنی پیدا ہو گئی اور چونکہ صلیبی جنگوں میں تو ان کو کامیابی نہیں ہوئی تھی، بلکہ بعد میں اپنے مکروفریب اور سازشوں کے ذریعہ عالمِ اسلام پر قابض ہوئے، اور انہوں نے یہ دیکھ لیا کہ میدانِ جنگ میں تو مسلمانوں کو شکست دینا مشکل ہے۔ اس لئے انہوں نے دوسرے طریقے سے مسلمانوں کو شکست دینے کی کوشش کی اور مسلمانوں میں جو تعلیمی نظام جاری کیا اس کے اندر اپنے افکار داخل کیے۔

کیا اسلام تلوار کے زور پر پھیلا ہے؟

اس موقع پر انہوں نے یہ پروپیگنڈا کیا کہ مسلمانوں میں جہاد اس لئے مشروع کیا گیا ہے کہ اس کے ذریعہ لوگوں کو زبردستی بزورِ شمشیر مسلمان بنایا جائے کہ یا تو مسلمان ہو جاؤ ورنہ تمہیں مار دیں گے۔ اور یہ جہاد درحقیقت اسلام کو پھیلانے کے لئے ایک زبردستی کا ذریعہ ہے۔ اور اسی بات کو یہ کہہ کر تعبیر کیا گیا کہ ''اسلام تلوار کے زور سے پھیلا'' ورنہ عقیدے کو مان کر لوگ مسلمان نہیں ہوئے۔ بڑی شد ومد سے یہ پروپیگنڈہ شروع کیا گیا۔

حالانکہ اس پروپیگنڈے کی کوئی حقیقت نہیں، اس لئے کہ خود قرآن کریم کا ارشاد ہے:

﴿ لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ﴾(۱)

دوسری جگہ فرمایا:

﴿ وَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ ﴾(۲)

اور دوسری بات یہ ہے کہ اگر جہاد کا منشا لوگوں کو زبردستی مسلمان بنانا ہوتا تو پھر جزیہ ادا کرنے اور غلام بنانے کی شق کیوں ہوتی؟ کہ اگر تم مسلمان نہیں ہوتے تو جزیہ ادا کرو، اس صورت میں بھی ہم تم سے لڑائی نہیں کریں گے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جزیہ ادا کرنے کی شق خود یہ ظاہر کر رہی ہے کہ جہاد کے ذریعہ لوگوں کو زبردستی مسلمان بنانا مقصود نہیں۔ اور مسلمانوں کی پوری تاریخ میں اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی کہ مسلمانوں نے کسی علاقے کو فتح کرنے کے بعد وہاں کے لوگوں کو زبردستی مسلمان بننے پر مجبور کیا

---

(۱) البقرة: ۲۵۶، آیت کا ترجمہ یہ ہے: ''دین کے معاملے میں کوئی زبردستی نہیں ہے''

(۲) الکہف: ۲۹، آیت کا ترجمہ یہ ہے: ''اب جو چاہے ایمان لے آئے اور جو چاہے کفر اختیار کر لے''

ہو بلکہ ان کو ان کے دین پر چھوڑ دیا۔ اس کے بعد ان کو اسلام کی دعوت دی گئی۔ جو لوگ مسلمان ہوئے وہ اسی دعوت کے نتیجے میں مسلمان ہوئے اور جو مسلمان نہیں ہوئے ان کو بھی وہی حقوق دیئے گئے جو ایک مسلمان کو دیئے گئے۔ اس لئے یہ کہنا کہ تلوار کے ذریعہ اسلام پھیلا، یا یہ کہنا کہ جہاد کا مقصد زبردستی لوگوں کو مسلمان بنانا ہے، اس کی کوئی حقیقت نہیں۔

جہاد کا مقصد کیا ہے؟

سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر جہاد کا مقصد کیا ہے؟ خوب سمجھ لیں، جہاد کا مقصد یہ ہے کہ کفر کی شوکت کو توڑا جائے اور اسلام کی شوکت قائم کی جائے اور اللہ کا کلمہ بلند کیا جائے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ ہم اس بات کو تو برداشت کرلیں گے کہ اگر تم اسلام نہیں لاتے ٹھیک ہے اسلام قبول نہ کرو، تم جانو اور تمہارا اللہ جانے۔ آخرت میں تم سزا بھگتنا۔ لیکن تم اپنے کفر اور ظلم کے قوانین کو اللہ کی زمین پر نافذ کرو اور اللہ کے بندوں کو اپنا غلام بناؤ اور ان کو اپنے ظلم وستم کا نشانہ بناؤ اور ان پر ایسے قوانین نافذ کرو جو اللہ کے قوانین کے خلاف ہیں اور جن قوانین کے ذریعہ فساد پھیلتا ہے، تو اس کی ہم تمہیں اجازت نہیں دیں گے۔ لہٰذا یا تو تم اسلام لے آؤ اور اگر اسلام نہیں لاتے تو پھر اپنے دین پر رہو لیکن جزیہ ادا کرو۔ اور جزیہ ادا کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ہماری اور ہمارے قانون کی بالادستی تسلیم کرو۔ اس لئے کہ جو قانون تم نے جاری کیا ہوا ہے وہ بندوں کو بندوں کا غلام بنانے والا قانون ہے۔ ہم ایسے قانون کو جاری نہیں رہنے دیں گے۔ اللہ کی زمین پر اللہ کا قانون نافذ ہوگا اور اللہ ہی کا کلمہ بلند ہوگا۔ یہ ہے جہاد کا مقصود۔

یہ نہ ارشاد ہوا توپ سے کیا پھیلا ہے؟

اکبر الہ آبادی مشہور شاعر گزرے ہیں۔ انہوں نے اہلِ مغرب کے اعتراضات کے جواب میں بڑے اچھے اچھے شعر کہے ہیں۔ اہلِ مغرب یہ جو اعتراض کرتے ہیں کہ اسلام تلوار سے پھیلا ہے، اس پر انہوں نے ایک قطعہ کہا ہے کہ ؎

اپنے عیبوں کی کہاں آپ کو کچھ پروا ہے
غلط الزام بھی اوروں پہ لگا رکھا ہے
یہی فرماتے رہے تیغ سے پھیلا اسلام
یہ نہ ارشاد ہوا توپ سے کیا پھیلا ہے؟

یعنی یہ تو اعتراض کرتے رہے کہ تیغ سے اسلام پھیلا لیکن تم نے توپ سے دنیا میں کیا پھیلایا اس کو بیان نہیں کیا۔ حالانکہ تم نے دنیا میں بداخلاقی، فحاشی، عریانی توپ کے بل بوتے پر پھیلائی۔ اگر

بالفرض اسلام تلوار ہی سے پھیلا تو اس کے ذریعہ نیکی اور تقویٰ، عفت وعصمت ہی پھیلائی اور تم نے تو فحاشی اور عریانی ہی پھیلائی۔

متجددین کے نزدیک جہاد صرف دفاعی ہے

لیکن ہمارے ہاں انگریزوں کے تسلط کے وقت سے ایک ایسا طبقہ موجود رہا ہے کہ جب کبھی اہل مغرب نے اسلام پر یا مسلمانوں پر کوئی اعتراض کیا تو اس کے جواب میں وہ طبقہ اہلِ مغرب کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو جاتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ حضور! آپ کو غلط فہمی ہوئی، ہمارے دین میں یہ بات نہیں ہے، اور اس پر وہ معذرت خواہی کا انداز اختیار کرتا ہے۔

چنانچہ جس وقت اہلِ مغرب کی طرف سے یہ پروپیگنڈہ ہوا اور یہ شور مچا کہ اسلام تلوار کے ذریعہ پھیلا ہے تو اس خاص طبقے نے اس اعتراض کے جواب میں یہ کہنا شروع کر دیا کہ اسلام میں جو جہاد مشروع ہے وہ درحقیقت صرف مدافعت کے لئے ہے یعنی جب کوئی دشمن ہم پر حملہ آور ہو جائے تو ہم اپنے دفاع کے لئے جہاد کرتے ہیں۔ باقی ابتداءً کسی قوم پر حملہ کرنا، یہ ہمارے اسلام میں مشروع نہیں۔ مطلب یہ تھا کہ اگر دوسرا ہم پر حملہ آور ہوگا تو ہم ماریں گے لیکن اگر دوسرا ہم پر حملہ آور نہیں ہے تو اس صورت میں دوسرے پر جہاد کرنے اور حملہ کرنے کو ہم جائز نہیں سمجھتے۔ گویا کہ جہادِ مدافعت جائز ہے، جہادِ ابتداء مشروع اور جائز نہیں۔

اور اپنے اس موقف کو ثابت کرنے کے لئے قرآنی آیات سے غلط استدلال شروع کر دیا مثلاً یہ آیت پیش کی:

﴿ أُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقَاتَلُوْنَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ﴾ (۱)

کہ دیکھو اس میں یہ کہا جا رہا ہے کہ جن کے ساتھ دوسرے لوگ قتال کریں اور ان پر ظلم کریں تو ان کے لئے قتال اور جہاد کی اجازت ہے، دوسرے لوگوں کو قتال اور جہاد کی اجازت نہیں۔ اسی طرح یہ آیت پیش کی:

﴿ وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ ﴾ (۲)

''اللہ کی راہ میں تم ان سے قتال کرو جو تم سے قتال کریں''

---

(۱) الحج: ۳۹، اس آیت کا ترجمہ یہ ہے: ''جن لوگوں سے جنگ کی جارہی ہے انہیں اجازت دی جاتی ہے (کہ وہ اپنے دفاع میں لڑیں)''

(۲) البقرۃ: ۱۹۰، اس آیت کا ترجمہ یہ ہے: ''اور ان لوگوں سے اللہ کے راستے میں جنگ کرو جو تم سے جنگ کرتے ہیں''

ان آیات میں ابتداءً حملہ کرنے اور جہاد کرنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ لہٰذا ان آیات سے استدلال کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ ''جہاد'' درحقیقت مدافعت کے لئے مشروع ہوا کہ جب مشرکین تم پر حملہ کریں یا ظلم کریں اس کے جواب میں تم جہاد اور قتال کرو، لیکن اگر مشرکین تم پر حملہ نہ کریں یا تم پر ظلم نہ کریں تو پھر جہاد کی اجازت نہیں۔

جہاد کے احکام تدریجاً آئے ہیں

لیکن یہ ایک ایسا قول ہے جس کو چودہ سو سال سے آج تک فقہاءِ اُمت میں سے کسی نے بھی اس کو اختیار نہیں کیا کہ جہاد مدافعت کے طور پر جائز ہے، ابتداءً جہاد کرنا جائز نہیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ جہاد کے احکام تدریجاً کئی مرحلوں میں آئے ہیں۔ سب سے پہلا مرحلہ یہ ہے کہ مکی زندگی میں حضورِ اقدس ﷺ کو تلوار اُٹھانے سے بالکل منع کر دیا گیا تھا بلکہ حکم یہ تھا کہ صبر کرو، اور یہ حکم تھا کہ اگر کوئی شخص تمہیں تکلیف پہنچا رہا ہے تو اس کے جواب میں تم کوئی کاروائی نہ کرو۔ اور اس وقت مکی زندگی میں کسی بھی قسم کا جہاد مشروع نہیں ہوا تھا۔ پھر دوسرا مرحلہ آیا جس میں جہاد کی اجازت دے دی گئی لیکن جہاد ان پر فرض نہیں کیا گیا۔ اس وقت یہ آیت نازل ہوئی تھی:

﴿ أُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقَاتَلُوْنَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ﴾ (۱)

اس آیت میں جہاد اور قتال کی اجازت دی گئی لیکن اس شرط کے ساتھ کہ جب دوسرا شخص تم پر ظلم کرے یا قتل کرے، اس کے جواب میں تمہارے لئے قتال جائز ہے۔

ابتداءً جہاد بھی جائز ہے

پھر تیسرا مرحلہ آیا جس میں مدافعت کے لئے جہاد کی اجازت دی گئی اور یہ آیت نازل ہوئی:

﴿وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ ﴾ (۲)

''اللہ تعالیٰ کے راستے میں ان لوگوں سے قتال کرو جو تم سے قتال کریں''

پھر چوتھے مرحلے میں یہ حکم آیا:

﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ ﴾ (۳)

---

(۱) الحج: ۳۹، اس آیت کا ترجمہ یہ ہے: ''جن لوگوں سے جنگ کی جارہی ہے انہیں اجازت دی جاتی ہے (کہ وہ اپنے دفاع میں لڑیں) کیونکہ ان پر ظلم کیا گیا ہے''

(۲) البقرۃ: ۱۹۰، اس آیت کا ترجمہ یہ ہے: ''اور اللہ کے راستے میں ان لوگوں سے جنگ کرو جو تم سے جنگ کرتے ہیں''

(۳) البقرۃ: ۲۱۶، آیت کا ترجمہ یہ ہے: ''تم پر (دشمنوں سے) جنگ کرنا فرض کیا گیا ہے اور وہ تم پر گراں ہے''

اس آیت کے ذریعہ یہ حکم دے دیا کہ اب ابتداءً بھی قتال کرنا ہے، اب صرف دفاع کی حد تک قتال محدود نہیں۔ اس کے بعد سورہ توبہ کی یہ آیاتِ جہاد نازل ہوئیں:

﴿فَإِذَا انسَلَخَ الْأَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِينَ حَيْثُ وَجَدتُّمُوهُمْ وَخُذُوهُمْ وَاحْصُرُوهُمْ وَاقْعُدُوا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ﴾(۱)

تو اس وقت حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ پیغام لوگوں کو پہنچایا کہ جن کے ساتھ مسلمانوں کے معاہدے ہیں، ان کو معاہدوں کی حد تک مہلت دیتے ہیں اور جن کے ساتھ معاہدے نہیں ہیں ان کو چار مہینے کی مہلت دیتے ہیں۔ وہ لوگ چار مہینے کے اندر جزیرہ عرب خالی کر دیں ورنہ ان سے اعلانِ جنگ ہے۔

بہر حال، ان آیات کے نازل ہونے کے بعد ابتدائی جہاد بھی جائز ہو گیا۔ اب اگر کوئی شخص ابتدائے اسلام میں نازل ہونے والی آیات لے کر یہ فیصلہ کر دے کہ جہاد تو جائز ہی نہیں ہے، مسلمانوں کو تو صبر کا حکم ہے کہ جب مشرکین تکلیف پہنچائیں تو صبر کرو، ظاہر ہے کہ یہ بات غلط ہے۔ بالکل اسی طرح اگر کوئی شخص صرف مدافعت والی آیات لے کر بیٹھ جائے اور یہ کہے کہ مسلمانوں کے لئے مدافعت کرنا تو جائز ہے، ابتدائی جہاد کرنا جائز نہیں، یہ بھی درست نہیں ہے، بالکل غلط بات ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ابتداءً جہاد جائز ہے۔

دیندار حلقوں میں ایک اور غلط فہمی اور اس کا جواب

یہ تو ان متجددین کے قول کا تفصیلی جواب تھا جو اہلِ مغرب سے مرعوب ہو کر یہ کہتے ہیں کہ اسلام میں صرف مدافعتی جہاد ہے، ابتداءً جہاد جائز نہیں۔ اس کے علاوہ ایک اور غلط فہمی ان متجددین کے علاوہ اچھے خاصے دیندار حلقوں میں بھی پائی جاتی ہے اور اب وہ غلط فہمی رفتہ رفتہ بہت پھیل رہی ہے اور ہماری تبلیغی جماعت کے حضرات بھی اس غلط فہمی کا شکار ہو رہے ہیں۔ اس لئے اس کی بھی وضاحت کرنا چاہتا ہوں۔

وہ غلط فہمی یہ ہے کہ جہاد صرف اس وقت اور اس قوم سے مشروع ہے جب کوئی قوم دعوت کے راستے میں آڑے آئے اور رکاوٹ بنے۔ گویا کہ اصل مقصود ''دعوت'' ہے اور اس دعوت کے پھیلانے کے راستے میں اگر کوئی ملک آڑے آئے اور اپنے ملک میں دعوت و تبلیغ کی اجازت نہ دے تب جہاد مشروع ہے، لیکن اگر کوئی ملک اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ ہمارے یہاں آ کر دعوت کا کام کرو، تبلیغ

---

(۱) التوبۃ: ۵، آیت کا ترجمہ یہ ہے: ''پھر جب گزر جائیں مہینے پناہ کے تو مارو مشرکوں کو جہاں پاؤ اور پکڑو اور گھیرو اور بیٹھو ہر جگہ ان کی تاک میں''

کر دو تو پھر ان کے ساتھ جہاد مشروع نہیں۔ یہ وہ بات ہے جس کو پہلے صرف متجددین کہا کرتے تھے، اب اچھے خاصے پڑھے لکھے دیندار حضرات اور تبلیغی جماعت کے حضرات نے بھی کہنی شروع کر دی ہے۔ اور اب سے پہلے تو لوگوں سے صرف زبانی سنا تھا، لیکن باقاعدہ اس بارے میں تحریر دیکھ لی ہے، تب یہ بات کہہ رہا ہوں۔ یہ بات جہاد کی حقیقت نہ سمجھنے کے نتیجے میں کہی گئی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ صرف اتنی بات کہ کسی کافر حکومت نے اپنے ملک میں ہمیں تبلیغ کی اجازت دیدی ہے اس لئے اب ہمیں اس کے خلاف جہاد نہیں کرنا چاہئے، یہ بڑی خطرناک بات ہے اس لئے کہ محض تبلیغ کی اجازت دے دینے سے جہاد کا مقصد پورا نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ جہاد کا مقصد کفر کی شوکت کو توڑنا ہے اور اللہ کے کلمے کو بلند کرنا ہے، اور جب تک کفر کی شوکت برقرار رہے گی اس وقت تک حق کو قبول کرنے کے لئے لوگوں کے دل و دماغ نہیں کھلیں گے۔ اس لئے کہ یہ اصول ہے کہ جب کسی قوم کی سیاسی طاقت اور اس کا اقتدار لوگوں کے دل و دماغ پر چھایا ہوا ہوتا ہے، اس قوم کی بات لوگوں کو جلدی سمجھ میں آجاتی ہے اور اس کی مخالف بات لوگوں کے دلوں میں آسانی سے نہیں اُترتی۔ تجربہ کر کے دیکھ لیا جائے۔ چنانچہ آج مغربی دنیا کی بالکل بدیہی البطلان بات لوگ نہ صرف یہ کہ سنتے ہیں بلکہ اس کو قبول کرتے ہیں اور اس پر عمل کرتے ہیں۔ کیوں؟ اس لئے کہ آج دنیا میں ان کا سکہ چلا ہوا ہے، ان کا اقتدار ہے، ان کے افکار دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اگر ان حالات میں کسی مغربی ملک میں تبلیغی جماعت چلی گئی اور اس ملک نے ان کو ویزا دے دیا اور تبلیغ کی اجازت دے دی تو صرف اتنی بات سے جہاد کا مقصد حاصل نہیں ہوتا جب تک کہ ان کی شوکت نہ ٹوٹے اور جب تک ان کا اقتدار ختم نہ ہو اور جب تک لوگوں کے دلوں پر چھایا ہوا رعب ختم نہ ہو۔ اور یہ شوکت، یہ اقتدار، یہ رعب اس وقت تک ختم نہیں ہوگا جب تک کہ ان کا مقابلہ نہیں کیا جائے گا۔ لہٰذا یہ کہنا کہ اگر کسی ملک نے تبلیغ کی اجازت دے دی تو اب جہاد کی ضرورت نہیں رہی اور اب جہاد کا مقصود حاصل ہو گیا، تو یہ بہت بڑا دھوکہ ہے۔

مطلق جہاد کا منکر کافر ہے

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر کوئی فرد یا جماعت جہاد کی ابتدائی فرضیت سے انکار کر دے جبکہ وہ نصوصِ قطعیہ سے ثابت ہے اور وہ جماعت صرف دفاعی جہاد کی قائل ہو، تو شریعت میں ایسی جماعت کی کیا حیثیت ہے؟ کیا ایسی جماعت کی طرف کفر یا ضلالت کی نسبت کرنا درست ہے؟

یہ تو میں نے عرض کر دیا کہ یہ نقطۂ نظر بالکل غلط ہے کہ جہاد صرف دفاع کے لئے مشروع ہوا ہے، لیکن جو شخص یا جماعت اس نقطۂ نظر کی قائل ہو اس پر کفر کا فتویٰ لگانا بھی مشکل ہے۔ اس لئے کہ

تکفیر ایک ایسی چیز ہے جس میں بہت احتیاط لازم ہے۔ اس لئے جو شخص یا جماعت مطلق جہاد کی منکر ہو اس پر بے شک کفر کا فتویٰ لگایا جائے گا، کیونکہ جہاد کی مشروعیت ضروریاتِ دین میں سے ہے، لیکن جو شخص یا جماعت دفاعی جہاد کی قائل ہے اور ابتدائی جہاد کی مشروعیت سے انکار کرتی ہے تو وہ جماعت ماؤل ہے (تاویل کرنے والی ہے) اور ماؤل کو کافر نہیں کہا جاتا۔ اس لئے اس جماعت کو کافر نہیں کہیں گے۔ البتہ یہ نقطۂ نظر بالکل غلط اور باطل ہے اور یہ صرف اجتہادی اختلاف نہیں ہے بلکہ حق و باطل کا اختلاف ہے، اور ابتدائی جہاد سے انکار کرنے والے کو یہ کہا جائے گا کہ یہ باطل پر ہے، حق پر نہیں ہے، لیکن کفر کا فتویٰ نہیں لگائیں گے۔

اسلام پر خونخوار مذہب ہونے کا الزام کیوں؟

ایک صاحب نے یہ سوال کیا ہے کہ اہلِ مغرب نے جہاد کے حوالے سے اسلام پر سب سے بڑا بہتان یہ تراشا ہے کہ اسلام ایک خونخوار مذہب ہے۔ یہ اشکال اور بہتان اس وقت پیدا ہونا چاہئے تھا جب مسلمانوں نے جہاد کے ذریعہ دنیا میں ایک تہلکہ برپا کر رکھا تھا اور اس وقت فی الواقع دنیا کو یہ شبہ ہو سکتا تھا کہ مسلمانوں کے فاتحانہ اقدامات شاید کسی خونریز تعلیم کا نتیجہ ہوں۔ لیکن آج جب مسلمان ہر اعتبار سے مغلوب اور روبہ انحطاط ہیں، ایسے وقت میں اس بہتان تراشی کے پیچھے لادین عناصر کا کون سا جذبہ کارفرما ہے؟

بات دراصل یہ ہے کہ اگرچہ مسلمان اس وقت کمزور ہیں، لیکن مسلمانوں کی تاریخ بتاتی ہے کہ جب کبھی اللہ تعالیٰ نے ان کو ذرا اُبھرنے کا موقع دیا اور ان میں اتحاد پیدا ہوا تو اس کے نتیجے میں انہوں نے دشمنوں کا ناک میں دم کر دیا اور ان کے عزائم کو چلنے نہیں دیا۔ جو طاقتیں اس وقت دنیا پر غالب ہیں وہ اگرچہ یہ دیکھ رہی ہیں کہ مسلمان اس وقت کمزور ہیں، لیکن ان کو ڈراؤنے خواب آتے رہتے ہیں کہ یہ سویا ہوا شیر اگر کسی وقت بیدار ہو گیا تو یہ ہمیں تباہ کر دے گا۔ ان مغربی طاقتوں نے اگرچہ مسلمانوں کو دبا رکھا ہے لیکن ان کے دبانے کی مثال ایسی ہے کہ جیسے ایک لطیفہ ہے کہ ایک کمزور آدمی کچھ داؤ پیچ کے ذریعہ ایک پہلوان کو گرا کر اس کے سینے پر سوار ہو کر بیٹھ گیا اور اُوپر بیٹھ کر رونے لگا۔ لوگوں نے اس سے پوچھا کہ تو کیوں رو رہا ہے؟ اس نے جواب دیا کہ اس لئے رو رہا ہوں کہ اب یہ پہلوان اُٹھ کر مجھے مارے گا، اس کے تصور سے رو رہا ہوں۔ بس یہی حال ان اہلِ مغرب کا ہے، طاقت کے بل بوتے پر تو یہ مسلمانوں کو نہیں گرا سکے لیکن داؤ پیچ کے ذریعہ اس طرح گرا دیا ہے کہ مسلمانوں کے درمیان تفرقہ ڈال دیا، ان کے اندر فرقہ بندیاں کر دیں، اور اس سازش میں لگے ہوئے ہیں کہ ان کے درمیان اتحاد نہ ہونے پائے وغیرہ وغیرہ۔ لیکن ساتھ ہی یہ اہلِ مغرب اس بات سے پریشان بھی ہیں کہ اگر کسی وقت

مسلمانوں کو ہوش آ گیا اور یہ متحد ہو گئے تو اس وقت ہمارا حشر خراب کر دیں گے۔

جہاد کے لئے تین شرطیں

ایک طالب علم نے یہ سوال کیا ہے کہ عہدِ نبوت میں ابتدائی تیرہ سال اس طرح گزرے ہیں کہ ان میں جہاد بالمعنی الاصطلاحی موجود نہیں تھا۔ صبر اور مجاہدۂ نفس کے بعد جب صحابہ کرام کے اعمال و اخلاق صیقل ہو گئے تو اس کے بعد مدنی زندگی میں جہاد و قتال کا سلسلہ شروع ہوا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ موجودہ زمانے کے مسلمان چونکہ تزکیۂ نفس کے اس معیار پر نہیں اُتریں گے، لہٰذا ایسی حالت میں جہاد سے پہلے اصلاحِ نفس پر توجہ دینی چاہئے۔

یہ بہت اچھا سوال کیا۔ بات دراصل یہ ہے کہ جہاد ابتدائی جو مشروع ہے وہ اصولی اعتبار سے ہے، لیکن اس جہاد ابتدائی کی کچھ شرائط ہیں۔ جب تک وہ شرائط نہ پائی جائیں اس وقت تک وہ جہاد نہ صرف یہ کہ مشروع نہیں بلکہ مضر بھی ہو سکتا ہے۔ ان شرائط میں یہ شرط بھی داخل ہے کہ وہ جہاد فی سبیل اللہ ہو، فی سبیل النفس نہ ہو۔ یعنی مقصود اعلاءِ کلمۃ اللہ ہو اور اللہ کے دین کی سر بلندی ہو، لیکن اگر کوئی شخص اس لئے جہاد کر رہا ہے تاکہ میری شہرت ہو جائے، مجھے لوگ مجاہد اور بہادر کہیں اور میری تعریف ہو، ظاہر ہے کہ وہ جہاد فی سبیل اللہ نہیں ہے بلکہ فی سبیل النفس ہے۔ اس لئے جہاد کی ایک ناگزیر شرط یہ ہے کہ آدمی اپنے نفس کی اصلاح کیے ہوئے ہو۔ اصلاحِ نفس کے بعد اگر جہاد کرے گا تو وہ جہاد فی سبیل اللہ ہوگا۔

جہاد شرعی کی ایک شرط یہ بھی ہے کہ ان کا ایک امیر ہو اور اس امیر پر سب لوگ متفق ہوں۔ اگر ایک متفقہ امیر نہیں ہوگا تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جہاد کے بعد آپس ہی میں لڑائی شروع ہو جائے گی۔ جیسے آج افغانستان میں ہو رہا ہے۔ اس لئے کہ امیر نہ ہونے کی وجہ سے جہاد کے نتائج حاصل نہیں ہو پاتے۔ اس لئے ایک متفقہ امیر کا ہونا ضروری ہے۔

جہاد کی ایک شرط یہ بھی ہے کہ جہاد کرنے اور لڑنے کی قوت بھی ہو کیونکہ قوت کے بغیر جہاد کرنا ایسا ہی ہے جیسے خود اپنا سر پھوڑ لینا۔ اس لئے قوت کے حصول کے بغیر جہاد کرنا جائز نہیں۔ لہٰذا جب تک یہ تین چیزیں موجود ہیں اس وقت تک جہاد یہی ہے کہ ان تین چیزوں کو حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔ یعنی اصلاحِ نفس بھی ہو، امیر کو تلاش کیا جائے اور قوت کو جمع کیا جائے، جب یہ تین چیزیں پائی جائیں اس کے بعد جہاد شروع کیا جائے۔

جہاد کے بارے میں تبلیغی جماعت کا موقف

ایک طالب علم نے سوال کیا ہے کہ تبلیغی جماعت کی کون سی کتاب یا تحریر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ جہاد کی ابتدائی فرضیت سے انکار کرتے ہیں؟ کیا علماء کرام نے تبلیغی جماعت کے علماء اور امراء کو اس بات پر متنبہ کیا ہے؟

بات دراصل یہ ہے کہ تبلیغی جماعت کے مختلف حضرات کی طرف سے لوگ میرے پاس آکر بہت کچھ نقل کرتے رہتے تھے کہ تبلیغی جماعت کے فلاں صاحب نے تقریر میں یہ کہا، اور یہ کہا کہ اس وقت جہاں کہیں جہاد ہو رہا ہے، چاہے وہ کشمیر ہو، یا بوسینیا ہو وہ جہاد شرعی نہیں ہے، اصل چیز تو دعوت ہے۔ اس قسم کی باتیں لوگ میرے پاس آکر نقل کرتے تھے لیکن چونکہ نقل کے اندر غلطی اور غلط فہمی کا امکان رہتا ہے جب تک خود براہِ راست نہ سن لیا جائے۔ اس لئے ان باتوں کو میں نے کبھی جماعت یا جماعت کے بزرگوں کی طرف منسوب نہیں کیا، لیکن جماعت کے بزرگوں سے جب کبھی ملاقات کا موقع ملا، ان کو ان باتوں کی طرف متنبہ ضرور کیا کہ یہ باتیں سننے میں آتی رہتی ہیں، آپ حضرات تحقیق کریں۔ اگر یہ باتیں صحیح ثابت ہوں تو ان کا سدِ باب کریں۔

لیکن اب جماعت کے ایک سرکردہ اور بڑے مقتدر بزرگ جن کا میں بہت احترام کرتا ہوں، ان کا ایک خط پڑھنے کا اتفاق ہوا جو انہوں نے ایک صاحب کے نام لکھا تھا، جن کے نام وہ خط تھا انہوں نے وہ خط مجھے بھیج دیا۔ اس خط کے اندر تحریر کا سارا رخ اس طرف ہے کہ گویا اس وقت جہاد کی طرف توجہ کرنا یا جہاد کی بات کرنا، جہاد کے بارے میں سوچنا یا جہاد کے بارے میں کوئی اقدام کرنا کسی طرح بھی درست نہیں، بلکہ جہاد تو اصل میں دعوت کے لئے ہے۔ اگر دعوت کی آزادی ہو تو اس صورت میں نہ صرف یہ کہ جہاد کی کوئی ضرورت نہیں بلکہ وہ مضر ہے۔ ساتھ میں یہ بھی لکھا ہے کہ ابھی یہ بات لوگوں کی سمجھ میں نہیں آرہی ہے لیکن رفتہ رفتہ علماء کی سمجھ میں بھی آجائے گی۔ اس خط سے معلوم ہوتا ہے کہ جو باتیں تبلیغی جماعت کے حضرات کی طرف منسوب کر کے نقل کی گئی ہیں وہ اتنی بے بنیاد نہیں ہیں بلکہ یہ فکر رفتہ رفتہ پیدا ہو رہی ہے۔ یہ بات ایسی نہیں ہے کہ اس پر خاموش رہا جائے۔ چنانچہ اس سلسلے میں پھر ہم نے جماعت کے ان حضرات سے زبانی گزارش بھی کی جن سے رابطے ہیں اور بڑوں تک یہ بات پہنچانے کا اہتمام کیا کہ یہ بات جو پیدا ہو رہی ہے یہ بڑی خطرناک بات ہے۔ یہ خط میرے پاس موجود ہے اگر کوئی پڑھنا چاہے تو پڑھ لے۔

تبلیغی جماعت اور دین کی عظیم خدمت

الحمدللہ، ان باتوں کو بیان کرنے کا منشاء اصلاح ہی ہے۔ تبلیغی جماعت تنہا ایک ایسی جماعت ہے جس کے کام سے الحمدللہ دل ہمیشہ خوش ہوتا ہے اور اس جماعت نے ایسی بڑی عظیم خدمت انجام دی ہے جو کسی اور جماعت نے انجام نہیں دی۔ اللہ تعالیٰ نے اس جماعت کے ذریعہ دین کا کلمہ کہاں سے کہاں پہنچایا۔ حضرت مولانا محمد الیاس صاحب قدس اللہ سرہ، اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے، آمین، ان کے اخلاص اور ان کے سچے جذبے نے اس جماعت کو اب تک باقی رکھا ہوا ہے، اور اس جماعت کے پیغام اور دعوت کو اللہ تعالیٰ نے چاردانگ عالم میں پھیلا دیا ہے۔

تعاون اور تنبیہ دونوں کی ضرورت ہے

لیکن ہمیشہ یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ کسی بھی جماعت کا پھیل جانا اور اس کے پیغام کا دور دور تک پہنچ جانا اگر صحیح طریقے سے ہو تو یہ قابلِ خیر مقدم ہے اور اس صورت میں اس جماعت کے ساتھ تعاون کرنا چاہئے۔ لیکن اگر اس جماعت میں خرابیاں پیدا ہو رہی ہیں یا اس کے اندر غلط فکر پیدا ہو رہی ہے تو پھر تعاون کے ساتھ ساتھ اس کی غلطی پر اس کو متنبہ کرنا بھی ضروری ہے، کیونکہ ایسا نہ ہو کہ یہ بہترین جماعت جس سے اللہ تعالیٰ نے اتنا بڑا کام لیا، کہیں غلط راستے پر نہ پڑ جائے۔ بالخصوص ایسے وقت میں متنبہ کرنا اور زیادہ ضروری ہو جاتا ہے جبکہ اس کی قیادت پختہ اہلِ علم کے ہاتھ میں نہیں ہے بلکہ اس جماعت میں زیادہ عنصر عوام کا ہے جو پورا علم نہیں رکھتے، اور اس جماعت کے اندر جو علماء شامل ہیں ان علماء کا مشغلہ علم نہیں ہے۔ اس لئے کہ علماء کی بھی دو قسمیں ہوتی ہیں۔ بعض علماء وہ ہوتے ہیں جن کا مشغلہ درس و تدریس اور فتویٰ نویسی ہوتا ہے۔ اس قسم کے علماء کو علم سے مناسبت رہتی ہے۔ اور دوسرے علماء وہ ہیں جن کا مشغلہ درس و تدریس اور فتویٰ وغیرہ نہیں رہتا۔ ان حضرات علماء کے پاس الحمدللہ علم تو ہے لیکن اس علم کو صیقل نہیں کیا گیا، اس لئے ایسے علماء کے دلوں میں غلط فہمیاں پیدا ہو سکتی ہیں۔

حضرت مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ایک واقعہ

میں آپ کو حضرت مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ایک واقعہ سناتا ہوں۔ ایک مرتبہ آپ بیمار ہو گئے۔ میرے والد ماجد حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس زمانے میں دیوبند سے دہلی کسی کام سے تشریف لے گئے۔ دہلی میں آپ کو یہ خبر ملی کہ حضرت مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ بیمار ہیں۔

چنانچہ آپ ان کی عیادت کے لئے نظام الدین تشریف لے گئے ۔ وہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ معالجین نے ملاقات کرنے سے منع کیا ہوا ہے ۔ چنانچہ حضرت والد صاحب نے وہاں پر موجود لوگوں سے عرض کر دیا کہ میں تو عیادت کے لئے حاضر ہوا تھا، حالات معلوم ہو گئے ۔ اور معالجین نے چونکہ ملاقات سے منع کیا ہوا ہے اس لئے ملاقات کا اہتمام کرنے کی ضرورت نہیں ۔ بس جب حضرت کی طبیعت ٹھیک ہو تو حضرت کو بتا دیں کہ میں ملاقات کے لئے حاضر ہوا تھا اور میرا اسلام عرض کر دیں ۔ یہ کہہ کر حضرت والد صاحب رخصت ہو گئے ۔

کسی نے اندر جا کر حضرت مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو بتا دیا کہ حضرت مفتی صاحب آئے تھے ۔ حضرت مولانا نے فوراً ایک آدمی پیچھے دوڑایا کہ مفتی صاحب کو بلا کر لائیں ۔ جب وہ شخص حضرت مفتی صاحب کے پاس پہنچا اور ان سے کہا کہ حضرت مولانا آپ کو بلا رہے ہیں تو حضرت مفتی صاحب نے فرمایا کہ چونکہ معالجین نے ملاقت سے منع کیا ہوا ہے، ایسے میں ملاقات کرنا مناسب نہیں ہے ۔ اس شخص نے کہا کہ حضرت مولانا نے سختی سے حکم دیا ہے کہ ان کو بلا کر لاؤ ۔ حضرت مفتی صاحب نے فرمایا کہ میں ان صاحب کے ساتھ واپس گیا اور حضرت کے پاس جا کر بیٹھا اور آپ کی مزاج پرسی کی، تو حضرت مولانا الیاس صاحب میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بے ساختہ رو پڑے اور زار و قطار رونا شروع کر دیا ۔ حضرت مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ مجھے خیال ہوا کہ بہر حال، اس وقت تکلیف اور بیماری میں ہیں، اس کا طبیعت پر تاثر ہے ۔ اس لئے میں نے تسلی کے کچھ کلمات کہے ۔ حضرت مولانا محمد الیاس صاحب نے فرمایا کہ میں تکلیف اور بیماری کی وجہ سے نہیں رو رہا ہوں ۔

مجھے اس وقت دو فکریں اور دو اندیشے لاحق ہیں

بلکہ میں اس لئے رو رہا ہوں کہ مجھے اس وقت دو فکریں اور دو اندیشے لاحق ہیں اور انہی کی وجہ سے میں پریشان ہوں اور اسی وجہ سے رونا آ رہا ہے ۔ حضرت والد صاحب نے پوچھا کہ کونسی فکریں لاحق ہیں؟ حضرت مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ پہلی بات یہ ہے کہ جماعت کا کام اب روز بروز پھیل رہا ہے ۔ الحمد للہ اس کے نتائج اچھے نظر آ رہے ہیں اور لوگ جوق در جوق جماعت کے اندر آ رہے ہیں ۔ اب مجھے ڈر یہ لگتا ہے کہ جماعت کی یہ کامیابی کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے استدراج ہو؟ استدراج اسے کہتے ہیں کہ کسی باطل آدمی کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ڈھیل دے دی جاتی ہے اور اس کو ظاہری کامیابیاں حاصل ہو جاتی ہیں اور حقیقت میں وہ اللہ تعالیٰ کی رضامندی کا کام نہیں ہوتا ۔ اس سے اندازہ لگایئے کہ حضرت مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کس مقام کے بزرگ تھے کہ ان کو یہ ڈر لگا ہوا ہے کہ یہ کہیں استدراج تو نہیں ہے ۔

یہ استدراج نہیں ہے

حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے فوراً عرض کیا کہ حضرت! آپ کو میں اطمینان دلاسکتا ہوں کہ یہ استدراج نہیں ہے۔ حضرت مولانا نے فرمایا کہ تمہارے پاس اس کی کیا دلیل ہے کہ یہ استدراج نہیں ہے؟ حضرت والد صاحب نے فرمایا کہ اس کی دلیل یہ ہے کہ جب کسی کے ساتھ استدراج کا معاملہ ہوتا ہے تو اس شخص کے دل و دماغ پر یہ واہمہ بھی نہیں گزرتا کہ یہ استدراج ہے اور اس کو استدراج کا شبہ بھی نہیں ہوتا۔ اور آپ کو چونکہ استدراج کا شبہ ہو رہا ہے، تو یہ شبہ خود اس بات کی دلیل ہے کہ یہ استدراج نہیں ہے، اگر یہ استدراج ہوتا تو کبھی آپ کے دل میں اس کا خیال بھی پیدا نہ ہوتا۔ اس لئے میں آپ کو اس بات کا اطمینان دلاتا ہوں کہ یہ استدراج نہیں ہے بلکہ یہ جو کچھ ہو رہا ہے یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مدد اور نصرت ہے۔ حضرت والد صاحب فرماتے ہیں کہ میرا یہ جواب سن کر حضرت مولانا کے چہرے پر بشاشت آگئی کہ الحمدللہ تمہاری اس بات سے مجھے بڑا اطمینان ہوا۔

دوسری فکر

پھر حضرت مولانا نے فرمایا کہ مجھے دوسری فکر یہ لاحق ہے کہ اس جماعت میں عوام بہت کثرت سے آرہے ہیں، اور اہلِ علم کی تعداد کم ہے۔ مجھے اندیشہ یہ ہے کہ جب عوام کے ہاتھ میں قیادت آتی ہے تو بعض اوقات آگے چل کر وہ اس کام کو غلط راستے پر ڈال دیتے ہیں۔ اس لئے کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ جماعت کسی غلط راستے پر پڑ جائے اور اس کا وبال میرے سر پر آجائے۔ اس لئے میرا دل چاہتا ہے کہ اہلِ علم کثرت سے اس جماعت میں داخل ہوں اور وہ اس جماعت کی قیادت سنبھالیں۔

حضرت والد صاحب نے فرمایا کہ آپ کی یہ فکر بالکل صحیح ہے لیکن آپ نے تو نیک نیتی سے اور صحیح طریقے پر کام شروع کیا ہے، اگر آگے چل کر اس کو کوئی خراب کردے تو انشاء اللہ آپ پر اس کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ بہر حال یہ بات صحیح ہے کہ اہلِ علم کو چاہئے کہ وہ آگے آئیں اور اس کی قیادت سنبھالیں۔ حضرت مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا یہ واقعہ میں نے اپنے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ سے بار بار سنا۔ اس سے آپ اندازہ لگائیں کہ حضرت مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے اخلاص کا کیا عالم تھا اور ان کے جذبات کیا تھے۔

تبلیغی جماعت کی مخالفت ہرگز جائز نہیں

لیکن اب واقعۃً صورتِ حال یہ ہوگئی ہے کہ قیادت زیادہ تر ایسے حضرات کے ہاتھ میں ہے جو علم میں رسوخ نہیں رکھتے۔ اس کی وجہ سے بعض اوقات کچھ بے اعتدالیاں سامنے آتی رہتی ہیں۔ ان بے اعتدالیوں کے نتیجے میں جماعت کی مخالفت ہرگز جائز نہیں۔ اس لئے کہ بحیثیتِ مجموعی الحمدللہ جماعت نے بہت بہترین کام کیا ہے اور اب بھی اچھا کام کر رہی ہے۔ لہٰذا اس جماعت کے ساتھ تعاون کرنا چاہئے اور جتنا ہو سکے اہلِ علم کو اس جماعت کے اندر شامل ہونا چاہئے اور اس کے ساتھ تعاون کا سلسلہ برقرار رکھنا چاہئے۔

لیکن ساتھ ساتھ اہلِ علم کے داخل ہونے کا یہ فائدہ ہونا چاہئے کہ جو بے اعتدالیاں پیدا ہو رہی ہیں ان کا سدباب ہو۔ لہٰذا جو اہلِ علم جائیں وہ یہ فکر اور سوچ لے کر جائیں کہ ہم ایک مقصد سے جا رہے ہیں۔ وہ مقصد یہ ہے کہ دعوت و تبلیغ کے ساتھ ساتھ حتی الامکان اس مبارک جماعت کو غلط راستے پر پڑنے سے روکیں، یہ نہ ہو کہ اہلِ علم خود بھی جماعت کے بہاؤ میں بہہ جائیں۔

مثلاً ایک اہم بے اعتدالی یہ ہے کہ پہلے یہ ہوتا تھا کہ فتویٰ کے معاملے میں تبلیغی جماعت کے حضرات اور ان سے منسلک عوام اہلِ افتاء کی طرف رجوع کرتے تھے، لیکن اب وہاں فتویٰ دینے کا سلسلہ بھی شروع ہوگیا ہے، اور مسائل میں عام فقہاءِ اُمت سے اختلاف کا ایک رجحان پیدا ہونے لگا ہے۔ اور بعض حضرات تفریق کی باتیں کرنے لگے ہیں۔ مثلاً یہ بات چل پڑی ہے کہ اب تبلیغ کرنے والے کو اس مفتی سے فتویٰ پوچھنا چاہئے جو تبلیغ میں لگا ہوا ہو، دوسرے علماء سے پوچھنا ٹھیک نہیں۔

اور بعض اوقات امراءِ جماعت ایسے فیصلے کر لیتے ہیں جو شریعت کے مطابق نہیں ہوتے۔ مثلاً یہ بات کہ تبلیغ و دعوت فرضِ عین ہے یا فرضِ کفایہ ہے؟ اس بارے میں باقاعدہ ایک موقف اختیار کر لیا گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ تبلیغ و دعوت نہ صرف یہ کہ فرضِ عین ہے بلکہ اس خاص طریقے سے کرنا فرضِ عین ہے، جو شخص اس خاص طریقے سے نہ کرے وہ فرضِ عین کا تارک ہے۔ یہ بھی بہت بے اعتدالی کی بات ہے۔ اسی طرح جہاد کے بارے میں بھی بے اعتدالیاں سننے میں آتی رہتی ہیں۔

طلبہ تبلیغی جماعت میں شرکت کریں

الحمدللہ، ہم تو اپنے طلبہ کو یہ ترغیب دیتے رہتے ہیں کہ وہ تبلیغی جماعت میں جائیں، کیونکہ جماعت میں جانا خود اپنی اصلاح کے لئے بہت مفید ہے، اس لئے کہ نیک لوگوں کی صحبت میسر آتی ہے۔ اس کی وجہ سے اپنی کوتاہیاں دور کرنے کا موقع ملتا ہے۔ اصلاحِ نفس کا موقع حاصل ہوتا ہے۔

بلکہ دیکھا یہ ہے کہ یہاں مدرسے میں آٹھ سال پڑھنے سے بھی فضائلِ اعمال کی اتنی اہمیت دل میں پیدا نہیں ہوتی جتنی ایک چلہ لگانے سے وہ اہمیت پیدا ہو جاتی ہے اور اعمال کی طرف توجہ ہو جاتی ہے۔ یہ بہت بڑی نعمت ہے۔ اس لئے ہم طلبہ کو ترغیب دیتے ہیں کہ وہ اس جماعت میں وقت لگائیں۔

لیکن وقت لگانے والے طلبہ ساتھ ساتھ یہ بھی مدِنظر رکھیں کہ اس جماعت میں مندرجہ بالا بے اعتدالیاں بھی پائی جاتی ہیں، ان بے اعتدالیوں سے خود متاثر ہونے کے بجائے ان کو دور کرنے کی فکر کرنی چاہئے، یہ نہ ہو کہ وہاں جا کر خود بھی بہہ گئے اور ان کی ہاں میں ہاں ملانے لگ گئے۔ ہر چہ در کانِ نمک رفت، نمک شد۔ یہ نہ ہونا چاہئے۔

یہ اس جماعت کی صحیح صورتِ حال ہے۔ اور الحمدللہ اب بھی ان بے اعتدالیوں کے باوجود بحیثیتِ مجموعی اس جماعت پر خیر غالب ہے اور بحیثیتِ مجموعی اس جماعت سے بہت فائدہ پہنچ رہا ہے، اور اس جماعت میں شرکت کرنی چاہئے اور اس کے ساتھ تعاون کرنا چاہئے، لیکن ان بے اعتدالیوں کی طرف بھی نگاہ رکھنی چاہئے۔ اب ہوتا یہ ہے کہ جب کبھی کوئی شخص ان بے اعتدالیوں پر ذرا سی تنقید کرتا ہے تو اس کے خلاف یہ پروپیگنڈہ شروع ہو جاتا ہے کہ یہ شخص جماعت کا مخالف ہے، یہ بڑی خطرناک بات ہے۔

آج کل کا جہاد اقدامی ہے یا دفاعی ہے؟

ایک طالب علم نے پوچھا ہے کہ آج کل جو جہاد ہو رہا ہے یہ اقدامی ہے یا دفاعی ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ سب جہاد جو بوسینیا یا کشمیر میں ہو رہے ہیں، یہ سب حقیقت میں دفاعی جہاد ہیں۔ بوسینیا کے مسلمانوں پر خود کفار نے حملہ کر کے ان پر ظلم کیا تھا، اس کے نتیجے میں مسلمانوں نے ان کے خلاف ہتھیار اُٹھائے۔ جہاں تک کشمیر کا تعلق ہے تو ہندوستان نے زبردستی اس پر قبضہ کیا ہوا ہے، اس لئے کہ تقسیم کے وقت یہ طے ہو گیا تھا کہ جن علاقوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہوگی وہ علاقے پاکستان کے ساتھ شامل ہوں گے۔ اس اصول کے اعتبار سے کشمیر پاکستان کا حصہ تھا لیکن ہندوستان نے زبردستی اس پر قبضہ کر لیا، اس لئے وہ مقبوضہ علاقہ کہلاتا ہے، اب اگر وہاں کے لوگ اپنے علاقے کو کافروں کے تسلط سے آزاد کرانا چاہ رہے ہیں تو یہ دفاعی جہاد ہے۔

ان باتوں سے غلط نتیجہ نہ نکالا جائے

تبلیغی جماعت کے بارے میں جو بات میں نے بتائی اس کو ایک تو اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے۔ اس لئے کہ بعض اوقات جب کوئی بات مجمع میں کہی جاتی ہے تو اس کو غلط سمجھ کر پھر غلط طریقے

سے آگے نقل کردیا جاتا ہے اور نقل کرنے میں احتیاط ملحوظ نہیں رکھی جاتی، اور بعض اوقات بات کا ایک حصہ نقل کردیا جاتا ہے اور دوسرا حصہ نقل نہیں کیا جاتا، جس کے نتیجے میں اصلاح نہیں ہوتی بلکہ اُلٹا فساد پھیلتا ہے۔ آپ حضرات کو بتلانے کا منشا یہ ہے کہ چونکہ آپ حضرات اب درسِ نظامی سے فارغ ہونے والے ہیں، آپ حضرات کو ہر چیز کی حقیقت اس کے محل میں معلوم ہونی چاہئے اور اس کے مطابق اپنا طرزِ عمل اختیار کرنا چاہئے، اس لئے یہ ساری باتیں آپ کو بتائی جارہی ہیں۔ لہٰذا اس سے کوئی شخص یہ نتیجہ نہ نکالے کہ میں تبلیغی جماعت کے خلاف ہوں۔

بہر حال، میں نے آپ حضرات کو کھول کر بتادیا کہ تبلیغی جماعت میں خیر غالب ہے، لہٰذا اس جماعت کو غنیمت سمجھنا چاہئے اور اس کے ساتھ تعاون کرنا چاہئے۔ لیکن خیر غالب ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ یہ جماعت معصوم ہے اور اس میں کوئی غلطی نہیں ہے یا کوئی بے اعتدالی نہیں ہے۔

علماء دین کے چوکیدار ہیں

اہلِ علم دین کے چوکیدار ہیں، ہم تو طالب علم ہیں۔ اہلِ علم کو اللہ تعالیٰ نے دین کا چوکیدار بنایا ہے۔ چنانچہ ایک صاحب سے میں نے اس قسم کی کچھ باتیں عرض کیں تو جواب میں وہ صاحب کہنے لگے کہ یہ مولوی تو اسلام کے ٹھیکیدار بنے ہوئے ہیں۔ یہ لوگ جس چیز کے بارے میں کہہ دیں کہ یہ اسلام ہے تو وہ اسلام ہے اور جس کو یہ لوگ کہہ دیں کہ یہ اسلام نہیں تو وہ اسلام میں داخل نہیں۔ میں نے ان سے جواب میں کہا کہ اسلام کا ٹھیکیدار تو کوئی نہیں بن سکتا لیکن ہم چوکیدار ضرور ہیں، اور چوکیدار کا فریضہ یہ ہے کہ اگر شہزادہ بھی دربارِ شاہی میں داخل ہونا چاہے اور اس کے پاس پاس نہیں ہوگا تو وہ چوکیدار اس شہزادے کو بھی روک دے گا، حالانکہ چوکیدار جانتا ہے کہ میں چوکیدار ہوں اور یہ شہزادہ ہے لیکن چوکیدار کے فرائضِ منصبی میں یہ بات داخل ہے کہ وہ شہزادے کو روکے۔ اسی طرح ہم دین کے ٹھیکیدار نہیں البتہ چوکیدار ضرور ہیں۔ ہمارا کام جھاڑ دینا ہے۔ آپ کی تعظیم اور تکریم ہمارے سر آنکھوں پر، لیکن بحیثیت چوکیدار کے ہمیں یہ بتانا ہوگا کہ آپ کا یہ کام صحیح نہیں۔